لیاس سیتاپوری کی منتخب تاریخی کہانیاں

چاند کا خدا

الیاس سیتاپوری

الیاس سیتاپوری

کی

منتخب تاریخی کہانیاں

چاند کا ٹکڑا

داستان

پوسٹ بکس ۸۱۵۲ فیڈرل "بی" ایریا۔ کراچی ۳۸

پاکستان اور بھارت سے ایک ساتھ شائع ہونے والا مجموعہ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ناشر
کاشف الیاس

ترتیب و تدوین اور اہتمام
کمال اکبر

رنگین عکاس : افتخار احمد

کتابت : جمیلہ تبسم

طابع
جاوید پریس کراچی

قیمت
بارہ روپے

مصوّر
اقبال مہدی

تلاش حق

۱۴

ایک نوجوان صوفی نے ملوکیت کے جبر و تشدد سے دِل برداشتہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ حق کیا ہے اور کہاں ہے؛ اِس فکر اور جستجو میں اس کو نہایت تلخ تجربات سے گزرنا پڑا۔ اُس نے مسیحیت کے دامن میں پناہ لینی چاہی تو عزلت نشیں اور تارک الدنیا راہبوں نے اس کو بتایا کہ عورت معصیت کی جڑ ہے۔ وہ وہاں سے غیر مطمئن اور دِل برداشتہ اسلام کی طرف واپس آیا تو معلوم ہوا کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لباس ہیں۔ بے چارہ صوفی اثبات اور نفی کے دوراہے پر تماشا بن گیا۔ پھر ملوکیت نے ایک حسین عورت کو ملا کر اس درویش کے ساتھ ایک دلچسپ مگر عبرت انگیز عملی مذاق کیا اِن واقعات کو جب الیاس سیتاپوری کے جادو نگار قلم نے داستان کی شکل میں کاغذ پر منتقل کیا تو ایک حسین اور لازوال کہانی وجود میں آگئی

لہو کا چراغ

۸۴

اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں جب انگریز تاجروں نے ہندوستان کے حکمران بننے کا خواب دیکھنا شروع کیا تو ان کا پہلا شکار نواب سراج الدولہ ہوا۔ اِس نوجوان اور ناتجربہ کار نواب کو زیر کرنے کے لیے سفید فام بدیسی تاجروں نے کون کون سے حربے استعمال کیے؟ یگانوں اور بیگانوں کی مہربانیوں اور قہرمانیوں کی خوبصورت کہانی۔ سرتاپا تجسس اور از اوّل تا آخر قلم کی جادوگری کا شاندار مرقع۔ اس عہد کے تہذیب و تمدن کی ایک خوبصورت تصویر۔ وہ سب کچھ جو ایک قاری ایک کہانی میں چاہتا ہے

سرخ داستان

۱۳۱

تاریخ اسلام کے ظالم و جابر حجاج بن یوسف کی قلمی تصویر۔ اس کا نام خوف اور دہشت کا پیغام تھا، بڑے بڑے سرکشوں اور بہادروں کو لرزہ براندام کر دینے والے سفاک مدبر کا جب ایک عورت سے واسطہ پڑا اور یہ پتھر اُس شیشے سے ٹکرایا تو پتھر پاش پاش ہوگیا۔ دہشت، خوف، تجسس اور رومان کا ایک خوبصورت ترین امتزاج۔

چاند کا خدا

۱۸۳

مہدی عباسی کے عہد کی داستانِ فتنہ و فساد
اس نے الوہیت کا دعوے کیا اور اپنے آس پاس سادہ لوح معتقدین کا ایک شہر آباد کر دیا۔ پھر اس شہر کے لیے اس نے چاند تخلیق کیا، جو ہر روز شام کو طلوع ہو کر صبح غروب ہو جاتا
دلچسپ اور حیرت انگیز تاریخی داستان، کیف آور حسن و عشق کے ساتھ۔

دو لفظ

وقت کی گونج میں صدیوں سے دانش وروں، سیاست دانوں، فلاسفروں، ادیبوں اور مدبروں نے انسانیت کے سینکڑوں درس دیئے ہیں۔ ان میں سے پہلا عظیم درس خدا نے دیا ہے ــــ اپنے پیغمبر کی زبان سے۔

الیاس سیتاپوری کے لئے میرے الفاظ نہ تو حوصلہ افزائی کے لئے ہیں اور نہ چکنی چپڑی تعریف کے لئے۔ میں اتنا جانتا ہوں، اور میرا ایمان ہے کہ وہ ان لوگوں سے ایک قدم آگے ہیں جو انسانوں کی کہانیاں تحریر کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک ادیب کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی بڑے مقام پر پہنچنے سے پہلے قدرت، انسانی رویّوں اور ماضی کا طالب علم ہو۔ اور وہ مستقبل میں آنے والے واقعات کی پیش گوئی کر سکتا ہو۔ اس کا تعلق انسان کی فطرت سے بھی ہو اور اس میں سیاست، اقتصادیات اور سوشل دور بھی آ جاتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے اگر یہ ساری خوبیاں کسی ایک آدمی میں مرکوز ہوں۔ الیاس سیتاپوری اس حیرت انگیز مجموعے کا نام ہے۔ جس کی کلاسیکی سند آپ کو مثال کے لئے بھی دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ان کی ذہانت کی طویل راہ میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ موضوعات کا لامتناہی سلسلہ جو یہ پیش کرتے ہیں اس سے ان کے قلم کے ادراک اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ قاری کے لئے وہ ایسے لمحات عطا کرتے ہوں، کہ وہ اپنے آپ کو فہم و فراست کی مسرت سے ہمکنار پاتا ہے اور ان کے کام سے اُردو ادب میں "جہاں اور بھی ہیں" کا سراغ ملتا ہے۔

الیاس سیتاپوری کی تحریریں جو دُوسروں سے یقیناً ممتاز ہیں۔ ان کی خاص بات ان کے ذہن کا شفاف حسن ہے۔ ان کے الفاظ میں سادگی کی خوشبو ہے ــــ جو پھیلتی ہوئی معنی خیز رکھتی ہے ان میں محاورہ کی چاشنی اور زبان کا رچاؤ پڑھنے والے کو انجانی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے، ان کی تحریر کی چمک اور شگفتگی پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ اور رُوح کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہے۔ یہ ساری خوبیاں الیاس سیتاپوری کی اپنی ذات کا کرشمہ ہے، اور ان کی اپنی زندگی کا خاصہ ہے۔ ایک ممتاز کہانی نویس ہونے کے باوجود ان کی زندگی کی سادگی حیرت انگیز ہے۔ وہ زندگی کی بنیادی ضروریات پر قانع ہیں۔ اور ان کی آنکھوں میں آنے والے دَور کی تحریروں کی چمک ہے جو نئی بلندیوں کا پتہ دیتی ہے۔

ایک عظیم ادیب کے لئے عظیم آرٹ پیدا کرنے کے لئے غیر متزلزل یقین، پُرجوش عقیدت،

بے کراں ریاضت اور عزم بالجزم استقلال کی ضرورت ہے ۔ یہ خوبی آپ کو انکے درک میں نظر آئیگی،
اپنے جوان بیٹے عدنان کی موت نے ان کو جس المیئے سے دوچار کیا وہ کسی قیامت سے کم نہ تھا لیکن جس استقلال اور ہمت سے انہوں نے "خدنگ عثمانی" کو مکمل کیا اس کا اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنی تخلیق سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی اپنی اولاد سے ۔

میں اس موقع پر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں سمجھتا کہ میری وہ ساری تحریریں جو میں نے سائنس، سیاست، سوشیالوجی، سائیکالوجی، فکشن اور سوشل سائنس کی صفحۂ قرطاس پر پھیلائی ہیں اور اس میں جو انسانی قدریں نظر آتی ہیں۔ وہ ان کی ذات اعلیٰ صفات کی مرہون منت ہیں۔ ان کی مسلسل سرپرستی اور اعانت سے مجھے بے اندازہ رہبری ملی ہے اور یہ کہتے ہوئے مجھے ذرا بھی شش و پنج نہیں کہ وہ میرے محسن ہیں جس کا میں ہمیشہ ممنون احسان رہوں گا۔

محمود احمد چانڈیو

(ایم اے ایل ایل بی (ایل ایل ایم)

پاکستان کا چارلس بُک شیکسپیئر

ادھر کئی سالوں سے برصغیر میں ہر پاکستانی اور ہندوستانی الیاس سیتاپوری کی باتیں کر رہا ہے اس کی وجہ صرف ان کی کتابیں نہیں ہیں جو پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں شمع جیسا ادارہ شائع کر رہا ہے بلکہ اس نئے ریڈر شپ کی برتھ BIRTH ہے جس سے الیاس سیتاپوری کی شخصیت وابستہ ہے۔ کولمبس کی طرح یہ ایک نئی دنیا ہے جسے دریافت کر کے بنایا نہیں گیا ہے بلکہ بنانے کے بعد دُنیا کے سامنے نمودار ہوا ہے۔

اور یہ نئی دُنیا دراصل الیاس سیتاپوری کے شعور کی وہ دُنیا ہے جس کو ان کے قلم نے دریافت کیا ہے، ان کی تحریر دراصل آج کے نئے معاشرے کو، جو محرومیوں کا شکار ہے۔ جینے کے آداب سکھاتی ہے

تاریخ میں یہ بات بڑی منفرد ہے۔ کہ بعض کتابیں ایک پوری قوم کا مزاج اور کردار بناتی ہیں، یا بدل دیتی ہیں۔ جب ہم ادب کی بات کرتے ہیں تو فرانس کی حیثیت کو بھول نہیں سکتے۔ فرانس کا ادب دراصل آج کا ماڈرن ادب ہے۔ موپاساں سے لیکر ژاں پال سارتر تک اس نے دانشوروں اور طلبہ کو نئی فکر اور نیا اظہار دیا ہے۔ اس دوران بہت سے ادیب ایسے آئے ہیں جنہوں نے فرانس کے لوگوں کے کردار پر اپنی تحریر کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ فرانس کے موجودہ معاشرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو منی اسکرٹس اور ہنری ہیریر کی کتاب پیپی لون PAPILLON نے اخلاقی دیوالیہ کا شکار کر دیا ہے۔ اس کے باوجود کہ منی اسکرٹس نوجوانوں کے کردار پر بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ لاکھوں لڑکیاں اسے خاص طور پر سردیوں میں پہن کر گھومتی ہیں، اور پیپی لون کو پڑھ کر اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیتی ہیں۔ اس کتاب پر جس قدر تنقید ہوئی ہے، اس کے باوجود اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس نے فرانس کے لوگوں کو ایک نئے تجربے سے ہمکنار کیا ایک نئی انجانی خوشی اور ایک تسکین جسے صرف پڑھ کر حاصل کیا گیا ہے۔

برصغیر کے معاشرے میں کئی انقلاب آئے ہیں، جس کے نتیجے میں لوگ فرار کی راہ تلاش کرنے لگے، اپنی محرومیوں اور پچھتاووں کو بھلانے کے لئے لوگ انڈر گراؤنڈ ادب کی طرف بھاگے۔ پاکستان میں پلپ لٹریچر کا دور شروع ہوا کچھ جاسوسی ناولوں کی اشاعت سے لوگوں کا دھیان بٹا۔ لیکن اس سارے دور میں آنے والے تحریری سیلاب نے آدمی کے تقدس کو مجروح کیا۔ خوشیوں سے اور بھی دور کر دیا اور انسان ایک DEPRESSION کے دور میں داخل ہو گیا۔

ادب بیچنے والوں نے انسانوں کے اس دور کی تنہائی اور ادب میں EXLOITATION کی اس سے بڑی مثال آپ کو نہیں ملے گی جہاں نئی نسل کو صرف CORRUPT کرنے کے لئے کروڑہا روپے کا ادب تیار کیا گیا۔ ہر نئی حکومت نے اس پر سختی کی لیکن ایک معاشرے میں جہاں پوری قوم ہی کو اس کے مسلک اور منزل سے ہٹانے کی سازش کی جارہی ہو وہاں کچھ مخلص لوگوں کی آواز کہاں سنی جاتی جاتی ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ ادب کے بامعہ روم بننے لگے اور ان میں گندگی کے انبار بیچنے لگے۔

اس پرآشوب نصف صدی میں جب یہ سلسلہ روز بروز دراز ہورہا تھا۔ ایک نام اُبھر کر سامنے آیا۔ الیاس سیتاپوری کے یہاں علم و آگہی تھی۔ تاریخ پر دسترس تھی۔ قلم میں ایک جادوئی کیفیت تھی اور دل میں ایک خلوص تھا۔ ان کے پڑھنے والے بھی فرار کی تلاش میں ان کو پڑھنے لگے لیکن اس میں بڑی جدت تھی۔ کچھ انفرادیت تھی۔ اور سب سے بڑی بات ان کی بے باکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے تمام لکھنے والے شاید ہسٹری پر اتنا عبور نہ رکھتے ہوں جتنا کہ الیاس صاحب کے پاس نظر آتا ہے، دراصل آپ ان کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد ان کی شخصیت کا مکمل اندازہ نہیں کرسکتے،

میرا عقیدہ ہے کہ انسان کسی قسم کی شہرت رکھتا ہو چاہے وہ بے انداز ہو یا معمولی، اس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ اس کی ایک اہم اور غیر معمولی وجہ ہوتی ہے۔ الیاس صاحب کی کتابوں کی یا کہانیوں کی غیر معمولی وجہ اس کا اپنا وزن ہوتا ہے۔ اور وہ کیفیت ہوتی ہے۔ جس سے مصنف دوچار ہوتا ہے، ایک دوسرا آدمی، جس کی زندگی الیاس صاحب کی طرح ہو اور جو ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا ہو۔ ایسی بات نہیں لکھ سکتا۔

ایک سوال کچھ لوگ کرتے ہیں کہ الیاس ادبی رسالوں میں نظر نہیں آتے۔ اس کی سیدھی سادی وجہ تو یہ ہے کہ ادبی رسالے کتنے چھپتے ہیں اور اس میں پیسہ کتنا ملتا ہے۔ مجھ سے سوال کیا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ آج کا ادب اور ادیب گہرائی اور گیرائی سے دور ہے۔ ہمارا ادب دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک ادب کی بیوروکریسی (BUREAUCRACY) ہے۔ جس میں ہر کوئی گھس بیٹھ نہیں سکتا۔ ایک ادب وہ ہے جو آخری سسکیاں لے رہا ہے۔ وہ ادب جس میں علم و تجربہ ہے۔ مسلسل محنت اور پیہم محبتوں سے تخلیق کردہ ادب اب مر رہا ہے۔ اور اس کی لاش کو کاندھے دینے والا کوئی نہیں ہے اب جو ادب باقی ہے۔ وہ ستائش اداد باہمی کے تحت معاشرے کے ایک خاص سوچ کے گرد جنم لیتا ہے پھولتا پھلتا ہے اور اس کے حصار میں ہر ایک کا داخل ہونا ایک ضمیر کا مسئلہ ہے۔

اس ملک میں کتنے رائٹر ہیں کہ جن کے نام پر رسالہ یا کتاب بکتی ہو۔ یہ بھی ایک آسان سوال ہے لیکن مشکل بھی اس لئے کہ اس ملک کا ہر دوسرا لکھنے والا اعظیم ادیب ہے۔ اس کا ادب سے شروع ہوتا ہے جہاں منٹو ختم ہوئے تھے یا وہ میر اور غالب سے کئی میل آگے ہے۔ ایسے لکھنے والوں کی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ جن کا نام بکتا ہے۔ ان کے نام انگلیوں پر بھی نہیں گنے جا سکتے ہیں، اس لئے کہ اشتہار دن

ہیں وہ بڑی عظمتوں کو چھوتے ہیں۔ لیکن ان کی واپسی قابلِ دید ہوتی ہے۔ الیاس سیتاپوری ــــ اس ملک کا واحد نام ہے جو بکتا ہے جس کی واپسی نہیں ہے۔

ادبی رسالوں سے دُور رہ کر الیاس صاحب نے اپنے اوپر بڑا کرم کیا ہے، اس لئے کہ کوئی بڑا لکھنے والا خود ایک معاشرے کو جنم دیتا ہے۔ خود ایک تحریک کا خالق ہوتا ہے۔ آج جب فرار کی کیفیت انسان پر اس قدر حاوی ہے۔ کہ وہ حد سے گذر جاتا ہے۔ الیاس سیتاپوری کی تحریریں اس کے سوچ کے انداز کو بدلتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ہر کردار محبت کا متلاشی نظر آتا ہے اور اس میں انسانیت سے پیار کی حیرت انگیز باتیں ہوتی ہیں۔ ان کے کردار نہ صرف حقیقت سے قریب ہوتے ہیں۔ بلکہ ان میں ایک تاریخی سچائی ہوتی ہے۔ جو پڑھنے والوں کو ان کا احترام سکھاتی ہے۔

ان کی تحریریں ساری دُنیا میں تہلکہ مچا رہی ہیں۔ جہاں جہاں اُردو پڑھنے والے بستے ہیں، الیاس سیتاپوری ان کے خوابوں میں چھائے ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ایک نئے باشعور معاشرے کو انجانی مسرتوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔ اس میں لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لئے پیچیدہ جاسوسی کہانیوں یا قتل و غارت کے سنسنی خیز بیانات سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ان کی تحریروں میں حیرت انگیز حقیقت اور سچائی ہوتی ہے۔ ان کے پاس علم ہے۔ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی تحریروں کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں کئی ممالک اور قوموں کے ادب، شاعری، سیاست اور تاریخ کا تجزیہ شامل ہے اس سلسلے میں ان کی ذہانت سے زیادہ ان کا حافظہ حیرت انگیز ہے۔

میری زندگی کا جتنا حصہ ادیبوں اور شاعروں میں گزرا ہے۔ اس سے کچھ زیادہ ان لوگوں میں گزرا ہے جو الیاس سیتاپوری کو پڑھتے ہیں۔ اس میں دانشوروں سے لیکر ایک عام رکشہ ٹیکسی والا تک شامل ہے اس میں جج، وکیل، سائنس داں، انجینئر اور ڈاکٹر تک شامل ہیں۔

ان تمام پڑھنے والوں کو میں الیاس سیتاپوری کی تحریک سے وابستہ سمجھتا ہوں، وہ پاکستان کے واحد رائٹر ہیں جنہوں نے ایک گھمبیر قسم کی ریڈر شپ بنائی ہے جس کا پڑھنے والا آپ کو پورے ملک کے ہر طبقے میں نظر آئے گا۔

الیاس سیتاپوری تاریخ کے انسان ہیں۔ صدیوں کی تاریخ کو پڑھ رہے ہیں، اور یہ مطالعہ مسلسل اور گہرا ہے۔ کیوں کہ تاریخ انسان کی ان صعوبتوں کی آئینہ دار ہے۔ جن سے حالات اس کو گزار رہے ہیں انسان کے کتنے جنم ہیں۔ اور کتنے BREED ــــ اس کے بھوک اور تشنگی کی کہانی کسی کو نیا عزم دیتی ہے اور کسی کو بد دل کر دیتی ہے۔ اور پھر ہم اس سے کتنے قسم کے کلچر سے دو چار ہوتے ہیں۔ بولنے کا انداز۔ انصاف اور قانون کے نئے نئے تقاضے۔ انسان کے اُبھرنے اور گرنے کے مختلف انداز۔ وقت کے ساتھ یہ سارے انداز بدل رہے ہیں۔ تاریخ بدل رہی ہے۔ انسان نئے نئے رُوپ میں جنم لے رہا ہے۔ ان سے ہم ہر دَور میں اپنے

تجربہ اور لیاقت کی روشنی میں ہی کچھ حاصل کرتے ہیں۔ کچھ فیصلے کرتے ہیں۔ اور کچھ غلطیاں اور انہی پچھتاووں کا نام تو زندگی ہے۔

الیاس سیتاپوری ان پچھتاووں کو اس خوبصورت انداز سے تحریر کرتے ہیں کہ ان سے فرار میں محرومی کی جگہ عزم کا پہلو ملتا ہے۔ اور ان تحریروں سے لوگ صرف وقت نہیں گزارتے۔

حقیقت یہ ہے کہ منشی پریم چند کے بعد ان کے قلم میں سچائی اور جرأت کی تحریک ملتی ہے۔ وہ نئے پاکستان کے جدید شیکسپیئر SHAKESPEARE ہی ہیں۔ اور ان کے بارے میں یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ جو قوم کے پڑھنے کا مزاج بدلتے ہیں۔ نئی ریڈرشپ کو جنم دیتے ہیں۔ ان کی قابلیت کا تعین تاریخ ہی کر سکتی ہے۔ اور تاریخ نے کبھی کسی لکھنے والے کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔

اسد جعفری

دو دو باتیں

"چاند کا خدا" یہ ہے الیاس سیتاپوری کی منتخب تاریخی کہانیوں کا چوتھا مجموعہ اس سے پہلے کشمیر کی کلی، عجائب خانہ عشق اور اندر کا آدمی چھپ چکے ہیں کشمیر کی کلی کا دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے جو عنقریب بازار میں آجائے گا۔

جہاں اردو ہے وہاں الیاس سیتاپوری کا کام اور نام موجود ہے مشہور ہے کہ الیاس سیتاپوری اردو کا واحد وہ افسانہ نگار ہے جس کی تحریروں کا لاکھوں افراد ہر ماہ انتظار کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا بظاہر ایک ہی جواب ہے وہ یہ کہ الیاس سیتاپوری کی کہانیاں اپنے مزاج، مذاق اور معیار کے اعتبار سے ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں پڑھ کر تعلیم یافتہ اور کم تعلیم یافتہ دونوں ہی اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں میں تجسس، زبان و بیان کا لطف، پلاٹ کی دلکشی، شاندار مکالمے، پراثر منظر نگاری، حیرت انگیز واقعات قاری کو اس عہد اور اس دور میں پہنچا دیتے ہیں جس عہد سے متعلق کوئی کہانی یا کوئی داستان ہوتی ہے۔ ان کہانیوں کا دوسرا بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ الیاس سیتاپوری قلم سے مصور کے برش کا کام لیتے ہیں۔ یہ کسی عہد اس کے کردار اور معاشرے کی ایسی لفظی تصویریں کھینچ دیتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو اسی عہد، اسی ماحول اور انہی کرداروں میں شامل محسوس کرنے لگتا ہے۔

ان کے قارئین میں زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف پیشوں کے لاکھوں افراد پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ ہمیں کئی خط ان قیدیوں کے بھی موصول ہوئے جنہیں سزائے موت کا حکم سنایا جا چکا ہے اور وہ اپنی موت کا بڑی افسردگی اور خوف سے انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوں میں ادارے کے نام یہی لکھا ہے کہ وہ موت سے پہلے الیاس سیتاپوری کی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں۔

الیاس سیتاپوری کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ انہیں پاک و ہند میں یکساں حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں بھی ان کے افسانے اور افسانوی مجموعے شمع گروپ جیسا معتمد اور مؤقر ادارہ شائع کر رہا ہے اسی طرح یو کے سے بھی بات

ہو رہی ہے وہاں کے کئی ادارے الیاس سیتاپوری کی کہانیاں اردو اور انگریزی میں بیک وقت شائع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کہانیوں کا سحر ہر اس شخص کو اپنا معتقد، مدّاح اور اسیر بنا لیتا ہے جو بالارادہ یا اتفاقیہ ان کی کوئی کہانی پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ میں اس بنیاد پر الیاس سیتاپوری کو بلاشبہ جادوگر قلم کار کہہ سکتا ہوں۔

الیاس سیتاپوری کے دوسرے افسانوی مجموعوں اور زیرِ نظر نئے مجموعے "چاند کا خدا" میں آپ کو ایک فرق اور نمایاں امتیاز فوراً ہی محسوس ہو جائے گا۔

الیاس سیتاپوری تقریباً دس سال سے تاریخی اور غیر تاریخی کہانیاں لکھ رہے ہیں مگر آج تک کسی بھی مجموعے میں ان کی تصویر نہیں شائع ہوئی۔ میں ان کے مداحوں سے ملتا جلتا رہا ہوں وہ جب بھی ان کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اپنا یہ اشتیاق ضرور ظاہر کرتے ہیں کہ الیاس سیتاپوری کی شکل کیسی ہے؟ عمر کتنی ہے؟ کوئی انہیں عمر رسیدہ باریش بوڑھا سمجھے ہوئے ہے کسی نے لکھنوی جلیبے کا مرزا پھریا سمجھ رکھا ہے۔ میں نے لوگوں کے شوق اور تجسس کے پیشِ نظر الیاس سیتاپوری سے درخواست کی کہ وہ 'چاند کا خدا' میں اپنی تصویر ضرور شائع کریں۔ یہ اپنی روایتی نام و نمود سے بے نیازی کی وجہ سے اس پر تیار نہیں ہوئے کہ اس مجموعے میں ان کی تصویر بھی شائع ہو۔ مگر میں اپنی ضد اور بات پر اڑا رہا اور ان کی تصویر کو اس مجموعے میں شائع کر ہی دیا چنانچہ الیاس سیتاپوری کے پرستار اب ان کے افسانوں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ہی ان کی تصویر بھی دیکھ سکیں گے اور شاید ایسا بھی ہو کہ ان کے مداحوں میں سے بعض اس تصویر کو کتاب سے نکال کر محفوظ بھی کر لیں۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اب الیاس سیتاپوری کے سارے مجموعے میری ہی نگرانی میں شائع ہوا کریں گے چنانچہ ان کا چوتھا مجموعہ راگ کا بدن موجودہ مجموعے کے ماہ ڈیڑھ ماہ بعد شائع کر دیا جائے گا۔ جبکہ مذکورہ مجموعہ شمع بک ڈپو دہلی نے پہلے ہی چھاپ دیا ہے۔

الیاس سیتاپوری نے تاریخی کہانیوں کے علاوہ سماجی اور پُراسرار کہانیاں بھی لکھی ہیں اور میرے پروگرام میں ان کی اشاعت بھی شامل ہے۔ آپ کا تعاون میری ہمت افزائی کرے گا۔ اللہ نے چاہا تو الیاس سیتاپوری کا سارا کام ایک نہ ایک دن کتابی شکل میں ان کے پرستاروں اور مداحوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا۔

کمال اکبر
پبلشنگ منیجر

تلاش حق

راہبوں نے اس کو بتایا کہ عورت معصیت کی جڑ ہے۔ وہ وہاں سے غیر مطمئن اور دل برداشتہ اسلام کی طرف واپس آیا تو معلوم ہوا کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لباس ہیں۔ بے چارہ صوفی اثبات اور نفی کے دوراہے پر تماشا بن گیا۔ پھر ملوکیت نے ایک حسین عورت کو کو ملا کر اس درویش کے ساتھ ایک دلچسپ مگر عبرت انگیز عملی مذاق کیا ان واقعات کو جب الیاس سیتاپوری کے جادو نگار قلم نے داستان کی شکل میں کاغذ پر منتقل کیا تو ایک حسین اور لازوال کہانی وجود میں آگئی

شیبان نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، وہ بڑے خون خرابے اور جبر و تشدد کا ماحول تھا، اس کا خاندان بنو امیہ کی خدمت کرتا چلا آیا تھا۔ دادا، نانا، چچا، بابا میں سے ہر ایک نے خلفائے بنو امیہ کی نوکری کی تھی، اور ان میں سے ہر ایک نے خاصی دولت بھی کمائی تھی، ہر ایک کا اثر و رسوخ بھی بہت زیادہ تھا اور ہر ایک کو معاشرے میں عزت اور احترام کا ایک خاص مقام بھی حاصل رہا تھا، لیکن ان عزت افزائیوں کے پیچھے ایک المیہ بھی مستقل کارفرما تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے تمام نامی گرامی بزرگ اپنی طبعی موت نہیں مرے تھے بلکہ انہیں مختلف اوقات میں اور مختلف الزامات میں قتل کر دیا گیا تھا، خلفا کے ارد گرد خوشامدی، حاسد، زمانہ ساز، موقع پرست اور سفاک امرا ہمیشہ اور ہر وقت اس تاک میں رہتے کہ کب کوئی اچھا موقع ہاتھ آئے اور وہ اپنے حریف امرا کو ٹھکانے لگوا دیں، معتوب امرا کو نہ صرف قتل کر دیا جاتا بلکہ جرمانے کے نام پر ان سے گراں قدر اور خطیر رقمیں بھی حاصل کی جاتیں، ان کی جائیداد اور اثاثے بحق خلافت ضبط کر لئے جاتے اور بعض حالتوں میں ان کے پسماندگان کو روٹیوں تک کے لالے پڑ جاتے۔ شیبان نے ہوش سنبھالنے کے بعد یہی روح فرسا مناظر دیکھے اور سنے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بار بار اس کے عزیزوں رشتے داروں نے دربار سے اعلیٰ عہدے اور مناصب حاصل کر کے خوشیاں منائی تھیں اور ان گھروں سے خوشیوں اور شادمانیوں کے قہقہے گونجتے سنے تھے لیکن بعد میں انہی گھروں سے نالہ و شیون اور گریہ و بکا کی صدائیں بھی سنی تھیں۔ وہ اپنے سینے میں ایک حساس دل رکھتا تھا، چنانچہ جوان ہوتے ہوتے دربار اور خلافت کے نام سے اسے خوف آنے لگا، اس کا باپ سعید خلافت کے مالی منصب پر فائز تھا، لیکن کسی بھول چوک کے جرم میں اسے نہ صرف ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا بلکہ قتل بھی کر دیا گیا اور دس ہزار دینار جرمانے کے نام پر بھی وصول کر لئے گئے۔ باپ

کے قتل کے بعد شیبان کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ گھر میں جو کچھ باقی بچا تھا، اس سے دو ڈیڑھ سال کا خرچ چل گیا۔ دربارِ خلافت کے بلاوے کے پیغام کے ساتھ اُسے حکم ملا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے باپ کی جگہ حاصل کر لے۔ گھر میں بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا، اس لئے اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ خلافت کی ملازمت نہیں کرے گا۔ ماں نے ہمت بندھائی کہ جس موت سے وہ خوفزدہ ہے وہ ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی طرح آتی ہی ہے اس لئے اس سے خوفزدہ ہو کر جاہ و منصب سے منہ پھیرنا کم ہمتی اور بزدلی ہے لیکن ماں کی نصیحتوں کا شیبان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ دمشق کے شمال مغرب میں پھیلے ہوئے اس پہاڑی سلسلے میں چلا گیا جو جبالِ لبنان کہلاتے ہیں اور جو جنوب مشرق میں مکے سے شروع ہو کر مدینے سے گزر کر فلسطین اور شام کو پیچھے چھوڑتے ایشیائے کوچک میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان پہاڑی سلسلوں میں وہ لوگ آباد تھے جنہیں دنیا پسند نہیں آئی تھی اور جو دنیا کی کثافتوں اور غلاظتوں سے تنگ آ کر روحانی جلا اور سکون کی خاطر پہاڑی غاروں میں جا چھپے تھے۔ ان تارک الدنیا لوگوں میں مسلمان، مسیحی اور پارسی بھی شامل تھے۔ شیبان درویش بن گیا اور فقر و فاقے کی زندگی اختیار کی۔ یہاں غاروں کے علاوہ ویران مگر سرسبز و شاداب پہاڑی ڈھلانوں اور مسطح حصوں میں سرکی اور لکڑی کی کٹیا بنی ہوئی تھیں، ان کے علاوہ مسیحی راہبوں اور گوشہ نشینوں نے پتھر کے ٹکڑوں کو تلے اوپر رکھ کر حجرے اور خانقاہیں تعمیر کر لی تھیں اور ان میں مضبوط دروازے لگا کر بہت محفوظ کر لیا تھا۔ خانقاہوں کے دروازے اتنے مضبوط تھے کہ اگر ان کو اندر سے بند کر لیا جاتا تو باہر کا آدمی کسی طرح اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

شیبان درویشوں اور گوشہ نشینوں کی اس کوہستانی بستی میں کسی ایسے درویش کی تلاش میں تھا، جو روحانی کمالات میں یکتا اور بقیہ دوسروں پر فوقیت رکھتا ہو۔ یہاں اس نے مذہب و ملت کی قید بھی ختم کر دی تھی اور وہ ہر اس درویش کی مریدی اختیار کرنے پر آمادہ تھا جو اس کے قلب اور روح کو مطمئن کر دے۔ وہ مسلمان فقراء سے ملا اور ان کے اردگرد مریدوں کا ہجوم دیکھ کر بہت مایوس ہوا، اس ہجوم میں مرد بھی ہوتے اور عورتیں بھی۔ شیبان ان فقراء سے بہت مایوس ہوا اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ کیسے تارک الدنیا ہیں جن کے آس پاس دنیا کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ ان فقراء کا کہنا ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے میں نورِ الٰہی دیکھ رہے ہیں، اس لئے وہ دنیا کو ترک کر دینے کے باوجود ازلی نور کے اس پرتو سے جو مخلوق کہلاتی ہے، منہ نہیں موڑ سکتے۔ شیبان نے بعض فقراء کو عورتوں کی طرف راغب دیکھا

تو اس کا ان سے دل بیزار ہوگیا اور وہ پارسی فقراء کی طرف چلا گیا، ان فقراء نے اسے بتایا کہ پوری کائنات میں ازل سے دو طاقتیں برسرِ پیکار ہیں، ان میں سے ایک نور ہے اور دوسری تاریکی۔ وہ نور کو یزداں اور تاریکی کو اہرمن کہتے تھے۔ پارسی فقراء کی بنیادی تعلیم نے اسے بہت مایوس اور دل برداشتہ کر دیا۔ اس نے ایک معزز اور ٹھیٹ مسلم گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اور خدا کی آخری کتاب میں یہ پڑھا تھا کہ اللہ نور السمٰوات والارض (اللہ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے) اور اس نور کو کائنات کی سب سے اعلیٰ و ارفع ذات اور قوت قرار دیا گیا تھا، اس ذات کے علاوہ ایک دوسری ذات بھی تھی جسے ابلیس کہا جاتا تھا۔ اور جو اس بڑی اور سب سے زیادہ طاقت ور ذات کا ملعون، مقہور اور معتوب تھا۔ لہٰذا ابلیس کو خدا کا ہم پلہ قرار دینا عقل اور عقیدے کے فتور کے سوا کچھ اور نہیں قرار دیا جا سکتا، وہ پارسی فقراء سے بھی بدگمان ہوگیا اور مسیحی خانقاہوں کا رُخ کیا۔ وہ ایک بے ڈول، بے ڈھنگی سی خانقاہ کے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ یہ خانقاہ اندر سے بند تھی اس نے کئی جھریوں اور درزوں سے جب جھانکنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ ان جھریوں اور درزوں کو کپڑے کے چیتھڑوں اور درختوں کی چھالوں سے بند کر دیا گیا ہے جس سے اندر کی کوئی چیز دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ جب وہ اندر کا کچھ دیکھ نہیں سکا تو مجبوراً آہستہ آہستہ دروازے کو تھپتھپایا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا کچھ دیر بعد کسی نے ایک جھری کو صاف کر کے اپنی ایک آنکھ اس پر لگا دی۔ شیبان نے پھر دستک دی اندر سے کسی نے پوچھا۔ "کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں حق کا متلاشی ہوں اور روحانی سکون کی تلاش میں نکلا ہوں۔"

اندر سے پھر کسی نے سوال کیا۔ "تیرے ساتھ کوئی عورت تو نہیں ہے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ نہ تو کوئی عورت ہے نہ مرد، میں تنہا ہوں۔"

اندر سے ہدایت ملی۔ "دروازے کے داہنی طرف دیوار پر کچھ لکھا ہوا ہے، کیا تو نے اسے پڑھ لیا؟ اور یہ بتا کہ تو اس سے کس حد تک متفق ہے۔"

شیبان نے داہنی طرف کی دیوار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میں نے وہ عبارت نہیں پڑھی، ابھی پڑھ کر بتاتا ہوں کہ میں اس سے کس حد تک متفق ہوں۔"

شیبان نے دیکھا داہنی طرف دیوار کے ایک پتھر پر کندہ تھا۔

"راہبو! حذر کرو! دو جماعتوں کی قربت سے، ایک عورتوں سے دوسرے

یا پادریوں سے ۔"
اس نے دروازے کو تھپتھپا کر جواب دیا۔ "محترم راہب! نہ تو میں عورت ہوں اور نہ ہی پادری، مجھے تو اندر آنے دیجئے۔"
دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا اور شیبان کا ایک چالیس بیالیس سالہ راہب نے افسردگی سے استقبال کیا، بولا۔ "فوراً اندر آجاؤ تاکہ میں خانقاہ کے دروازے اندر سے بند کر لوں۔"
شیبان جیسے ہی اندر داخل ہوا، راہب نے دروازے بند کر لئے۔
خانقاہ کی فضا عجیب سیلی سیلی سی تھی۔ چاروں طرف سے بند ہونے کی وجہ سے شیبان کو اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ راہب کے پیچھے چلتا ہوا خانقاہ کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی کشادہ جگہ نہیں تھی تقریباً تیس ہاتھ چوڑی اور چالیس ہاتھ لمبی خانقاہ کے ایک طاق میں زیتون کے تیل کا چراغ روشن تھا، چھت کے بیچ میں لمبائی سے دو موٹی موٹی بلّیاں رکھ کر ان پر دونوں طرف ڈھلواں لکڑیاں بچھا کر گھاس پھوس سے پاٹ دیا گیا تھا پٹائی اتنے بے ڈھنگے انداز سے کی گئی تھی کہ کہیں کہیں سے آسمان صاف دکھائی دیتا تھا ایک کونے میں عود دان سے دھواں اٹھ رہا تھا، جس سے خانقاہ کی فضا روحانی اور پر اسرار سی ہو گئی تھی۔ سامنے کی دیوار پر چند تصویریں بنی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک میں حضرت مریم اپنے بیٹے کو گود میں لئے ہوتے بڑی محبت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ دوسری میں حضرت مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ ان تصویروں کے سامنے ایک اور شخص سجدے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساکن و صامت ہونے کی وجہ سے شیبان کو یہ شبہ گزرا کہ شاید وہ سویا ہوا ہے
راہب نے شیبان کے لئے ایک صاف ستھری مگر بوسیدہ سی چادر بچھا دی، اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پوچھا۔ "بیٹھ جا میرے بچے اور بتا کہ تو یہاں کیوں آیا ہے؟"
شیبان نے بیٹھتے ہوتے جواب دیا۔ "محترم راہب! میں سکون کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں رہا ہوں، میں مسلمان فقراء کے حجروں میں گیا لیکن وہاں عورتوں اور مریدوں کا وہ ہجوم دیکھا کہ ترکِ دنیا کا مفہوم ہی سمجھ میں نہ آیا۔ وہاں سے مجوسیوں کے خلوت کدوں میں گیا اور ان کے عقیدے کی اس بات نے بیزار اور برگشتہ کر دیا کہ یزداں کے مقابل ایک اہرمن بھی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں۔ مقدس راہب! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس دنیا اور اس کائنات میں کوئی ایسی طاقت بھی ہے جو خدا کی مدِ مقابل یا ہم پلہ ہو۔"

راہب نے پوچھا۔ "پھر تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟"
شیبان نے جواب دیا۔ "میں ایک غمزدہ انسان ہوں اور سکون کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں، کیا یہاں، اس خانقاہ میں میری روحانی تربیت ہو سکتی ہے؟"
راہب کے افسردہ اور اداس چہرے پر مسکراہٹ سے تازگی پیدا ہو گئی، بولا۔ "کیوں نہیں میرے بچے! ہم سب روحانی سکون کے متلاشی ہیں، جو ڈھونڈے گا ضرور پاتے۔" پھر پوچھا۔ "تجھے بھوک تو نہیں لگ رہی ہے؟"
شیبان نے جواب دیا۔ "نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔"
دوسرے راہب نے سجدے سے سر اٹھایا اور شیبان سے اس طرح مزاج پرسی کی گویا دونوں ایک دوسرے سے بہت عرصہ سے واقف ہیں۔ ان دونوں نے شیبان سے اس وقت تفصیلی بات نہیں کی بلکہ اس پر آمادہ کیا کہ وہ دونوں کے ساتھ کچھ عرصے رہے۔ اسے خود ہی محسوس ہونے لگے گا کہ یہاں سکون ہی سکون ہے۔ اور ترکِ آرزو اور ترکِ خوشی ہی سے طمانیت اور سکون حاصل کیا جا سکتا ہے۔
شیبان ان دونوں کے ساتھ رہنے لگا، ان دونوں کے پاس کبھی کبھی نواحی بستیوں کے وہ بھولے بھالے کاشتکار اور باغبان آ جاتے جن کی نظر میں یہ دونوں بہت ہی مقدس اور لائقِ تعظیم تھے۔ یہ لوگ آتے تو اپنے ساتھ شلغم سبزیاں اور پھل وغیرہ بھی لاتے۔ یہ دونوں انہی کاشتکاروں اور باغبانوں کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔
اس ویران اور اجاڑ خانقاہ میں رہ کر شیبان بہت جلد بیزار ہو گیا۔ یہاں اسے ہر وقت یہی تعلیم دی جاتی کہ عورت معصیت کی جڑ ہے اور اس پر نظر ڈالنے سے بھی آدمی گناہگار ہو جاتا ہے۔ شیبان کی بے چین اور متجسس طبیعت ان دونوں کی اس تعلیم سے مطمئن نہیں ہوئی کہ کوئی شخص عورت کو محض دیکھ کر ہی گناہگار ہو سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ اعتراض پیدا تو ہو گیا تھا مگر اس نے ان دونوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ابھی تک ان دونوں راہبوں نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسلام ترک کر دے لیکن ان کے ذہنوں میں یہ بات موجود ضرور تھی کہ شیبان کو دائرۂ اسلام سے نکال کر حلقۂ مسیحیت میں داخل کر لیا جائے۔ وہ دونوں ایک ایسے موقع کی تلاش میں تھے جب وہ شیبان سے مسیحیت اور اسلام پر بات کریں۔
شیبان کا جب کبھی دل گھبراتا تو وہ خانقاہ سے نکل کر اونچی نیچی سرسبز پہاڑیوں میں نکل جاتا اور حسین قدرتی مناظر سے دل بہلاتا رہتا۔ اسے ہر چیز میں خالقِ حقیقی کا عکس نظر آتا۔ کبھی کبھی اپنی ماں کا خیال بھی آ جاتا ہے۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی جب اسے اپنے بزرگ راہبوں کا یہ قول یاد آتا کہ عورت معصیت کی جڑ ہے اور اس پر نظر ڈالنے سے بھی آدمی گناہگار ہو جاتا ہے۔ تو وہ اس خانقاہ سے بھی بیزار ہو جاتا۔ وہ سوچتا آخر ماں بھی

تو عورت ہی ہوتی ہے۔ کیا ماں کو دیکھنا بھی انسان کو گنا ہگار کر سکتا ہے؟ ابھی وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ اسے ایک بوڑھی عورت اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ شیبان نے اس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر اپنی راہ لینا چاہی لیکن عورت نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ شیبان کھڑا ہو گیا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

بوڑھی عورت ہانپتی کانپتی اس کے پاس پہنچ گئی اور پوچھا۔ "بیٹے! کیا تم یہیں کہیں رہتے ہو؟"

شیبان نے جواب دیا "ہاں میں یہیں رہتا ہوں، مجھ سے کوئی کام؟"

بڑی بی نے کہا۔ "سنتی ہوں یہاں کے غاروں اور خانقاہوں میں ہر ملت و مذہب کے درویش رہتے ہیں کیا یہ خبر درست ہے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "خبر تو درست ہے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہی ہیں؟"

بڑی بی نے کہا۔ "بیٹے میں حلب سے آئی ہوں، کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں کوئی ایسی خانقاہ یا غار بھی ہے جہاں زاہدانِ شب بیدار یا تارکانِ دُنیا پناہ لیتے ہوں۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "ہاں، یہاں ایسی کوئی ایک جگہ تھوڑی ہے، کئی ہیں، اور یہاں مذہب و ملت کی بھی کوئی تخصیص نہیں جس کا جی چاہتا ہے دنیا کو لات مار کر یہاں چلا آتا ہے۔"

بڑی بی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ان کی کپکپاہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ ضعیفی میں طویل مسافت نے انہیں تھکا دیا ہے۔ بڑی بی نے اپنے آنسو پونچھے اور بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کیا یہاں ایسے دو راہب بھی رہتے ہیں جن کی عمریں چالیس اور پینتالیس سال کے اندر اندر ہوں اور دونوں آپس میں بھائی بھائی بھی ہوں۔"

شیبان چونک پڑا، بڑی بی تو انہی دونوں راہبوں کو پوچھ رہی تھیں، جن کی خانقاہ میں وہ رہ رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "ہاں میں ان دونوں سے واقف ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان میں چھوٹے بھائی کا نام جان اور بڑے کا فلپ ہے۔"

بڑی بی تڑپ گئیں، بے اختیار شیبان کا ہاتھ پکڑ لیا اور عاجزی سے کہا۔ "میرے بچے! بیشک میں انہی دونوں کو تلاش کر رہی ہوں، وہ دونوں میرے بیٹے ہیں اور رہبانیت کے شوق میں بیس سال پہلے گھر سے نکل بھاگے تھے۔"

شیبان کو بڑی بی کی باتوں پر یقین نہیں آیا، پوچھا۔ "کیا وہ دونوں واقعی آپ

کے بیٹے ہیں؟"

بڑی بی نے اسی والہانہ انداز میں جواب دیا۔ "میرے بچے! یسوع مسیح تیری ماں کو میرے جیسے دکھ سے معاف رکھیں، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں، میں ان دونوں کو بیس سال سے تلاش کر رہی ہوں اور ان کی تلاش میں، میں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی ہے، میں مرنے سے پہلے ان دونوں کو ایک نظر دیکھنا ضرور چاہتی تھی، مسیح نے میری دعا قبول کر لی۔"

شیبان کو بڑی بی پر رحم آیا، اس نے بڑی بی کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں سہارا دیتے ہوئے خانقاہ کی طرف لے چلا۔

کچھ دیر بعد وہ خانقاہ کے دروازے پر پہنچا تو بے اختیار دستک دینے لگا، اس کا خیال تھا کہ دونوں راہب بیس سال بعد اپنی ماں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور شیبان کے شکر گزار ہوں گے، لیکن حسب دستور ذرا دیر بعد اندر سے چھوٹے بھائی، جان کی آواز سنائی دی وہ پوچھ رہا تھا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں ہوں شیبان، دروازہ کھولئے اور دیکھئے آپ دونوں کے پاس کون آیا ہے؟"

جان نے دروازہ کھول دیا لیکن شیبان کے ساتھ ایک بوڑھی عورت کو کھڑا دیکھ کر دروازے کو فوراً بند کر لیا۔ اب بڑی بی بھی ضبط نہ کر سکیں، انہوں نے اپنے بیٹے جان کی ایک جھلک دیکھ کر یوں محسوس کیا تھا، گویا کسی کسان کے پیاسے کھیت پر سے سیاہ بادل کا کوئی ٹکڑا بغیر برسے ہی گزر گیا ہو۔ ماں نے زور زور سے دروازہ پیٹ ڈالا اور روتے ہوئے کہا "میرے بیٹے جان! میرے فلپ! خدا کے لئے دروازہ کھول دو، دیکھو میں نے تم دونوں کے لئے ایک جہان کی خاک چھانی ہے، اب مجھ پر رحم کرو اور تم دونوں مجھے جی بھر کے دیکھ لینے دو۔"

اندر سے جان نے جواب دیا۔ "ماں! تم واپس جاؤ۔ ہم دونوں بھائی باہر نکل کر اپنی بیس بائیس سالہ ریاضت کو تباہ و برباد نہیں کر سکتے۔"

ماں نے پھر عاجزی سے کہا۔ "میرے بچو! یہ کون ہے جو تمہیں باہر نکلنے سے روک رہا ہے؟"

جان نے جواب دیا۔ "بجز مسیح کے کوئی نہیں۔ ماں تم واپس جاؤ اور میری بیس سالہ ریاضت کو خاک میں نہ ملاؤ۔"

ماں کی حالتِ زار پر شیبان کو بھی رحم آگیا، ذرا ترشی سے پوچھا۔"مقدس راہبو! یہ کیا بات ہے؟ کیا آپ دونوں اپنی ماں کو اس لئے نہیں دیکھ سکتے کہ ماں بھی عورت ہے اور عورت پر نظر ڈالنا معصیت میں داخل ہے۔"

اندر سے جان نے جواب دیا۔"ہاں، ماں بھی عورت ہے، شیبان! تو میری ماں کو راضی کر کے واپس کر دے اور اس سے کہہ دے کہ ہم دونوں بھائی اپنی جانیں تو دے سکتے ہیں لیکن ماں کی خاطر اپنی عبادت پر پانی نہیں پھیر سکتے۔"

شیبان کا دل کھٹا ہو گیا، بولا۔"میرے بزرگ راہبو! یہ آپ کا کیسا دین ہے جو آپ کے اور آپ کی ماں کے درمیان حدِ جدائی بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے آپ دونوں باہر نکلیے اور بیس سالہ مفارقت کی آگ میں جھلسی ہوئی صد درجہ لائق تعظیم ماں کو سینے سے لگایئے۔ یہ آپ دونوں کو ہو کیا گیا ہے؟"

اس بار جان کی جگہ فلپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے ڈانٹتے ہوتے کہا۔"شیبان جب تو مذہب کی روح سے واقف نہیں تو پھر درمیان میں کیوں دخل دیتا ہے؟"

شیبان نے ادب سے جواب دیا۔"میرے بزرگ راہبو! میرا خیال ہے میں نے ابھی تک کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔ خدا کے لئے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کیجئے اور اپنی ماں کو ان عورتوں میں نہ شامل کیجئے جن پر ایک نظر ڈالنا معصیت میں داخل ہے۔"

ماں نے شیبان کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور دروازے کو زور زور سے پیٹتے ہوتے کہا۔"میں کہتی ہوں دروازہ کھول دو، اگر تم دونوں نے اب بھی دروازہ نہ کھولا تو میں اپنا سر کی ٹکروں سے خود کو لہو لہان کر لوں گی، پھر یا تو دروازہ کھلے گا یا میں مر جاؤں گی۔"

. اندر سے فلپ نے درشت لہجے میں جواب دیا۔"ہمیں اپنی ریاضت محبوب ہے دروازہ نہیں کھلے گا۔"

شیبان نے محسوس کیا فلپ بات پوری کر کے ہٹ گیا ہے۔

ماں نے دروازے سے سر ٹکرانا شروع کر دیا، جس سے پیشانی کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور وہاں سے خون ابلنے، بہنے لگا۔ شیبان نے چیخ کر دونوں بھائیوں سے درخواست کی۔"میرے بزرگ راہبو! یہ آپ کیا کر رہے ہیں: مسیح نے تو دل آزاری سے منع کیا ہے نہ کہ آپ دونوں اپنی ماں کا دل دکھا رہے ہیں، خدا کے لئے باہر آجایئے اور اپنی ماں کو سنبھالیئے۔"

اندر سے جان نے جواب دیا۔"افسوس شیبان کہ ہم دونوں باہر نہیں آسکتے۔ ہمیں اپنی عبادت اور تقوے کا زیاں کسی حال میں بھی منظور نہیں۔ تم اس عورت کو روکو کہ خودکشی نہ

کرے کیونکہ خودکشی کو مسیح نے حرام قرار دیا ہے۔"
اس وقت تک ماں اس قدر لہولہان ہو چکی تھیں کہ پورا چہرہ خون سے گلنار ہو گیا تھا، خون ان کی ٹھوڑی سے بہہ بہہ کر سفید لباس کو بھی سرخ کئے دے رہا تھا۔ شیبان نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی، بولا۔" ماں! آپ ان ظالموں سے رحم اور ہمدردی کی امید نہ رکھیں میں آپ کو ماں بنا کر رکھوں گا۔ خدا کے لئے خود کو زخمی نہ کیجئے اور جتنا کچھ ہو چکا ہے، اس پر بس کیجئے۔"
لیکن بڑی بی نے گویا شیبان کی بات سنی ہی نہیں اور ان کے عمل میں زیادہ شدّت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے دروازے سے ہٹ کر پتھریلی دیوار سے سر ٹکرانا شروع کر دیا، ابھی تین چار بار ہی سر ٹکرایا تھا کہ سر سے خون کے فوارے ابلے اور وہ بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ شیبان بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اس نے بڑی دل سوزی سے ایک بار پھر دونوں بھائیوں کو مخاطب کیا تھا۔"ظالم راہبو! خدا کے لئے باہر آجاؤ! تم دونوں اپنی ماں پر یہ کیسا ظلم کر رہے ہو! دنیا کا کوئی مذہب بھی کسی شخص کو ایسے ظلم کی اجازت نہیں دے سکتا۔"
اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ شیبان نے زخمی اور بے ہوش بڑی بی کو اٹھا کر گھاس پر لٹا دیا اور اپنے دامن سے ان کے چہرے کا خون صاف کرنے لگا لیکن سر اور پیشانی کا خون بہہ بہہ کر برابر ان کے چہرے پر آرہا تھا، اس نے اپنا کوفیہ (سر میں لپیٹنے کا کپڑا) اتار کر زخموں پر رکھ دیا لیکن زخم اتنے شدید اور گہرے تھے کہ خون کسی طرح بند ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت پریشان ہو گیا۔ ایک تو ضعیفی، دوسرے زخموں سے بہت زیادہ خون بہہ گیا، چند گھنٹوں کے اندر ہی بڑی بی نے دم توڑ دیا۔ شیبان کو رونا آگیا، اس کا دل بھر آیا۔ وہ لاش کو سبزے پر چھوڑ کر ایک بار پھر خانقاہ کے دروازے پر پہنچا اور دستک دیتا ہوا بولا۔"ظالمو! وقت ختم ہو گیا، تمہاری ماں نے دم توڑ دیا، اب تو باہر نکل آؤ اور ان کی آخری رسوم ادا کرو۔"
اندر سے جان نے ناگواری سے کہا۔"شیبان! اگر تیرا یہ خیال ہے کہ اس طرح ہم تیرے جھانسے میں آجائیں گے تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دے، ہم دونوں اس وقت تک باہر نہیں نکلیں گے جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے اور تو نے ہماری ماں کی آخری رسوم بھی ادا کر دی ہیں۔"
شیبان نے سر پکڑ لیا، پوچھا۔"تو گویا تم دونوں اب بھی نہیں نکلو گے؟"
جان نے جواب دیا۔"ہاں کیونکہ ہم پہلے ہی تمہیں یہ بتا چکے ہیں کہ عورت معصیت کی جڑ ہے وہ ماں ہو، بہن ہو، بیوی ہو یا کوئی اور ہو، ہر عورت پر نظر ڈالنا تک معصیت میں

داخل ہے۔"
شیبان نے کہا۔" پھر اب میں کیا کروں؟"
جان نے جواب دیا۔"میری ماں کا کفن دفن کر دو، اس کے بعد ہمارے پاس آؤ۔"
شیبان نے کہا۔" لیکن میں کفن دفن کس طرح کروں گا، میں تنہا ہوں اور میرے پاس کفن دفن کے لئے کوئی کپڑا بھی نہیں۔"
اندر کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی شیبان نے کہا۔"جان! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"
پھر کوئی جواب نہیں ملا، شیبان ایک مخمصے میں پھنس گیا تھا، اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے اچانک خانقاہ کا دروازہ کھلا اور کسی نے اندر سے دو چادریں پھینک دیں، اس کے بعد دروازہ پھر بند ہو گیا اور جان کی آواز سنائی دی۔" ان چادروں سے ماں کا کفن دفن کر دو، اور اس کام میں اُن آنے جانے والوں سے مدد لے لو جو ہماری خانقاہ میں غلّہ، سبزی اور پھل وغیرہ لے کر آیا کرتے ہیں۔"
شیبان نے دونوں چادریں اٹھالیں۔ یہ بالکل بوسیدہ تھیں۔ وہ چادریں لے کر پھر بڑی بی کی لاش پر چلا گیا اور کسی مددگار کا انتظار کرنے لگا۔ کئی گھنٹے بعد ادھر سے چند کاشتکار گزرے جو کسی گوشہ نشین کی دعائیں لے کر خوش خوش اپنے گھروں کو واپس جارہے تھے۔ انہوں نے شیبان کی مدد کی اور مل جل کر کفن دفن سے فراغت حاصل کر لی۔
شیبان کے دل پر اتنا بوجھ تھا کہ اس سے چلا بھی نہیں جارہا تھا، وہ اپنے وجود کو زبردستی کھینچ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے جان کی آواز سنائی دی۔"کیا کفن دفن سے فارغ ہو گئے؟"
شیبان نے جواب دیا۔" ہاں میں معصیت کی جڑ کو زمین میں دبا آیا، اب تو دروازہ کھول دو۔"
جان نے دروازہ کھول دیا۔ شیبان شکستہ دلی سے خانقاہ میں داخل ہو گیا۔
جان نے کہا۔"شیبان! تو میرے بھائی کے پاس چل۔ ہم دونوں نے تیرے لئے ایک فیصلہ کیا ہے۔"
شیبان نے جواب دیا۔" چلو، میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہے لیکن پہلے تم دونوں اپنا فیصلہ سنا دو، اس کے بعد میں اپنا فیصلہ بھی سنا دوں گا۔"
پھر یہ دونوں فلیپ کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔ فلیپ انجیل مقدس کی تلاوت کر

رہا تھا۔

فلپ نے بولے بغیر ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ دونوں فلپ کے سامنے بیٹھ گئے۔

تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد فلپ نے انجیل کو بوسہ دے کر رکھ دیا اور زیر لب کوئی دعا مانگنے لگا۔ اس کی نظریں شیبان پر ٹکی ہوئی تھیں اور ان نظروں میں شکایت تھی، نفرت تھی اور ایک قسم کی بیزاری تھی۔ دعا سے فارغ ہونے کے بعد فلپ نے جان سے دریافت کیا۔ "کیا تم نے میرا فیصلہ اس کے گوش گذار کر دیا؟"

جان نے جواب دیا۔ "نہیں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ فیصلہ آپ سنا دیں۔"

فلپ نے کچھ دیر کے لئے سکوت اختیار، شاید وہ فیصلے کے لئے پیرایہ بیان سوچ رہا تھا۔ پھر وہ کھنکارتا ہوا بولا۔ "شیبان! کیا تجھے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا گیا تھا کہ عورت معصیت کی جڑ ہے اور اس کے سائے تک سے حذر کرنا ہے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھ سے یہ کہا گیا تھا۔"

فلپ نے پوچھا۔ "میں پوچھتا ہوں، اس کا تجھ پر کیا اثر ہوا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عورت معصیت کی جڑ ہے لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ عورت اتنے مبالغے کی حد تک معصیت کی جڑ ہے۔"

فلپ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تو مسلمان ہے اور تو نے جس ماحول میں آنکھ کھولی ہے وہاں عورت کا یہ مطلب نہیں لیا جاتا۔"

شیبان نے بیزاری سے کہا۔ "راہبو! میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، میں چاہتا ہوں تم جلد از جلد اپنا فیصلہ سنا دو۔"

فلپ نے جواب دیا۔ "آج ہم دونوں بھائی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے لئے تیری تربیت مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اس لئے بصد افسوس ہم تجھے یہ حکم دیتے ہیں کہ آج ہی ہماری خانقاہ سے رخصت ہو جا۔"

شیبان کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھری اور غائب ہو گئی، بولا۔ "راہبو! جو فیصلہ تم نے سنایا ہے وہی میرا بھی فیصلہ ہے۔ میں نے خود بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں آج ہی اس خانقاہ سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

فلپ نے پوچھا۔ "مگر تو نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ تمہاری رہبانیت اور رہبانی تصورات اور

عقیدے بڑے ظالمانہ اور غیر انسانی ہیں اور میں کتنی ہی کوشش کر دں اتنا سفاک نہیں بن سکتا۔"
اس کے بعد ان میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ شیبان نے ان دونوں سے آخری بار مصافحہ کرنا چاہا لیکن ان دونوں نے اپنے ہاتھ دونوں ہی رکھے اور شیبان کو بالکل مایوس کر دینے کے لئے اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ شیبان کو ان دونوں سے اس بداخلاقی کی توقع نہیں تھی، وہ کچھ دیر حیرت زدہ ان دونوں کو دیکھتا رہا، اس کے بعد خانقاہ سے نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی خانقاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔

شیبان کے سامنے ایک کوئلہ پڑا ہوا تھا، کچھ سوچ کر اس نے کوئلہ اٹھالیا اور اس جگہ جا کھڑا ہوا، جہاں لکھا تھا۔

"راہبو! حذر کرو! دو جماعتوں کی قربت سے۔ ایک عورت سے، دوسرے پادریوں سے۔"

شیبان نے اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیا اور اس کے نیچے کوئلے سے لکھ دیا۔

"لوگو! حذر کرو، ایسے راہبوں سے جن کے سینوں میں محبّت کا گداز نہیں اور جن کے دل سفاکی سے لبریز ہیں۔"

اب اسے پھر کسی ایسے مرشد کی تلاش تھی، جو ظالم اور سفّاک دنیا سے نجات اس طرح دلادے کہ اس کے دل اور دماغ بھی مطمئن اور پرسکون ہو جائیں اور خدا کا قرب بھی حاصل ہو جائے۔

وہ پہاڑیوں کے دامن میں آباد لوگوں کی طرف چلا گیا اور ان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان کے علم میں کیا کوئی ایسا بزرگ موجود ہے جس کی بزرگی اور عظمت کا ان کے دلوں پر سکّہ بیٹھ چکا ہو اور بزرگ کے غیر معمولی واقعات کا ہر طرف چرچا ہو۔

اس نے ادھر ادھر گھومتے ہوئے ایک ایسی بستی کو دیکھا جس میں ایک چھوٹی سی مسجد کے پہلو میں ایک گرجا بھی تھا، مگر مسجد آباد اور گرجا ویران تھا۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا۔ "کیا اس بستی میں صرف مسلمان ہی رہتے ہیں؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "نہیں، مسیحی بھی رہتے ہیں۔"

شیبان نے پوچھا۔ "پھر گرجا ویران کیوں پڑا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "یہاں ایک مسلمان درویش کی خانقاہ ہے۔ یہ درویش اتنا صاحبِ کمال اور مقبول ہے کہ کبھی کبھی بادشاہ اور بڑے بڑے اُمرا بھی حاضری دیا کرتے ہیں ان باتوں نے مسیحیوں کو بھی متاثر کیا اور ان میں سے بیشتر مسلمان ہو گئے۔ جو مسلمان نہیں ہوتے وہ بھی اتنے مرعوب اور متاثر ہیں کہ انہیں اپنا دین حقیر اور معیوب محسوس ہوتا ہے۔"

شیبان کو جستجو ہوئی، اور وہ ان بزرگ سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ وہ رات اس نے مسجد میں گزاری، لیکن جب نمازیوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی بستی میں ایک غریب الوطن آیا ہوا ہے تو ان میں سے ایک شخص نے اسے مہمان بنا لیا اور فجر کی نماز کے بعد اسے اپنے گھر لے گیا۔

دوپہر کو کھانے کے دوران میزبان نے شیبان سے سفر کی غایت پوچھی تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ کسی بزرگِ کامل کی تلاش میں نکلا ہے۔

میزبان نے مسکرا کر پوچھا۔ "پھر کوئی بزرگ کامل ملا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "نہیں ابھی تک تو نہیں ملا لیکن میں ابھی مایوس نہیں ہوں۔"

میزبان نے خوش ہو کر کہا۔ "تب پھر تو خوش ہو جاؤ، تم اپنی منزلِ مراد کو پہنچے کیونکہ اس نواح میں ایک ایسے بزرگ موجود ہیں جن کی بزرگی اور کمال کا ایک زمانہ معترف ہے اور بڑے بڑے حکمران ان کی خانقاہ کی جبہ سائی کرتے ہیں۔ ہر وقت ان کے در پر طالبانِ مراد کا مجمع لگا رہتا ہے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "تب پھر میں بھی ان کے قدموں میں رہ پڑوں گا۔"

میزبان نے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو کل میں وہاں لے چلوں گا اور خانقاہ کی عظمت اور دبدبے کا نظارہ کراؤں گا۔"

شیبان نے وہ دن بہت اضطراب میں گزارا، اسے اپنی ماں بھی یاد آئی لیکن ماں کے خیال کو بڑی بے دردی اور سختی سے جھٹک دیا۔ وہ امراء اور حکمرانوں کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر نکلا تھا اور طمانیت اور سکون کو تلاش کرتا پھر رہا تھا، اپنے مقصد میں کامیابی کے بغیر وہ کس طرح واپس ہو سکتا تھا۔ جب اس نے اپنے میزبان سے مسلمان بزرگ کی عظمت اور بڑائی کا والہانہ ذکر سنا تو اس کے مایوس دل میں ایک بار پھر امید کی شمع روشن ہو گئی۔

دوسرے دن علی الصبح میزبان اسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا، اسے ایک بار پھر کوہستانی سلسلے کی پرپیچ راہیں طے کرنا پڑیں۔ راستہ مختلف قسم کے پھلوں اور پودوں کی ملی جلی خوشبو سے مہکا ہوا تھا، اور درختوں پر اڑنے پھدکنے والے پرندوں کی چہکار نے فضا میں ترنم گھول رکھا تھا۔ شیبان نے اپنے ساتھ اور آگے پیچھے بہت سوں کو چلتے دیکھا۔ اس نے میزبان سے پوچھا۔ "کیا یہاں کوئی اور بزرگ بھی رہتے ہیں؟"

"نہیں تو، مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

شیبان نے کہا۔ "پھر یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟ کیا انہی بزرگ کے پاس؟"

میزبان ہنسنے لگا اور اس کے حلق سے ایسی آواز نکلی جیسے پانی انڈیلتے وقت صراحی سے نکلتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "تم بہت عقلمند نوجوان ہو، تم نے صحیح اندازہ لگایا، یہ سب وہی، انہی بزرگ کی خدمت میں جارہے ہیں، کیا تم ان کے ہاتھوں اور کاندھوں پر سامان کی پوٹلیاں اور گٹھریاں نہیں دیکھ رہے ہو؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "دیکھ تو میں بھی رہا ہوں، لیکن ان پوٹلیوں اور گٹھریوں میں کیا ہے؟"

میزبان نے کہا۔ "ان بزرگ کے چار سو مرید ہر وقت ان کے پاس رہتے ہیں اور وہ سب عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے ہیں ان حالات میں پیر و مرشد اپنے چار سو مریدوں سمیت ذکرِ حق میں مشغول رہنے کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکتے اس لئے ہم سب نے ان کے کھانے پینے کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے اور صبح و شام ان کے اور ان کے مریدوں کے لئے کھانے پینے کا سامان پہنچاتے رہتے ہیں تاکہ وہ سب یکسوئی سے ذکرِ حق میں مشغول رہیں۔"

شیبان کے دل میں ان بزرگ کے خلاف ذرا سی سوءظنی آگئی اس نے سوچا دوسروں کی محنت اور کمائی پر زندہ رہنے والا انسان ولی یا بزرگ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

ان بزرگ کی خانقاہ جبلِ لبنان کی ایک حسین وادی میں تھی۔ اس وادی کے اوپر حدِ نظر کوہستانی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہاں انجیر، سیب، انگور اور زیتون کے درختوں کی بھرمار تھی، انہی کے بیچ میں ان بزرگ کی خانقاہ تھی اور خانقاہ کا سبز گنبد درختوں کے اوپر دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ میزبان نے اس گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مبارک کہ خانقاہ کا سبز گنبد صاف نظر آنے لگا۔"

شیبان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ معلوم نہیں کن خیالوں میں گھرا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد یہ دونوں خانقاہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ یہ وسیع، طویل و عریض خانقاہ کسی قصر کی طرح کھڑی تھی۔ خانقاہ ایک چہار دیواری کے اندر تھی اور یہ چہار دیواری ہزار بارہ سو مربع گز میں پھیلی ہوئی تھی جب یہ دونوں خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو انہیں دروازے پر ہی روک لیا گیا، یہاں کچھ اور لوگ بھی پہلے سے کھڑے ہوئے تھے۔ شیبان نے چہار دیواری میں جھانک کر دیکھا، وہاں بہت سے گھوڑے سبزے پر چر رہے تھے اور گھوڑوں کے آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔

شیبان کے میزبان نے خانقاہ کے دربانوں سے کہا۔ "لوگو! کیا بات ہے؟ آج سے پہلے تو یہاں کسی نے روکا نہیں تھا، پھر یہ آج تم لوگ کیوں روک رہے ہو؟"

ایک شخص نے جواب دیا۔ "اندر حلب کا حکمران آیا ہوا ہے، حکمران کے ساتھ اس کے درباری اور بعض دوسرے عہدیدار بھی ہیں، اس لئے پیر و مرشد نے کچھ دیر کے لئے لوگوں کی آمد و رفت روک دی ہے۔"

شیبان نے ضد کے انداز میں کہا۔ "لیکن میں تو اسی وقت ان کے پاس جانا چاہتا ہوں، تم پیر و مرشد سے جاکر کہہ دو کہ ہم دونوں بھی ان سے عقیدت و احترام سے ملنے آئے ہیں اس لئے ہمارا راستہ نہ روکیں۔"

دربان نے تولنے والی نظر سے شیبان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم کہاں سے آئے ہو اور کیا کرتے ہو؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں بعلبک سے آیا ہوں اور وہاں میرا حکم چلتا ہے۔"

دربان نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ "تو گویا تم بعلبک کے امیر ہو؟"

شیبان، دربان کے تجسس اور تبدیلی سے مزے لے رہا تھا۔ جواب دیا۔ "ہاں میں بعلبک کا امیر ہوں اور اگر میں تیرے ولی سے متاثر اور مرعوب ہو گیا تو ان کی خانقاہ کے لئے مستقل نذرانہ مقرر کر دوں گا۔"

اس جواب نے میزبان کو بھی چوکنا کر دیا۔ جب دربان اندر چلا گیا تو میزبان نے شیبان سے متحیر لہجے میں سوال کیا۔ "میرے دوست! کیا واقعی بعلبک کے امیر ہو؟"

شیبان نے جواب دیا نہیں، لیکن میں نے یہ دروغ مصلحت آمیز قصداً بولا ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ بزرگ واقعی امیر اور غریب میں تخصیص کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہوا تو میں ان کی صحبت سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

میزبان کو شیبان کی بات بری لگی، بولا۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری باتیں بزرگ موصوف کے دل پر القا ہو چکی ہوں گی؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے، اگر ایسا ہوا تو میں ان کے قدموں میں رہ پڑوں گا اور اس وقت تک پڑا رہوں گا جب تک خود بھی کسی لائق نہ ہو جاؤں۔"

میزبان خاموش ہو گیا لیکن اسے شیبان کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں اسے افسوس تھا کہ شیبان ایک ایسے بزرگ اور ولی کامل کے خلاف سوء ظنی میں مبتلا ہو گیا تھا، جس کا دُور دُور شہرہ تھا اور اس کے در پر حاضری دینے میں بڑے بڑے حکمران اور امراء تک خوش قسمتی اور سعادت سمجھتے تھے۔

دربان نے واپس آکر ان دونوں کو مطلع کیا کہ پیر و مرشد سے فوراً ہی ملاقات مشکل

ہے، ذرا توقف کرنا پڑے گا۔ وہ ان دونوں کو خانقاہ میں لئے چلا گیا۔ خانقاہ ایک گوشے میں بنی ہوئی تھی۔ خانقاہ سے متصل بہت سارے حجرے تھے جن میں اس بزرگ کے مرید رہتے تھے۔ خانقاہ اور حجروں کے سامنے ایک میدان تھا، جس میں آٹھ دس گھوڑے اپنے سائیسوں کی معیّت میں کھڑے گھاس کھا رہے تھے۔ ان کی دمیں حرکت میں تھیں اور وہ بار بار جھرجھری لے رہے تھے۔ یہ دونوں، دربان کے ساتھ خانقاہ میں داخل ہو گئے۔ اس وقت پیر و مرشد حلب کے امیر سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک نگاہِ غلط انداز شیبان اور اس کے میزبان پر بھی نظر ڈالی لیکن ان دونوں سے مخاطب نہیں ہوئے۔

جب حلب کا حاکم اپنے ملازمین اور مصاحبین کے ساتھ رخصت کی اجازت لے کر کھڑا ہوا تو ان کے ساتھ ہی مرشد بھی کھڑے ہو گئے اور حاکم سے کہا۔ "یہ فقیر تیرے حق میں دعائے خیر کرتا رہے گا لیکن تیرا بھی یہ فرض ہے کہ تو ان کا خیال رکھ جنہوں نے دنیا کو لات مار دی ہے اور شب و روز اپنے رب کی بارگاہ میں اس کی مخلوق کے لئے امن و سلامتی کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔"

حلب کے حاکم نے پوچھا۔ "اس خانقاہ کا یومیہ خرچ کتنا ہے؟"

ولی نے جواب دیا۔ "یہی کوئی پچاس دینار یومیہ۔"

حاکم نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا۔ "شاہ صاحب کو دیناروں کی دس تھیلیاں دے دی جائیں۔" اس کے بعد شاہ صاحب سے کہا۔ "یہ کم ہیں لیکن حلب جا کر خانقاہ کا مستقل انتظام کر دیا جائے گا۔"

ولی نے جواب دیا۔ "بابا میں یہ دیناروں کی تھیلیاں دیلیاں تو قبول کرنے سے رہا اور اگر انہیں ہمارے سر زبردستی تھوپا گیا تو میں اس حرکت کو کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔"

ایک مرید نے ان تھیلیوں کو اپنے قبضے میں لے لیا، بولا۔ "واہ حضرت! یہ خوب رہی آپ نہ لیں لیکن ہم ضرور لیں گے یہ امیر جو کچھ ہمیں دے رہا ہے، خدا نے ہمارا رزق اس کے ذریعے بھجوایا ہے کیونکہ وہ سمیع و بصیر ہے اور ہمارا حال سن بھی رہا ہے اور دیکھ بھی رہا ہے، اب اگر ہم حاکمِ حلب سے یہ تھیلیاں نہیں لیں گے تو کفرانِ نعمت کے مرتکب ٹھہریں گے۔"

ولی نے جواب دیا۔ "بہرحال یہ تھیلیاں میں خود تو قبول کرنے سے رہا، تو لیتا ہے تو لے لے اور خبردار جو ان دیناروں کو مجھ پر یا اپنی ذات پر خرچ کیا۔ انہیں ان فقراء میں تقسیم کر دے جو خدا کے لئے دنیا کو چھوڑ چکے ہیں۔"

حاکمِ حلب نے عرض کیا۔ "حضرت! مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔"

ولی نے جواب دیا۔ "جب تو خانقاہ سے باہر نکلے گا تو اس کی پیشانی پر میری نصیحت کو کندہ دیکھے گا، بس اس نصیحت کو جزو جاں بنا لے۔"
حاکم حلب نے عاجزی سے درخواست کی۔ "حضرت! وہ نصیحت تو بعد میں دیکھوں گا، کچھ زبانی بھی ارشاد فرما دیجئے یہ عاجز بہت احسان مند ہو گا۔"
ولی نے نہایت استغنا سے جواب دیا۔ "اب تو بضد ہی ہے تو میری نصیحت دل پر کندہ کر لے۔ یاد رکھ، انسان کے حق میں محنت، آرام سے بہتر، گمنامی، نام و نشان سے بہتر اور داد و دہش، قبول عطیات سے بہتر ہے۔"
پوری خانقاہ واہ وا، سبحان اللہ، کی آوازوں سے گونج گئی۔ حاکم حلب نے فرط عقیدت سے ولی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے دونوں آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا اور اپنے مصاحبوں اور غلاموں کے ساتھ خانقاہ سے نکل گیا۔ ولی نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں، گویا وہ مراقبے میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اپنے ہوش میں آیا تو اس نے اپنے مریدوں سے پوچھا۔
"کیا اب میں آرام کر سکتا ہوں، میں بہت تھک چکا ہوں۔"
ایک مرید نے شیبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا۔ "حضرت! یہ شخص بعلبک سے آیا ہے اور خود کو بعلبک کا امیر کہتا ہے۔"
ولی نے شیبان اور اس کے میزبان پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور سوال کیا۔ "تو واقعی بعلبک کا امیر ہے؟"
شیبان نے جواب دیا۔ "ہاں میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔"
ولی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "پچھلے دنوں اسی خانقاہ میں بعلبک کا ایک امیر آچکا ہے، اس نے خانقاہ کو گراں قدر عطیہ بھی دیا ہے اگر تم بعلبک کے امیر ہو تو پھر وہ کون تھا؟"
شیبان گھبرا رہا تھا، بولا۔ "وہ بعلبک کا امیر ہی ہو گا، لیکن اس وقت میں تم سے چند اہم باتیں کرنے آیا ہوں۔"
ولی نے طیش میں کہا۔ "یہ تو کس لب و لہجے میں بات کر رہا ہے؟"
میزبان نے شیبان کا ہاتھ دبایا لیکن شیبان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، بولا۔ "جناب پیر و مرشد! آپ نے حاکم حلب کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں، اس سلسلے میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"
ایک طاقتور مرید نے شیبان کا گلا پکڑ لیا، بولا۔ "شیطان کے بچے! پیر و مرشد جب

تجھے ہم کلامی کے شرف سے محروم رکھنا چاہتے ہیں تو تو ان سے خواہ مخواہ کیوں الجھ رہا ہے؟

شیبان کی سانس رکنے لگی اور اسے کھانسی آ گئی، بمشکل بولا۔ "میں دنیا کے ظلم و ستم سے بیزار اور آلامِ حیات سے گریزاں شخص ہوں اور روحانیت میں طمانیت اور سکون تلاش کر رہا ہوں، اب اگر میں یہاں سے بھی مایوس اور ناکام رہا تو یہی سمجھوں گا کہ اپنی مادی دنیا کی طرح فقراء کی دنیا بھی پُر فریب اور ریاکاروں کی ہے۔"

ولی نے پوچھا۔ "تو کیا چاہتا ہے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں طمانیت چاہتا ہوں، میں سکون چاہتا ہوں، اگر اس خانقاہ میں یہ چیزیں ہیں تو مجھے مرحمت فرمائی جائیں، ورنہ میں کہیں اور کی راہ لوں گا۔"

ولی نے بے نیازی سے کہا۔ "اگر تو پسند کرے تو اس خانقاہ کے حجرے میں تجھے بھی رکھا جا سکتا ہے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "اس عنایت کا شکریہ، لیکن قیام سے پہلے میں چند باتوں کی وضاحت چاہتا ہوں۔"

ولی نے ناگواری سے شیبان کو گھورا، کہا۔ "کیا بات ہے؟ تو بڑا تجسّسی انسان معلوم ہوتا ہے!"

شیبان نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! میں تجسّسی انسان نہیں ہوں، مگر جیسا کہ ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں، میں اپنا گھر بار چھوڑ کر طمانیت اور سکون کی تلاش میں نکلا ہوں، میں نے ابھی ابھی آپ کی صحبت میں جو چند لمحے گزارے ہیں، ان میں چند باتیں کانٹے کی طرح دل میں چبھ گئی ہیں، اب اگر آپ نے ان کی وضاحت نہ فرمائی تو میں بہت پریشان رہوں گا۔"

ولی نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "تو بات کر، میں تجھے مطمئن کر دوں گا، تو زیادہ فکرمند نہ ہو۔"

شیبان نے عرض کیا۔ "پیر و مرشد! براہ کرم وہ نصیحت ایک بار پھر ارشاد فرما دیجئے جو ابھی ابھی آپ نے حاکم حلب کو فرمائی تھی۔"

ولی نے جواب دیا۔ "شاید تجھے میری نصیحت بہت اچھی لگی ہے اور تیرے دل میں اتر گئی ہے۔" اس کے بعد مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "اے شخص! میری اس نصیحت کو تو بھی اپنے دل پر کندہ کر لے۔ یاد رکھ! انسان کے حق میں محنت آرام سے بہتر، گمنامی، نام و نشان سے بہتر اور داد و دہش، قبولِ عطیات سے بہتر ہے۔"

اور ایک بار پھر خانقاہ کی فضا داد و تحسین کی آوازوں سے گونجنے لگی لیکن ان میں

شیبان کی آواز نہیں شامل تھی۔

شیبان کی خاموشی ولی کو بہت ناگوار گزری، درشت لہجے میں پوچھا۔" تو کیوں خاموش ہے؟ کیا میری نصیحت تیری سمجھ میں نہیں آئی؟"

شیبان نے آہستہ سے جواب دیا۔" نہیں یہ بات نہیں ہے پیرو مرشد! میں آپ کی نصیحت اور آپ کی عمل میں جو فرق محسوس کر رہا ہوں، اس نے مجھے حیرت زدہ کر کے میری زبان کو تالا لگا دیا ہے۔"

ولی نے ڈانٹ کر پوچھا۔" آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے اے ملعون اور خبیث انسان؟"

شیبان نے جواب دیا۔" میں کچھ کہنا نہیں بلکہ کچھ جاننا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا ہے کہ انسان کے حق میں محنت آرام سے بہتر ہے لیکن عالم یہ ہے کہ اپنے مریدوں کے ساتھ ہی آپ بھی کچھ نہیں کرتے۔ بس آرام ہی آرام ہے جو آپ اپنے مریدوں کے ساتھ فرماتے رہتے ہیں۔"

مریدوں میں کھلبلی مچ گئی، میزبان نے گھبرا کر شیبان کو وہیں چھوڑ دیا اور خود خانقاہ سے باہر آ گیا۔ ولی نے شیبان کو غضبناک نظروں سے دیکھا، جواب دیا۔" تو کہتا ہے کہ ہم محنت نہیں کرتے، آرام کرتے ہیں، خدا تیرے دل پر ہمیشہ مہر لگائے رکھے، او بدبخت نوجوان! یہ تو نے کیا کہہ دیا، میں اور میرے مرید دن رات اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں، کیا یہ محنت نہیں ہے؟ بخدا یہ ایسی محنت ہے کہ بڑے بڑوں کا اس محنت کے خیال سے پتّہ پانی ہو جاتا ہے۔"

شیبان نے کہا۔" لیکن میں اسے محنت نہیں سمجھتا، اسی طرح آپ کی نصیحت کا دوسرا جزو کہ گمنامی، نام و نشان سے بہتر ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا، آپ اور آپ کے مرید بالکل گمنام نہیں، ہر طرف آپ ہی کا نام و نشان بکھرا ہوا ہے۔"

ولی نے جوشِ غضب میں آواز دی۔" ارے کوئی ہے جو اس گستاخ کی زبان بند کر دے؟"

کئی طاقتور مریدوں نے شیبان کو پکڑ لیا لیکن شیبان کی زبان نہیں رکی، اس نے کہا۔" پیرو مرشد! آپ مجھے خانقاہ سے نکلوا سکتے ہیں لیکن میرے شبہات کا علاج نہیں کر سکتے۔ کیا آپ کے پاس میرے اعتراضات اور شبہات کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے اگر میں یہاں بھی مایوس رہا تو مجبوراً اپنی جبر و تعدی کی دنیا میں واپس چلا جاؤں گا اور اس کے بعد میں جو کچھ بھی کروں گا، اس کا گناہ آپ کے نام بھی لکھا جائے گا کیونکہ آپ مجھے صحیح راہ دکھانے میں ناکام رہے ہیں۔"

ولی کا غصّہ قدرے کم ہوا، بولا۔" اے شخص بات صرف اتنی نہیں ہے کہ میں تجھے

مطمئن نہیں کر پا رہا ہوں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تو سب کے سامنے ایسے خیالات کا اظہار کر رہا ہے جو میرے نیک دل اور پاک مزاج مریدوں میں انتشار اور خلفشار پیدا کر سکتے ہیں، کیا تو نہیں جانتا کہ شیطان اسی طرح انسانی قلوب میں جگہ بناتا ہے۔"

شیبان نے عرض کیا۔" تب پھر آپ کچھ دیر کے لئے اپنے مریدوں کو اِدھر اُدھر کر دیجئے تاکہ میں اپنے دل کے وسوسوں اور اندیشوں کو دور کر سکوں اور اپنی پوری زندگی آپ کے قدموں میں بسر کر دوں۔"

ولی نے اپنے مریدوں کو اشارہ کیا کہ وہ شیبان کو چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے باہر چلے جائیں۔

مرید باہر چلے گئے۔ جب وہاں ولی اور شیبان تنہا رہ گئے تو ولی نے کہا۔" ہاں میرے بچے اب پوچھ تو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

شیبان نے عرض کیا۔" یا پیر و مرشد! میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہ کہاں تک زیب دیتا ہے کہ کسی ایسی بات کی اپنے مریدوں کو نصیحت کریں جس پر آپ خود کاربند نہیں ہیں۔ کیا ایسا کرنا مضحکہ خیز نہیں ہے؟"

ولی کو اس بات پر غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط و تحمل سے کام لیا اور مسکرا کر کہا۔ بس یا کچھ اور بھی کہنا ہے؟"

شیبان نے جواب دیا۔" آپ نے اپنی نصیحت کے تیسرے جزو میں فرمایا ہے کہ داد و دہش قبولِ عطیات سے بہتر ہے لیکن یہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ اس خانقاہ میں کسی کو دینے کیلئے کچھ بھی نہیں، قبولِ عطیات کے لئے پورا ماحول ساز گار ہے۔ آخر یہ کیوں ہے؟"

ولی نے کہا۔" میں کسی کے بھی عطیات قبول نہیں کرتا۔"

شیبان نے عرض کیا۔" ابھی تھوڑی دیر پہلے حاکمِ حلب نے جو کچھ دیا تھا، اسے تو قبول کر لیا گیا۔"

ولی نے جواب دیا۔" بیشک، لیکن تو نے یہ بھی دیکھا کہ اسے میں نے قبول نہیں کیا کہ ان دیناروں کو میرے فقرا آپس میں تقسیم کر لیں گے، میں اس لعنت سے بری الذّمہ ہوں۔"

شیبان نے عرض کیا۔ اگر وہ دینار آپ کے بقول لعنت ہی ہیں تو اس لعنت کو اپنے مریدوں میں کیوں جانے دیتے ہیں؟"

ولی کو غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن شیبان نے اسے بے بس اور لاجواب کر دیا تھا۔ آخر اس نے بڑی نرمی سے سمجھایا۔ میرے بچے! تیرے دل میں خنّاس نے گھر کر لیا ہے۔ میں نے تیرا مرض پکڑ لیا۔"

شیبان نے کہا۔" یا پیر و مرشد! میں آپ کی باتیں اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک

آپ اس کی وضاحت بھی نہ کرتے چلیں؟"

ولی نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ "میرے بچے! خناس ایک شیطان کا نام ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔ صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ ہر دل میں دو دروازے ہوتے ہیں، ایک اوپر، دوسرا نیچے، اوپر کا دروازہ جسم سے متصل ہوتا ہے اور نیچے کا وہ ہے۔ خناس کا کام یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں دروازوں کے ارد گرد مکڑی کا جالا بُن دیتا ہے تاکہ انسان اس کے قابو میں آجائے۔ پھر خطرات و وساوس باطلہ کو دل میں پھونکتا رہتا ہے۔ خناس کی صورت اژدہے جیسی ہوتی ہے اور اس کی دم پر زہریلے کانٹے ہوتے ہیں اور ان ہی زہریلے کانٹوں سے وہ دل کو مسموم کرتا رہتا ہے جس سے دل سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔"

شیبان کے لئے یہ انکشافات عجیب تھے وہ حیرت سے ولی کی تقریر سنتا رہا۔ ولی دل میں خوش تھا کہ اس نے شیبان کو اپنی تقریر سے متاثر اور لاجواب کر دیا ہے۔ اس نے رہا سہا زور بھی لگا دیا اور کہا۔ "اور جب انسان طعام ناجائز اور لقمہ مشکوک کھاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی غفلت بھی اختیار کرتا ہے اور کاہلی، بے توجہی اور بے رغبتی سے عبادت کرتا ہے تو یہ چیزیں خناس کے لئے غذا کا کام کرتی ہے اور ان سے خناس فربہ ہوتا ہے جس سے اس کی ضرر رسانی بڑھ جاتی ہے۔"

شیبان نے خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اور اس خناس کو ہلاک کس طرح کیا جا سکتا ہے؟"

ولی نے جواب دیا۔ "توبہ و استغفار، پاس انفاس، ذکر و فکر اور مراقبے سے خناس کو سخت نقصان پہنچتا ہے جس سے یہ کمزور ہونے لگتا ہے، دل میں صفائی اور نورانیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ حبس دم کی حرارت سے دل کی چربی پگھلنے لگتی ہے جس سے خناس مضمحل اور کمزور ہوتا ہے اور بالآخر جب تصفیہ قلب ہوتا ہے تو خناس ہلاک ہو جاتا ہے۔"

شیبان خاموش ہو گیا اور بے بسی سے ولی کی صورت دیکھنے لگا۔ ولی کو یہ خوش فہمی ہوئی کہ شیبان پر اس کا جادو چل چکا ہے اور اب وہ سرکشی نہیں اختیار کرے گا، اس لئے اس نے دل رکھنے کے لئے کہا۔ "میرے بچے! تو فکر نہ کر اور ملول نہ ہو، میں تجھے اپنے مریدان باصفا کے سپرد کرتا ہوں۔ تو ان کے ساتھ رہ، اللہ نے چاہا تو میں تیرے دل میں تیرے دل میں موجود خناس کو بہت جلد ہی ہلاک کر دوں گا۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! جس خناس کی آپ بات کر رہے ہیں، وہ

میرے دل میں نہیں ہے، ہاں آپ کے اور آپ کے مُریدانِ باصفا کے دلوں میں ضرور پرورش پا کر فربہ ہوگیا ہے، اس لئے میرا مشورہ ہے کہ پہلے آپ اسے ہلاک کریں، اس کے بعد دوسروں پر توجہ دیں۔ رہا میں، تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ درویش کی زندگی شاید مجھے نہیں راس آئے گی اس لئے میں اپنے گھر چلا جاؤں گا اور دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح زندگی گزار دوں گا۔"

ولی ایک دم برہم ہوگیا، چیخ کر حکم دیا۔ "ارے کوئی ہے جو اس گستاخ کو اٹھا کر باہر پھینک دے، یہ نہیں ٹھیک ہو سکتا اس کا مرض لاعلاج ہے۔"

ولی کی آواز سن کر کئی مرید اندر داخل ہوتے اور انہوں نے شیبان کو دبوچ لیا کسی نے سر پکڑا، کسی نے ٹانگیں، کسی نے ہاتھ اور کسی نے پشت اور اس طرح اسے اٹھاتے ہوئے وہ خانقاہ کے باہر نکل گئے اور اسے چھوٹی سی پگڈنڈی پر پھینک کر اندر چلے گئے۔ یہاں میزبان کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میزبان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ شیبان کے پاس گیا اور پوچھا۔ "خیریت تو ہے دوست! تیرے ساتھ یہ کیا سلوک ہوا؟"

شیبان کی کمر میں بڑی چوٹ آئی تھی، وہ بیٹھ کر کراہنے لگا، بولا۔ "دوست جو شہروں میں ہے، وہی خانقاہوں میں، جو بادشاہوں اور حکمرانوں کے دربار اور انتظام میں ہو رہا ہے، وہی خانقاہوں، ولیوں اور مرشدوں کی مجلسوں میں ہو رہا ہے۔ سچ نہ تو درباروں میں ہے نہ خانقاہوں میں۔ پھر میرا جیسا انسان کہاں جائے۔"

میزبان نے ترش روئی سے کہا۔ "افسوس کہ تیری باتوں نے پیر و مرشد کے دل سے اعتبار بھی اٹھا دیا ہوگا، جسے تو خوش فہمی اور خود فریبی سے سچ کہہ رہا ہے وہ تیرے دل کا فتور ہے، فتنہ ہے۔"

میزبان نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا، شیبان ایک بار پھر یکہ و تنہا رہ گیا وہ خانقاہ کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟

شیبان اُلجھ کر رہ گیا، گھر واپس جانے کو جی نہ چاہتا تھا اور درویشی میں جو کچھ دیکھا تھا اس سے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ بڑے غور و فکر کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جس راہ پر درویش نہیں چل رہے ہیں، وہ خود چل کر دکھا دے گا۔ وہ تزکیۂ نفس اور شدید مجاہدے سے وہ طمانیت اور سکون خود حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جس کی تلاش میں اس نے راہبوں، مجوسیوں اور درویشوں کی خانقاہوں کی جبہ سائی کی ہے۔

یہ بہت بڑا فیصلہ تھا، اس فیصلے میں دنیا کی نفی شامل تھی اور اس نفی پر اس کی درویشی کی اساس قائم تھی۔ اس نے پورے یقین اور اعتماد سے یہ طے کر لیا تھا کہ ولی کی نصیحت پر عمل کر کے درویشی میں اعلیٰ مقام حاصل کر کے دکھا دے گا۔

اس نے جبلِ لبنان میں خوب گھوم پھر کر اپنے لئے ایک ایسی جگہ پسند کر لی، جو اب تک غیر آباد تھی اور آبادی ذرا فاصلے پر تھی، اس نے یہیں اپنی کٹیا ڈال لی، دیواریں سرکی کی کھڑی کیں اس نے یہ کٹیا ایک ایسے گھنیرے درخت کے نیچے بنائی تھی کہ چھت کا کام درخت کے سائبان سے لیا جائے۔ اس نے اپنی روزی کے لئے یہ طے کیا کہ قریب کے کسی باغ میں محنت مزدوری کر لیا کرے گا اور اس سے جو کچھ مل جائے گا اس سے اپنا کام چلائے گا۔

اس نے لکڑی کے ایک تختے پر کوئلے سے موٹا موٹا لکھا۔

"انسان کے حق میں محنت آرام سے بہتر، گمنامی، نام و نشان سے بہتر اور داد و دہش، قبولِ عطیات سے بہتر ہے۔"

وہ ہر روز صبح روزی کی تلاش میں نکل جاتا اور کسی کھیت یا باغ میں کام کر کے جو کچھ پاتا، اس سے اپنا پیٹ بھرتا۔ وہ ہر وقت اس فکر اور کوشش میں رہتا کہ کوئی حرام کا لقمہ حلق سے نہ اترے۔ کچھ ہی عرصے بعد اس نے اپنے سرکی کے حجرے پر چھت بھی ڈلوالی اور یکسوئی اور بے نیازی سے اللہ اللہ کرنے لگا۔ اس کے زہد و ریاضت کا چرچا ہونے لگا اور عقیدت مندوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اب شیبان کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ ہر عقیدت مند کو یہی سمجھاتا کہ اسے شہرت اور نمود سے نفرت ہے اس لئے وہ کسی کو نہ تو مرید بنائے گا اور نہ ہی اپنے آس پاس ٹھہرنے کی اجازت دے گا۔ شروع شروع میں تو اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کے عقیدت مند اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے رہے لیکن پھر انہوں نے شیبان کی ڈانٹ پھٹکار کی پرواکئے بغیر اس کے دروازے پر میلہ سا لگانا شروع کر دیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان سے پیچھا کس طرح چھڑائے وہ گمنامی، جسے وہ عزیز رکھتا تھا، اس سے چھن چکی تھی اور اس کا نام و نشان جبلِ لبنان کو پھلانگ کر دمشق تک پہنچ چکا تھا اور قصرِ خلافت اس کے شہرے سے گونجنے لگا تھا۔

اس کے پاس جو بھی آتا کچھ نہ کچھ نذرانہ ضرور لاتا لیکن یہ کچھ بھی قبول نہ کرتا اور یہی کوشش کرتا کہ ہر آنے والے کو اپنے پاس سے کچھ نہ کچھ دے دے، مگر کسی

سے کچھ قبول نہ کرے۔ اگر پاس کچھ نہ ہوتا تو کوئی پھل ہی دے دیتا۔ چنانچہ پانچ سال کے اندر ہی اس کا اتنا شہرہ ہو گیا کہ اس سے پہلے کے فقرا اور درویشوں کے کاروبار پر بہت بڑا اثر پڑا۔ وہ دُور دُور تک ایک بے غرض درویش کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔

ایک دن، سہ پہر کو اس کے پاس چند گھڑ سوار آئے اور انہوں نے شیبان کو مطلع کیا کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک آپ کی زیارت کو حاضر ہونے والا ہے۔

شیبان نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "تم لوگ خلیفہ سے جا کر کہہ دو کہ وہ میری زیارت کو ہرگز نہ آئے کیونکہ میں حکمرانوں سے حذر کرتا ہوں۔"

ایک گھڑ سوار نے کہا۔ "پیر و مرشد! ہماری اتنی مجال کہاں کہ یہی بات امیرالمومنین سے کہہ سکیں۔ وہ آئیں گے اور ضرور آئیں گے، اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ امیرالمومنین کو ناراض نہ کیجئے وہ آپ کی یہ سرکیوں کی کٹیا، شاندار خانقاہ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ بس آپ کا ذرا سا اشارہ کافی ہوگا۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "مجھے اپنی یہ سرکیوں کی کٹیا بہت عزیز ہے، وسیع و عریض سنگی خانقاہ پر قصر کا گمان ہونے لگتا ہے اور فقراء کو قصر راس نہیں آتے۔"

دوسرے گھڑ سوار نے درشت لہجے میں کہا۔ "یہ کیسا درویش ہے جو امیرالمومنین سے کترا رہا ہے، حالانکہ اسے یہ بات معلوم ہونی چاہیئے کہ یہ جس جگہ کٹیا ڈالے بیٹھا ہے۔ امیرالمومنین ہی کی زمین ہے، امیرالمومنین کی زمین پر بیٹھ کر امیرالمومنین سے ہی حذر کرنا دماغی فتور نہیں تو اور کیا ہے۔"

شیبان کو غصہ تو بہت آتا لیکن وہ تزکیۂ نفس اور مجاہدے سے غصّے کو دبا چکا تھا چنانچہ اس وقت بھی صبر و ضبط سے کام لیا اور نرمی سے جواب دیا۔ "اے شخص تو نے یہ کس طرح کہہ دیا کہ یہ زمین امیرالمومنین کی ہے، زمین تو اللہ کی ہے۔ امیرالمومنین یہ زمین کہاں سے لاتے تھے؟"

گھڑ سوار جب واپس جانے لگے تو اس نے پھلوں سے ان کی ضیافت کی اور ایک بار پھر انہیں منع کیا کہ وہ امیرالمومنین کو یہاں نہ آنے دیں۔ ان معمولی گھڑ سواروں کو اتنا اختیار کہاں تھا کہ وہ ہشام بن عبدالملک کو شیبان کا صحیح جواب پہنچا دیں لیکن ایک نے ہمّت کی اور خلیفہ کو شیبان کا جواب پہنچا دیا۔ ہشام کے چہرے کا رنگ بدل گیا، بولا۔ "اس درویش کی اتنی ہمّت کہ امیرالمومنین کو ٹھکرا دے۔ میں اس سے سمجھوں گا۔"

ہشام نے دوسرے ہی دن شیبان کے پاس جانے کا منصوبہ بنا لیا۔
دمشق سے جبل لبنان میں داخل ہونے والی شاہراہ، جو شیبان کی کٹیا سے ذرا دور ایک اور ہی طرف جبی جاتی تھی، ہشام بن عبدالملک اور اس کی سپاہ کے گھوڑوں سے روندی جا رہی تھی، کچی راہوں سے اٹھنے والے گرد و غبار کے بگولے آسمان کی طرف محوِ پرواز تھے جس سے میلوں دور یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کوئی غیر معمولی شخصیت اپنے حشم و خدم کے ساتھ حالتِ کوچ میں ہے۔ شیبان نے بھی اس گرد و غبار کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ہشام بن عبدالملک اس سے ملنے کے لئے بڑھا چلا آ رہا ہے۔ پہلے تو اس کو ذرا خوف سا محسوس ہوا، پھر ہمت کر کے اپنی جگہ اور اپنے موقف پر اڑا رہا، بجائے اس کے کہ وہ خلیفہ کا احترام کرتا اس سے خود کو گریزاں محسوس کرنے لگا۔ وہ خلیفہ کی آمد سے پہلے اپنی کٹیا سے ٹل جانا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر باز رہا کہ خلیفہ سے کیوں ڈرا جائے ہر بات صاف صاف، بے جھجک، دلیری سے اس کے روبرو کر لی جاتے تو بہتر ہے۔
اس کے مداحوں اور عقیدت مندوں نے مبارک باد دی کہ خدا نے شیبان کی عبادت اور ریاضت کو قبول کیا اور دنیا کے سب سے بڑے حکمران کو اس کی خدمت میں حاضری پر مجبور کر دیا۔ ان میں سے بعض نے یہ مشورہ بھی دیا کہ جب امیر المومنین اپنی ارادت اور عقیدت کا اظہار کریں تو شیبان ان سے کہے کہ اس کی کٹیا کو شاندار خانقاہ میں بدل دیا جائے لیکن شیبان کو یہ ساری باتیں بے معنی اور فضول لگ رہی تھیں۔
ہشام کا ہراول دستہ پہلے ہی آ گیا اور اس نے شیبان کو مطلع کیا کہ تھوڑی دیر بعد ہی امیر المومنین قدم رنجہ فرمانے والے ہیں۔ شیبان نے بے زاری سے کہا۔ "لیکن میں امیر المومنین سے بخوشی نہیں مجبوراً ملوں گا اور یہ بات میں نے امیر المومنین کے ان آدمیوں کو پہلے ہی بتا دی تھی، جو چند دن پہلے امیر المومنین کی آمد کی اطلاع دینے آئے تھے۔"
خلیفہ کے نمائندے نے شیبان کو ڈرانے کی کوشش کی، بولا۔ "امیر المومنین کی درشت مزاجی مشہور ہے وہ جس شخص پر ناراض ہوتے ہیں، اسے سزا ضرور دیتے ہیں، اس لئے امیر المومنین کے سامنے ادب اور احترام کا خاص خیال رکھنے گا۔"
شیبان نے کوئی جواب نہ دیا۔
کچھ دیر بعد ہشام بھی وہیں پہنچ گیا، شیبان کے مداح اور ارادت مند ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ہشام کے آدمیوں نے کٹیا کے سامنے اور آس پاس گھوڑے چھوڑ دیئے جنہیں ان کے سائیسوں اور دوسرے خدمتگاروں نے سنبھال لیا۔ ہشام کے ساتھ اس کا

حاجب غالب قاضی محمد بن صفوان اور کاتب سالم بیش بیش تھے۔ کٹیا میں داخلے سے پہلے ہشام اور اس کے ساتھیوں کی نظر اس قول پر پڑی جس میں محنت کو آرام سے، گمنامی کو نام و نشان سے اور داد و دہش کو قبولِ عطیات سے بہتر بتایا گیا تھا۔ ہشام نے اپنے حاجب سے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے۔ کیا یہ صوفی اپنے ان اقوال پر پورا اتر رہا ہو گا؟"

حاجب نے قدرے پس و پیش سے جواب دیا۔ "بظاہر تو ایسا مشکل نظر آتا ہے، کیونکہ صوفی محنت نہیں کرتا، رہی گمنامی اور شہرت تو اس کے پاس شہرت تو ہے مگر گمنامی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ ہم اس کی شہرت ہی سن کر یہاں تک آتے ہیں رہا قول کا تیسرا جزو کہ داد و دہش، قبولِ عطیات سے بہتر ہے، تو اس کا بھی تجربہ ہو جائے گا لیکن فی الحال میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ صوفی کے پاس دینے کے لئے ہوتا ہی کیا ہو گا، ہاں لینے کے لئے امکان ہی امکان مل جائیں گے۔"

ہشام نے مسکرا کر خوشی کا اظہار کیا۔ بولا۔ "غالب! تو درست کہتا ہے، تیری توجیہہ کا در دلائل عقل کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔"

ہشام کچھ دیر تک کٹیا کے باہر کھڑا اس بات کا منتظر رہا کہ شیبان کٹیا سے نکل کر اس کا استقبال کرے گا لیکن اس میں اسے مایوسی ہوئی، اس میں اپنے حاجب سے کہا۔ "کیا بات ہے، یہ صوفی میرے استقبال کے خاطر کٹیا سے نکلا کیوں نہیں، کیا اسے نہیں معلوم کہ میں اس سے ملاقات کرنے آیا ہوا ہوں۔"

حاجب نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! میں اندر جا کر اسے بتاتا ہوں کہ باہر امیر المومنین تیرے استقبال کے منتظر کھڑے ہیں۔"

اتنا کہہ کر حاجب اندر چلا گیا اور شیبان کو خلیفہ کی آمد کی اطلاع دی۔

شیبان نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔ "تو وہ باہر کیوں کھڑا ہو گیا، اندر کیوں نہیں آتا؟"

حاجب نے کہا۔ "کیا آپ نہیں جانتے کہ ہشام بن عبد الملک امیر المومنین ہیں اور آپ بھی مسلمان ہیں، اس تعلق سے وہ آپ کے بھی امیر المومنین ہیں اور آپ پر ان کا احترام اور استقبال واجب ہے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "بابا! میں نے اس دنیا کو لات مار دی جہاں خلیفہ اور امیر المومنین ہوتے ہیں۔ جا۔ ہشام سے کہہ دے کہ جب اس نے دمشق سے جبلِ لبنان تک کا فاصلہ طے کر لیا ہے تو اب چند قدم طے کرنے میں کیا امر مانع آ رہا ہے؟"

حاجب نے کہا۔ "حضرت! میں نے امیر المومنین سے وعدہ کیا ہے کہ ان کے استقبال کے لئے آپ کو کٹیا سے لے کر پہنچ رہا ہوں، اس وعدے کا پاس کیجئے اور میری شرم رکھ لیجئے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "افسوس۔ میں تیری یہ خواہش نہیں پوری کر سکوں گا تو اکیلا ہی

باہر واپس جا اور امیر المومنین سے کہہ دے کہ اپنے انتظار میں میرا مزید وقت نہ ضائع کریں۔"
حاجب نے پوچھا۔" تو آپ کا یہ آخری اور قطعی فیصلہ ہے؟"
شیبان نے جواب دیا۔" ہاں! یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے۔"
حاجب کٹیا سے نکل گیا اور ہشام کو مطلع کیا۔" امیر المومنین! مجھے تو یہ صوفی انتہائی بد اخلاق اور بے ادب معلوم ہوتا ہے کہتا ہے کہ جب امیر المومنین دمشق سے یہاں تک آ گئے ہیں تو اب مزید چند قدم چلنے میں کون سا امر مانع آ رہا ہے۔"
ہشام سناٹے میں آ گیا، اسے شیبان کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو رہا تھا، اس نے آہستہ سے بے خیالی میں کہا۔" تو اس صوفی کے یہ تیور ہیں! اتنی بڑی بات کہہ دی؟"
حاجب نے جواب دیا۔" جی امیر المومنین! میرا خیال ہے کہ یہ لوگ بڑے مردم شناس ہوتے ہیں اور اس طرح بے نیازی اور بے غرضی کا اظہار کر کے، وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو غرض مندی کے اظہار کے بعد نہیں حاصل کیا جا سکتا۔"
ہشام نے اپنے قاضی محمد بن صفوان سے پوچھا۔" اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس صوفی سے ملاقات کر دوں یا واپس چلا جاؤں؟"
قاضی نے جواب دیا۔" امیر المومنین جس نے دنیا ہی چھوڑ دی ہو اس سے آداب دنیا برتنے کی توقع فضول ہے حضور کو صوفی سے ملے بغیر نہیں واپس ہونا چاہیے۔"
ہشام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کٹیا میں داخل ہو گیا، شیبان نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ ہشام اور اس کے ساتھیوں نے شیبان کو سلام کیا، شیبان نے سلام کا جواب دیکر کہا۔
"صاحبان! فرمایئے فقیر کی کٹیا کیسے یاد آ گئی؟"
ہشام نے کہا۔" میں نے کٹیا کے باہر چند اقوال لکھے دیکھے ہیں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ خود اس پر کس حد تک کاربند ہیں؟"
شیبان نے جواب دیا۔" ہشام! میں نے اس کے تینوں اجزا پر کاربند رہنے کی کوشش کی ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی تک بفضل ایزدی اس پر پورا اترا ہوں۔"
ہشام نے پوچھا۔" آپ کی گزر اوقات کس طرح ہوتی ہے؟"
شیبان نے جواب دیا۔" میں کھیتوں اور باغوں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا ہوں اور کسی کے آگے دست حاجت نہیں دراز کرتا۔"
ہشام نے کہا۔" آپ نے نام و نشان اور شہرت پر گمنامی کو ترجیح دی ہے حالانکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ گمنام ذرا بھی نہیں اور آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی ہے، یہ کیا بات ہے؟"

شیبان نے جواب دیا" یہ شہرت اور ناموری لوگوں نے میری مرضی کے خلاف بخش دی ہے، حالانکہ میرا اپنا یہ حال ہے کہ میں کسی کو مرید تک نہیں کرتا"

ہشام نے کہا" آپ کا تیسرا قول یہ ہے کہ داد و دہش، قبول عطیات سے بہتر ہے حالانکہ یہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کٹیا میں کسی کو دینے کے لئے کچھ نہیں نہیں لینے کے لئے ہر طرف احتیاج ہی احتیاج نظر آرہی ہے۔ ان حالات میں آپ اپنے تیسرے قول پر کس طرح عمل کرتے ہیں؟"

شیبان نے اٹھ کر ایک مٹی کے مرتبان سے آٹھ دس سیب نکال کر ہشام اور اس کے ساتھیوں کے سامنے رکھ دیئے۔ بولا۔

"صاحبان! اس وقت میرے پاس یہی کچھ ہے، نوش فرمائیں"

ہشام کو تامل ہوا لیکن شیبان کے اصرار نے مجبور کر دیا اور ہشام اپنے ساتھیوں سمیت سیب کھانے لگا۔ جب یہ لوگ سیب کھا چکے تو شیبان نے کہا" میرے پاس ان سیبوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں، جو پیش کروں"

ہشام نے کہا" یہ چاہتا ہوں آپ کی سیرکی کی کٹیا کو بہترین خانقاہ تبدیل کر دوں"

شیبان نے جواب دیا" میں اس کی اجازت نہیں دوں گا، میں یہیں بہت خوش ہوں"

ہشام نے کہا" میں جس جذبۂ عقیدت سے یہاں آیا ہوں، آپ کے انکار سے اس کو ٹھیس پہنچے گی"

شیبان نے جواب دیا" نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، اگر آپ نے میرے لئے سنگی اور خوش نما خانقاہ بنوادی تو آپ ہی رہیے گا کیونکہ میں کہیں اور چلا جاؤں گا"

ہشام نے سختی سے کہا" یہ کیا بات ہے کہ آپ صوفی ہونے کے باوجود بد اخلاقی سے پیش آتے ہیں"

شیبان نے جواب دیا" میں بد اخلاقی سے نہیں پیش آتا۔ یہ تو اتہام لگا رہا ہے تو چاہتا ہے کہ قصر نما خانقاہ بنوا کر میری عبادت و ریاضت اور تقوے پر پانی پھیر دے لیکن میں اس سے بچنا چاہتا ہوں اور اس احتراز و گریز کو تو میری بد اخلاقی کہہ رہا ہے۔ ہشام یہ تیری طرف سے تہمت ہی نہیں ظلم بھی ہے میرا دل نہ دکھا۔

ہشام نے کہا" میں دمشق سے یہ فیصلہ کر کے نکلا ہوں کہ آپ کو کچھ نہ کچھ دے کر رہوں گا"

شیبان نے جواب دیا" تیری مقدرت اور تیرے اختیارات محدود اور عارضی ہیں اس لئے تو مجھے کیا دے سکتا ہے"

ہشام نے جاجب سے کہا" غالب اسے اتنے دینار دیدے کہ یہ باغوں اور کھیتوں کی محنت

مشقت سے نجات حاصل کرے اور چین اور سکون سے اللہ اللہ کرتا رہے۔"
شیبان نے جواب دیا: "میں کچھ بھی قبول نہیں کروں گا، تیری یہ کوشش فضول ہے۔"
ہشام نے گرم ہو کر کہا: "تو کیسا درویش ہے کہ میری دل آزادی کئے چلا جا رہا ہے اگر تو اپنے اصولوں کا اتنا ہی پابند اور عامل ہے تو مجھ سے کچھ لینے کی بجائے، مجھے کچھ عطا کر دے کیونکہ تو نے لکھ رکھا ہے کہ داد و دہش قبولِ عطیات قبول بہتر ہے، عطیات قبول نہیں کرتا تو نہ کر، داد و دہش تو کر۔"
شیبان نے جواب دیا: "میں تم لوگوں کی خدمت میں کچھ پھل اور پیش کر سکتا ہوں اس سے زیادہ کی نہ تو میں استطاعت رکھتا ہوں نہ مقدرت۔"
ہشام نے طنزاً کہا: "جب تجھ میں کچھ دینے کی مقدرت یا استطاعت نہیں ہے تو تو نے یہ اتنا بڑا قول کیوں لکھ رکھا ہے؟"
شیبان نے جواب دیا: "یہ قول میرے لئے ہی نہیں، سب کے لئے ہے تیرے لئے، تیرے ساتھیوں کے لئے، دنیا کے تمام انسانوں کے لئے۔"
ہشام نے حاجب سے پوچھا: "اس درویش کی باتوں میں تلوار کی کاٹ ہے، اب میں کیا کروں؟"
حاجب نے جواب دیا: "اگر مجھے امیر المومنین کی خفگی کا خیال نہ ہوتا تو میں کٹیا میں داخل ہی نہ ہوتا اور اور امیر المومنین کو واپس جانے کا مشورہ دیتا۔"
ہشام نے حاجب کی بات پر کوئی توجہ نہ دی، بلکہ قاضی ابن صفوان سے پوچھا: "ابن صفوان! میں تیرے کہنے پر اندر آیا ہوں، اب تو ہی بتا اس کھرے اور مغرور صوفی سے کس طرح پیش آیا جائے؟"
قاضی نے جواب دیا: "امیر المومنین! میرے خیال میں فقیروں سے الجھنا مناسب نہیں ہے، اس لئے انہیں ان کے حال پر ہی چھوڑ دیا جائے۔"
ہشام نے درشت لہجے میں کہا: "ابن صفوان! تو نے مجھے ذلیل کرایا ہے اس لئے میں تجھے معاف نہیں کروں گا کیونکہ اگر میں اپنے حاجب کا کہنا مان لیتا تو اس وقت اتنا ذلیل نہ ہونا پڑتا۔"
قاضی نے شیبان کی خوشامد کی، عاجزی سے بولا: "پیر و مرشد! میری عزت آبرو رکھ لیجئے ورنہ امیر المومنین مجھے معاف نہیں کریں گے۔"
شیبان نے پوچھا: "بول میں کیا کروں کہ ہشام تجھے معاف کر دے۔"
قاضی نے ہشام کی طرف دیکھا۔ ہشام نے کہا: "میں تجھے کچھ دینا چاہتا ہوں، بول کیا لینا پسند کرے گا؟"
شیبان نے جواب دیا: "ہشام! ایک زمانہ واقف ہے کہ میں عطیات قبول نہیں کرتا لیکن آج میں تیرے قاضی کی خاطر اپنا یہ اصول توڑتا ہوں اور تیرا کوئی بھی عطیہ قبول کرنے پر تیار ہوں۔"

ہشام نے اعلان کیا۔"صوفی کو دو ہزار دینار مرحمت کئے جائیں اور خانقاہ سنگی تعمیر کی جائے۔"

شیبان کے دل پر ایک چوٹ لگی، آج اس کا اصول، اس کا پندار ٹوٹ چکا تھا۔

جب خلیفہ واپس جانے لگا تو اس نے عاجزی سے کہا۔"حضرت میرے لئے کوئی نصیحت؟"

شیبان نے شکستہ دلی سے کہا۔"اقتدار اور اختیار کے بے جا استعمال سے گریز، عورت کی افراط اور تفریط سے بچاؤ اختیار کر کیونکہ اقتدار اور اختیار کی سب سے بڑی خرابی اسی محاذ سے ظاہر ہوتی ہے۔"

جب یہ لوگ جانے لگے تو اس نے قاضی کو چپکے سے بلوایا اور دو ہزار دیناروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"یہ دو ہزار دینار میرے نہیں تیرے ہیں کیونکہ انہیں میں نے تیری خاطر قبول کیا تھا، اس وقت تو ہشام کے ساتھ دمشق واپس جا، لیکن پھر کبھی تنہا آکر ان دو ہزار دیناروں کو واپس لے جا، یہ میرے پاس تیری امانت ہیں۔"

قاضی نے شرماحضوری جواب دیا۔"نہیں میں ان دیناروں کو نہیں لے سکتا۔"

شیبان نے کہا۔"اور میں ان دیناروں کو رکھ نہیں سکتا، اگر تو نہیں لے گا تو بعد میں انہیں ہشام کو واپس کر دوں گا۔"

قاضی نے کہا۔"اگر آپ ایسا کریں گے تو امیر المومنین کی خفگی مول لیں گے اور پتہ نہیں غصے میں وہ کیا کر بیٹھیں!"

شیبان نے کہا۔"تب پھر تو انہیں قبول کر لے۔"

قاضی نے پس و پیش سے کہا۔"پیر و مرشد! بات صرف اتنی سی ہے کہ اگر میں آپ سے یہ دو ہزار دینار لے بھی لوں گا تو اس کا علم کسی نہ کسی طرح امیر المومنین کو بھی ہو جائے گا اور آخر کار میں کسی عتاب کا شکار ہو جاؤں گا۔"

شیبان نے جواب دیا۔"یہ بات کسی تیسرے کو جب معلوم ہی نہ ہو گی تو ہشام تک کس طرح پہنچے گی؟"

بہر حال بدرجہ مجبوری قاضی کو یہ دو ہزار دینار قبول کرنا پڑے اور بعد میں شیبان نے خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کیا گویا اس کے سر پر ایک پہاڑ آ گرا تھا، جسے اس نے اتار پھینکا تھا۔

ہشام کے چلے جانے کے بعد شیبان کو فکر ہو گئی کہ اب ہشام کے آدمی آئیں گے اور اس کی کٹیا کو قصر نما خانقاہ بنا کر چلے جائیں گے جبکہ وہ خلیفہ کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ جگہ ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ ایک بار پھر نقل مکانی پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ یہاں جو لوگ آتے تھے وہ ان سے بہت مانوس ہو گیا تھا، اور اب وہ جس جگہ جائے گا

ان سے مانوس ہونے میں کافی وقت لگے گا۔

اس نے چپ چاپ اپنی اس جگہ کو خیرباد کہا اور دمشق کے شمال میں سایہ فگن پہاڑ قاسیون کی راہ لی۔ یہاں بھی بڑے بڑے غار تھے اور یہاں بعض غاروں میں انبیا علیہم اسلام اور بزرگان صالحین کی یادگاریں اور قبریں تھیں۔ یہیں مغارۃ الدم نامی غار بھی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ قابیل نے یہاں اپنے بھائی ہابیل کا خون بہایا تھا۔ یہاں خون کا ایک ایسا نشان بھی موجود ہے جس کے لئے یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ یہ ہابیل کا خون ہے جو خشک ہو گیا ہے۔ یہیں ایک ایسا پتھر بھی موجود ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس سے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کا سر پھاڑا تھا۔ شیبان کو اس سے اچھی جگہ نہیں مل سکتی تھی اس لئے اس نے یہیں کٹیا بنانے کا ارادہ کر لیا۔ شیبان نے جبل قاسیون میں داخل ہوتے ہی مقامات مقدسہ کی زیارت کی، اس کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ تزکیۂ نفس اور مجاہدے کے لئے اس سے بہتر جگہ نہیں پا سکتا تھا۔

اس نے یہاں بھی محنت اور مزدوری سے اپنی روزی کمانا شروع کر دی۔ اس نے اپنے لئے لکڑی کا مکان بنایا جس پر کسی قسم کا رنگ روغن نہیں تھا، یہاں بھی ارادت مندوں میں اضافہ ہونے لگا اور شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی۔ اس بار اس نے جس جگہ کٹیا بنائی تھی یہ جگہ پہاڑی ہوتے ہوئے بھی مسطح تھی اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک چشمہ رواں تھا۔ یہاں بھی انجیر، سیب، انگور اور پستے کے درختوں کی بھرمار تھی۔

یہاں کچھ ہی مدت بعد یہ تجربہ بھی ہوا کہ اس کے پرانے ارادت مندوں نے اسے تلاش کر لیا اور اس کے پاس حاضری دینے لگے۔

ایک دن سہ پہر کو جب وہ اپنی کٹیا میں داخل ہوا تو اس نے اپنی کٹیا کے پیچھے ایک دوسری کٹیا بنتے دیکھی۔ شیبان کا خیال تھا اس جیسا کوئی دوسرا درویش بھی شاید اس کے پڑوس میں آ گیا ہے۔ اس کو جستجو تو نہیں تھی لیکن ایک دن اچانک جو اس نئی کٹیا کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا یہ بڑی شاندار کٹیا تھی اور اسے پوری نگرانی اور احتیاط سے کاریگروں اور مزدوروں سے بنوایا گیا تھا۔ اس کی چھت کو اس طرح پاٹا گیا تھا کہ بارش میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپک سکتا تھا۔

جب یہ کٹیا تیار ہو گئی تو ایک ادھیڑ عمر شخص نے شیبان کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا "حضرت! میں آپ کی خدمت میں پہلے ہی حاضری دینے والا تھا لیکن پھر میں نے یہ سوچا کہ پہلے سر چھپانے کے لئے جگہ بنا لوں، اس کے بعد آپ کے نیاز حاصل کروں۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "ملاقات کر لی بڑی مہربانی، ورنہ اس دنیا میں کس کے پاس

اتنا وقت ہے کہ اپنی ذات کے علاوہ کسی اور پر توجہ کر سکے۔"
پڑوسی نے پوچھا۔ "حضرت یہ جو اقوال آپ نے اپنی کٹیا کے باہر لکھ رکھے ہیں، کیا ان پر آپ عمل بھی فرماتے ہیں؟"
شیبان نے جواب دیا۔ "حتی الوسع، حتی المقدور، خدا قول و عمل کے تضاد کی شرمندگی سے محفوظ رکھے۔"
پڑوسی نے کہا۔ "حضرت! اس میں کچھ میری طرف سے اضافہ فرمالیں۔"
شیبان نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"
پڑوسی نے جواب دیا۔ " اپنے اقوال کے نیچے لکھ دیجئے، تجرّد تاہل سے بہتر ہے۔"
شیبان کو شبہ گزرا کہ پڑوسی اس پر طنز کر رہا ہے کیونکہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ پڑوسی شیبان کی خاموشی کا مطلب سمجھ گیا، بولا میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا ہوں، ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"
شیبان نے جواب دیا۔ "میں تیرا یہ قول نہیں لکھ سکتا کیونکہ میں تاہل پر تجرّد کی برتری اور بہتری ثابت نہیں کر سکتا۔"
پڑوسی نے شیبان کا زیادہ وقت نہیں لیا، چلا گیا، لیکن اسے دوسرے دن یہ معلوم ہوا کہ پڑوسی نے اس کی مرضی کے خلاف اس کے اقوال کے نیچے موٹا موٹا لکھ دیا تھا۔
"تجرّد تاہل سے بہتر ہے۔"
شیبان کو پڑوسی کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ اس کے قول کے نیچے کسی اور کا اپنا قول لکھ دینا اس کے لیے یوں خطرناک بات تھی کہ وہ اس کی صداقت کو ثابت نہیں کر سکتا تھا اور جس کی صداقت وہ ثابت نہ کر سکتا ہو اس کی ذمے داری کس طرح قبول کر سکتا تھا۔ اس نے پڑوسی کا قول مٹا دیا اور اس کا انتظار کرنے لگا کہ وہ آئے تو اس کو منع کر دیا جائے کہ وہ آئندہ اپنا کوئی قول اس کے اپنے قول کے آس پاس نہ لکھے، لیکن پڑوسی نہیں آیا۔ دو دن بعد وہ خود ہی پڑوسی کے در پر پہنچ گیا اور دستک دی، لیکن اندر سے کسی مرد کی جگہ عورت کی آواز سنائی دی۔ "کون؟"
شیبان چکرا گیا، دبی دبی آواز میں پوچھا۔ "کیا کوئی مرد اندر نہیں ہے؟"
کسی دوسری نوجوان نسائی آواز نے آپس میں کہا۔ "ماں یہ تو اپنے صوفی جی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔"
شاید اب یہ دونوں عورتیں دروازے کے پاس ہی آ چکی تھی۔ ایک عمر رسیدہ زنانی

آواز نے پوچھا۔ "پیر و مرشد! آپ کسے پوچھ رہے ہیں؟"

شیبان نے سہمی آواز میں پوچھا۔ "کیا اندر کوئی مرد نہیں ہے؟"

جواب ملا۔ "نہیں ان سے آپ کو کام کیا ہے؟"

شیبان نے پوچھا۔ "لیکن دو دن پہلے تو اس میں ایک صاحب موجود تھے، وہ کہاں چلے گئے؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ہاں دو دن پہلے بے شک یہاں تھے لیکن اب وہ چلے گئے اور پتہ نہیں اب وہ کب واپس آئیں گے اور کون جانے کہ واپس آئیں گے بھی یا نہیں!"

کسی لڑکی نے کہا۔ "ماں! صوفی جی کو ساری باتیں بتا دو۔"

شیبان کے کان میں ایک عرصے بعد کسی لڑکی کی مترنم آواز پڑی تھی۔ اس کا سارا وجود ہل گیا اور پورے جسم میں سرور و کیف سا دوڑ گیا۔ اس لمحے اسے دونوں راہبوں کا قول یاد آ گیا، جس میں عورتوں اور پادریوں سے دور رہنے کی تلقین کی گئی تھی، وہ شاید بھاگ کھڑا ہوتا لیکن فوراً ہی اسے اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہوا اور اسلام میں عورتوں سے حذر کرنے کی تلقین نہیں کی گئی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے قابو میں نہیں تھا، بمشکل پوچھا۔ "کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کے خاندان کا مرد کہاں چلا گیا اور کیوں چلا گیا؟ اور اب آپ لوگوں کی کفالت کون کرے گا؟"

غالباً لڑکی کی ماں نے کہا۔ "نائلہ! تو اندر جا، میں بات کرتی ہوں۔" اس کے بعد شیبان سے کہا۔ "حضرت! جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا شوہر چلا گیا ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کب آئے گا اور یہ کہ وہ آئے گا بھی یا نہیں۔ رہا اس کنبے کی کفالت کا مسئلہ تو اللہ مالک ہے۔"

شیبان نے زیادہ جستجو نہیں کی کیونکہ رسول اللہ کا یہ قول اسے یاد تھا کہ (تجسس و جستجو مت کرو) وہ اپنی کٹیا میں واپس چلا آیا۔ اس دن اس نے خود میں یہ تبدیلی محسوس کی کہ اس کا سکون تباہ ہو چکا تھا اسے اپنے پڑوسیوں سے بڑی ہمدردی ہو گئی تھی، کسی ارادے کے بغیر ہی وہ یہ سوچنے لگا کہ ان غریب عورتوں کا کیا حشر ہو گا؟ کسی مرد کے بغیر کام کس طرح چلے گا؟ اس دن عبادت اور مراقبے میں بھی اسے یہی خیال ستاتا رہا۔

رات کو جب وہ تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا تو ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے لگے۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ ان پراگندہ اور فضول سوالوں سے پیچھا چھڑا لے لیکن ناکام رہا اس رات عبادت میں بھی وہ مزہ نہیں آیا۔ رات نیند بھی صحیح طرح نہیں آئی، اور جب سویا تو خواب بھی عجیب عجیب سے نظر آتے رہے۔ صبح فجر کی دو رکعت کے دوران اس نے سوچا کہ

اگر پڑوسی واپس نہ آیا تو ان غریب عورتوں کا کیا بنے گا؟ پھر اس سوال کو اس خیال نے رد کر دیا کہ یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا ہے لیکن اس لمحے اسے رسول اللہؐ کی وہ حدیثیں یاد آگئیں جن میں آپؐ نے پڑوسیوں کے بارے میں اتنی ہدایتیں کی تھیں کہ یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ پڑوسیوں کو کہیں ورثے میں بھی شامل نہ کر لیا جائے۔ ان حدیثوں کی رُو سے اس پر یہ فرض ہو گیا تھا کہ پڑوسی کی عدم موجودگی میں وہ ان دونوں عورتوں کا خاص خیال پیدا ہوتا اور دوسرا اسے رد کر دیتا۔ یہاں تک جب اس نے سلام پھیرا تو اس وہم نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا کہ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

اس دن وہ کھیتوں پر بھی نہیں جا سکا، پڑوس کا خوبصورت اور مضبوط کٹیا نما مکان اس کی کٹیا کی پشت پر تھا، دونوں کی پشتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں اور پڑوسی نے پشت کی مضبوطی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس کے خیال میں یہ حصّہ شیبان کی وجہ سے بالکل محفوظ تھا۔ شیبان نے اپنی کٹیا کو اندر سے بند کر لیا اور اندر کے عقبی حصّے سے دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیری کی درزوں سے دوسری طرف کا سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک چالیس پینتالیس سالہ عورت کو کچھ پکاتے ہوئے دیکھا لیکن وہ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا، جسے اس عورت نے نائلہ کہہ کر مخاطب کیا تھا اور جس کی مترنم آواز نے اس کے کانوں کے راستے دل اور پھر پورے جسم میں ایک رس ایک کیف سا گھول دیا تھا لیکن وہ لڑکی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس گھر میں اس ایک عورت کے سوا کوئی رہتا ہی نہ ہو۔

اچانک عورت نے آواز دی۔ "نائلہ تو اندر کیا کر رہی ہے ذرا ادھر میرے پاس تو آ۔"

جواب میں نائلہ کی ترنم سے لبریز آواز سنائی دی۔ "آئی ماں، ابھی آئی۔"

اس کی آواز نے شیبان کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اسی لمحے کٹیا کے در پر کسی نے دستک دی۔ شیبان کو کسی کی اس بے موقع آمد پر سخت غصّہ آیا، وہ بدستور لڑکی کو دیکھنے میں منہمک رہا۔ کسی نے زور زور سے دستک دینا شروع کر دی، اور نائلہ تھی کہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ شیبان نے بادلِ نخواستہ کٹیا کا دروازہ کھولا، سامنے اس کے کھیت کا ایک دوسرا مزدور کھڑا تھا، اس نے کہا۔ "حضرت! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آج آپ کام پر نہیں پہنچے کوئی خاص بات؟"

شیبان نے بے دلی سے جواب دیا۔ "آج میری طبیعت کام پر راغب نہیں تھی، اس لئے نہیں پہنچا، کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

مزدور نے کہا۔ "کھیت کے مالکان کو الگ فکر تھی، انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی خیریت معلوم کر آؤں، چنانچہ میں آ گیا۔"

شیبان نے بدستور بے دلی سے کہا۔ "ہاں میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے بس کام کرنے کو جی نہیں چاہا۔"

مزدور چپ ہو گیا، شیبان باتوں کو طول نہیں دینا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا یہ جلد از جلد واپس چلا جائے لیکن مزدور اس طرح اطمینان سے بیٹھ گیا کہ اٹھنے کا ارادہ ہی نظر نہ آتا تھا۔ شیبان کو یہ قلبی دکھ پہنچ رہا تھا کہ افسوس اگر نائلہ ماں کے پاس آئی بھی ہو گی تو وہ اسے نہیں دیکھ سکے گا، وہ پھر اپنی جگہ واپس جا بیٹھے گی۔ اسے مزدور پر غصہ آ رہا تھا۔ جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے مزدور سے پوچھا۔ "مجھ سے کوئی اور کام؟"

مزدور نے جواب دیا۔ "آپ سے کام تو کوئی نہیں، معلوم نہیں کیوں آپ کی صحبت میں بڑا جی لگتا ہے اور اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔"

شیبان نے کہا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں اور پھر میری وجہ سے تم اپنا نقصان کیوں کرو، جاؤ اور محنت مزدوری کر کے بیوی بچوں کا پیٹ پالو۔"

مزدور پر اس نصیحت کا کوئی خاص اثر نہ ہوا، بولا۔ "حضرت! لوگوں کو حیرت اس بات پر ہے کہ آپ نے نوجوانی میں دنیا چھوڑ دی، یہ بڑا مشکل کام ہے۔"

شیبان نے ٹالنے کی کوشش کی، بولا۔ "اس میں کمال کی کیا بات ہے بس میرا دل دنیا سے بیزار ہو گیا اور میں نے دنیا چھوڑ دی اور یہ کام ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے خدا کی توفیق حاصل ہو جائے۔"

مزدور نے انکسار اور عقیدت سے عرض کیا۔ "حضرت! میرا دل بھی دنیا سے اُچاٹ ہو چکا ہے اور آج کئی دن سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ ہی کی طرح دنیا کو لات مار دوں اور آپ کے قدموں میں آ رہوں، اس لئے آج میں نے بھی کام نہیں کیا اور آپ کے پاس چلا آیا۔"

شیبان کو اور زیادہ غصہ آیا۔ یہ مزدور تو اس کے حق میں بلائے بے درماں ہو گیا تھا، شیبان نے اسے نصیحت کی۔ "تیرے بیوی بچے ہیں اس لئے تو دنیا کو ترک کرنے کا اپنے دل میں خیال تک نہ لا، اس وقت کام پر واپس جا اور محنت مزدوری سے جی نہ چرا۔ تیرے سر پر بڑی ذمے داریاں ہیں۔"

مزدور نے اصرار کیا۔ "حضرت! آپ کچھ بھی کہیں، میں یہیں آپ کے پاس ہی رہوں گا اور آپ کی خدمت کروں گا، آپ کی پیاری پیاری باتیں سنوں گا۔"

شیبان نے روکھے لب و لہجے میں کہا۔ "لیکن میں تجھے یہ مشورہ نہیں دوں گا اگر تو آج میری طرح چھٹی ہی کرنا چاہتا ہے تو اپنے یہ فرصت اور فراغت کے لمحات اپنے بیوی بچوں میں گزار کیونکہ تیرا یہ عمل بھی عبادت ہی میں شمار کیا جائے گا۔"

لیکن مزدور پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا، بولا۔ "بیوی بچوں میں پھنس کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آدمی اگر اللہ سے لو لگانے کی نیت رکھتا ہو تو اسے شادی نہیں کرنا چاہیئے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے، جب تک آدمی شادی نہیں کرتا، ادھورا رہتا ہے، اب تم مجھی کو دیکھ لو، میں معلوم نہیں کیا ہوں لیکن اپنی جگہ یہ بھی معلوم ہے کہ میں ایک ادھورا انسان ہوں اور اس وقت تک ادھورا رہوں گا جب تک میں شادی نہیں کر لوں گا۔"

مزدور نے حیرت سے کہا۔ "واہ جناب! یہ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں خلوص اور ایمانداری سے کہہ رہا ہوں۔"

مزدور نے شیبان کے احترام میں زیادہ الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ شیبان نے بے رخی سے کہا۔ "میں آرام کرنا چاہتا ہوں، اب تم اپنے گھر جاؤ۔"

مزدور کھسیاتا ہو کر کٹیا سے نکل گیا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ آج یہ شیبان کو ہو کیا گیا ہے۔

شیبان نے کٹیا کو اندر سے بند کر لیا اور دوبارہ عقبی حصّے سے دوسری طرف جھانکنے لگا، لیکن اب وہاں نہ ماں تھی نہ اس کی بیٹی، دونوں ہی اندر چلی گئی تھیں۔ وہ مزدور کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ بڑی دیر کھڑا نائلہ کے باہر نکلنے کا منتظر رہا لیکن وہ نہیں نکلی، یہاں تک کہ پاؤں جواب دے گئے اور وہ آنکھیں بند کر کے چٹائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک وہ نائلہ کے تصوّر ہی میں کھویا رہا لیکن پھر اس کے وجود میں زہد و تقویٰ بیدار ہو گیا اور وہ اپنی تھوڑی دیر پہلے کی حرکتوں پر نادم اور شرمسار ہو گیا اس کا دل گھبرایا اور خود پر لعنت ملامت کرنے لگا اس نے سوچا دونوں راہب سچ ہی کہہ رہے تھے کہ عورتوں سے حذر کرنا چاہیئے۔

ظہر کی نماز میں دو ایک بار پھر نائلہ کا خیال آیا لیکن اس نے قابو پالیا اور اپنا دھیان زبردستی اللہ کی طرف رکھا لیکن اس جبر اور زبردستی میں بھی نائلہ کے خیال کی جھلکیاں آتی جاتی رہیں، نماز پڑھ چکنے کے بعد وہ سجدے میں گر کر رونے لگا اس کی سیاہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ وہ رو رو کر کہنے لگا۔ "اے میرے رب! مجھے لغزش سے بچا اور نائلہ کا خیال دل سے دور کر دے، مجھ سے میری بینائی چھین لے کہ میں نائلہ کو دیکھ ہی نہ سکوں، میری سماعت چھین لے کہ میں اس کی آواز ہی نہ سن سکوں، میرے پیروں کی توانائی زائل کر دے کہ میں نائلہ کی جستجو ہی نہ کر سکوں۔"

مناجات کے بعد اسے سکون سا آگیا۔

رات کو عشاء کے بعد کسی نے کٹیا کے در پر دستک دی، شیبان نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے جواب ملا۔ "حضرت! میں ہوں نائلہ کی ماں، دروازہ کھولئے۔"

شیبان کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا، مگر اس نے دل پر قابو پانے کی کوشش کی، پوچھا۔ "اس وقت میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

عورت نے خوشامدانہ کہا۔ "دروازہ تو کھولئے۔"

شیبان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔

عورت نے خوشامد کی۔ "حضرت! خدا کے لئے دروازہ کھولئے میں بہت پریشان ہوں۔"

شیبان نے دروازہ کھول تو دیا لیکن یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ اس عورت کو سختی سے منع کر دے گا کہ اس کے پاس آئندہ نہ آئے۔

دروازہ کھلتے ہی عورت اپنی بیٹی نائلہ کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ شیبان نائلہ کی جھلک دیکھتے ہی بدحواس ہوگیا اندر کمزور لو کا چراغ جل رہا تھا۔ شیبان نے چراغ کی کمزور روشنی میں نائلہ کو بہ جبر اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی، نائلہ نے بھی اسے ایک نظر دیکھا اور شرما کے گردن جھکالی۔

شیبان نے ان دونوں کو چٹائی پر بٹھا دیا اور خود ان دونوں کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر دونوں کی طرف سے خاموشی رہی، عورت کٹیا کا جائزہ لیتی رہی اور نائلہ نے مستقلاً سر جھکا لیا۔ شیبان چوری چھپے نائلہ پر نظریں ڈال کر سہم جاتا۔

اچانک عورت نے شکایتاً کہا۔ "پیر و مرشد! میں ایک دکھیا عورت ہوں، میرا شوہر عراقی ہے یا کچھ اور، میں نہیں جانتی۔ وہ اکثر و بیشتر خود کو اس عہد کا بہت بڑا روحانی آدمی

ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھ پر الہام ہوتا ہے۔ کبھی یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس فرشتے آتے ہیں۔ وہ رویائے صادقہ دیکھتا ہے۔ میں اس کی باتوں سے عاجز آئی ہوئی تھی اور ہم دونوں میں ان باتوں پر اکثر و بیشتر جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔"

شیبان نے پوچھا۔ "تم دونوں کے یہاں آنے کا کیا سبب ہوا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "وہی تو میں بتا رہی ہوں۔ ایک دن فجر کی نماز پڑھ کر وہ سو گیا اور کچھ دیر بعد جب بیدار ہوا تو کہنے لگا، خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ اپنی بیوی اور بیٹی کو کسی ویرانے میں چھوڑ آؤ، اور ان دونوں کو اس وقت تک ویرانے میں رہنے دو جب تک خدا دوبارہ یہ حکم نہ دے کہ انہیں گھر واپس لے آؤ، چنانچہ وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں ہم دونوں کو اس ویرانے میں چھوڑ گیا۔"

شیبان نے کہا۔ "خدا نے اسے یہ حکم کیوں دیا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں، لیکن میرا شوہر یہ کہتا تھا کہ یہ اس قسم کا حکم ہے جیسا حضرت ابراہیم کو دیا گیا تھا۔"

شیبان نے افسوس سے کہا۔ "لیکن یہ طے ہے کہ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت ہوگی۔"

عورت نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتی کہ اس میں خدا کی کیا مصلحت ہے۔ معلوم نہیں مجھے یہاں کب تک رہنا ہوگا، یہ سوچ سوچ کر میرا دل ہولتا ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو مارے ڈر کے ہم دونوں کا حشر کیا ہوتا۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ دونوں اللہ سے لو لگائیے ساری مشکل آسان ہو جائے گی۔"

عورت نے اپنی بیٹی نائلہ سے کہا۔ "تو سر جھکائے کیا بیٹھی ہے، اب پیر و مرشد ہی ہمارے عزیز اور سرپرست ہیں، ان سے کیا شرمانا۔"

نائلہ نے سر جو اٹھایا اور شیبان سے نظریں جو ملیں تو گویا بجلی سی کوند گئی، شیبان کو پسینہ آگیا۔

عورت کچھ دیر بیٹھ کر واپس جانے لگی تو ماں کے اشارے پر نائلہ نے کہا۔ "میری گزارش ہے کہ جب تک ہم لوگ آپ کے پڑوسی ہیں، آپ کے کھانے کا بندوبست ہم کر دیا کریں۔"

شیبان نے تکلفاً جواب دیا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لئے کسی زحمت میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

عورت نے اصرار کیا۔ "نہیں پیر و مرشد، نائلہ جو کچھ کہہ رہی ہے، درست کہہ رہی ہے، آپ کا پڑوس ہمارے لئے باعثِ برکت ہے۔ میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں گی۔"

وہ دونوں چلی گئیں لیکن شیبان کو پریشانی میں ڈال گئیں۔ نائلہ اس کے دل و دماغ پر مستولی ہوتی جا رہی تھی۔ نائلہ کے آنے، شرمانے اور مترنم آواز سے رس گھولنے تک ساری باتیں دل و دماغ میں مرتسم ہو گئی تھیں اور یہ کسی ارادے اور توجہ کے بغیر ہو رہا تھا۔ شیبان کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ نصف شب کے بعد جب وہ تہجد کے لئے کھڑا ہوا تو اس کا دل اچاٹ تھا، اس نے بڑی کوشش کی کہ اپنی سابقہ یکسوئی واپس لے آئے لیکن ناکام رہا۔ جب وہ سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کہہ رہا ہوتا تو تصور میں نائلہ کھڑی مسکرا رہی ہوتی۔ اس نے اپنے ان سجدوں اور نمازوں کے عوض پھر سے عبادت شروع کی اور اس بات کی کوشش کی کہ نیتِ نماز سے لے کر رکوع و سجود اور سلام تک اللہ کے سوا نائلہ کا خیال تک نہ آئے لیکن اس بار بھی ناکامی ہوئی اور نائلہ کا پیکرِ خیال اس کے دل و دماغ پر طاری رہا۔ اس جدوجہد میں رات ختم ہو گئی اور فجر طلوع ہوئی۔ اس نے فجر کی نماز کے لئے تازہ وضو کیا اور دیر تک شیطان پر لاحول پڑھنے کے بعد فجر کی نماز شروع کی، لیکن اس نے فوراً ہی یہ محسوس کر لیا کہ شیطان نائلہ کے ذریعے اس کی تباہی کے درپے ہے۔

نماز کے بعد اسے اپنی حالت پر رونا آ گیا۔ وہ مصلے پر ہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے اور بڑی رقت سے دعا مانگی گئی "رب العالمین! میں تیرا کمزور اور مجبور بندہ ہوں۔ یہ نائلہ کو بھیج کر تو نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا۔ میں تجھ سے کسی قسم کی رعایت نہیں چاہتا لیکن فی الحال اتنا کرم کر کہ میرے ان سجدوں کو بھی شرفِ قبولیت بخش، جو نائلہ کے تصور سے آلودہ ہوں۔ میرے رب! مجھے اس عذاب سے نکال اور صحیح راستہ دکھا، بتا کہ ان حالات میں، میں کیا کروں؟"

ابھی وہ مناجات سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ باہر سے عورت کی آواز سنائی دی۔

"پیر و مرشد! صبح کا کھانا میں بھیجوں گی۔ نائلہ تیار کر رہی ہے۔ آپ نہ پکائیے گا۔"

شیبان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ چپ چاپ پڑا رہا۔ عورت جواب نہ پا کر یہ سوچ کر واپس چلی گئی کہ شاید پیر و مرشد کی آنکھ لگ گئی۔

کچھ دیر بعد شیبان اٹھا اور کھیتوں پر نکل گیا۔ وہ سارا دن غائب رہا۔ اس دن

کھیت پر کام کرنے والوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ شیبان کسی انتشار کا شکار ہے وہ اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ چپ چاپ کام میں لگا رہا۔ شام کو اجرت لی اور سیدھا کٹیا میں جانے کے بجائے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا، عصر مغرب کی نمازیں بھی راہ میں پڑھ لیں، رات کے اندھیرے میں جب وہ کٹیا میں داخل ہوا تو تکان سے برا حال تھا۔ اس نے چراغ جلایا۔ اپنے ساتھ کچھ پھل لیتا آیا تھا۔ انہیں کھا کر عشاء کے لئے وضو کیا اور مصلے پر کھڑا ہو گیا۔ کٹیا کا دروازہ کھلا رہ گیا

نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ مصلے سے اٹھا تو اسے اپنی چٹائی پر نائلہ اور اس کی ماں بیٹھی دکھائی دیں۔ نائلہ کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور وہ شیبان کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شیبان کے ضبط و احتیاط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ارے یہ تم ہو! خوب! کب آئیں؟

نائلہ کی ماں نے جواب دیا۔" ابھی ابھی آئی ہوں اور یہ آپ صبح بتائے بغیر کہاں چلے گئے تھے؟"

شیبان نے کہا۔" شاید آپ کو یہ بات نہیں معلوم کہ میں محنت مزدوری کر کے گزر بسر کرتا ہوں۔ میں کام پر چلا گیا تھا۔"

نائلہ کی ماں نے شکایتاً کہا۔" لیکن ہم دونوں نے آپ کا بڑا انتظار کیا۔ آپ کا کھانا ابھی تک رکھا ہے، شاید آپ نے ابھی تک ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔"

شیبان نے جواب دیا۔" یہ بات نہیں ہے میں آپ دونوں کو اپنا ہی سمجھتا ہوں لیکن آپ میرے کھانے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیں، کیونکہ یہ بات مجھے پسند نہیں ہے۔"

عورت نے پوچھا۔" آخر پسند کیوں نہیں ہے؟"

شیبان نے جواب دیا۔" اس لئے کہ میں نے خود کو اللہ تعالیٰ کے حق میں ہبہ کر دیا ہے اور اپنے سارے کام اپنے ہاتھ ہی سے کرنا چاہتا ہوں، آپ دونوں کا قیام عارضی ہے اور مجھے زندگی بھر یہیں رہنا ہے اس لئے میں آپ کے سہارے رہ کر خود کو ضائع نہیں کر سکتا۔"

نائلہ کی ماں کو شیبان کی باتیں ناگوار گزریں، بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔

" نائلہ چل اپنے گھر چلیں، میں پیر و مرشد کو ناراض نہیں کر سکتی، میں نے ان کے وجود کو بسا غنیمت جانا تھا لیکن ان کی اس وقت کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ آدمی کو ماحول کیا سے کیا بنا دیتا ہے، لوگ ویرانوں میں رہ کر وحشی ہو جاتے ہیں۔ انہیں آدمیوں کی صحبت سے ڈر یا الجھن محسوس ہونے لگتی ہے، اب میں پیر و مرشد کو کبھی کوئی تکلیف نہ دوں گی۔"

نائلہ نے ماں سے کہا۔ "لیکن پیر و مرشد نے جو بات کہی ہے اس میں فقر اور عاجزی پائی جاتی ہے۔ مجھے تو ان کی بات بری نہیں لگی۔ پھر آپ کیوں برا مان گئیں؟"

ماں کو اور غصہ چڑھا، نائلہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کٹیا سے جاتی ہوئی بولی۔ "اگر تو یہاں بیٹھنا چاہتی ہے تو بیٹھ، میں چلی۔"

نائلہ اس کے پیچھے دوڑی اور بولی۔ "ماں! تم مجھے کس کے پاس چھوڑے جا رہی ہو! میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

ماں نے جواب دیا۔ "لیکن ...... میں نے جو فیصلہ کیا ہے اپنے لئے کیا ہے، تو اس خشک پیر کے پاس بیٹھ اور ان کے وعظ سنتی رہ کیونکہ دین و دنیا انہی وعظوں سے سدھرتے ہیں۔"

ماں چلی گئی، بیٹی شیبان کے پاس ہی بیٹھی رہی، شیبان نے بتی کی لو بڑھائی جس سے روشنی بڑھ گئی۔ اس نے نائلہ کی ماں کی عدم موجودگی میں نائلہ کو اچھی طرح دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نائلہ جیسی حسین لڑکی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، بیضوی چہرے پر بادام جتنی بڑی بڑی آنکھیں، ناک ستواں، دانت چھوٹے چھوٹے، آنکھوں میں ایک خاص چمک اور کشش! اس نے بڑی ادا سے پوچھا۔ "کیا آپ ہمیں سچ مچ غیر سمجھتے ہیں؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "نہیں تو، ایسی کوئی بات نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں خود کو کاہل یا بے عزت نہیں بنانا چاہتا میں تم لوگوں پر بار نہیں بننا چاہتا۔"

نائلہ نے کہا۔ "ایک ذرا سی بات میں آپ کہاں تک چلے گئے! آپ نے ہمارا دل توڑ دیا میری ماں پہلے ہی بڑے دکھ جھیل چکی ہیں۔ اب یہاں آپ نے بھی انہیں اذیت پہنچائی، میں آپ سے درخواست کروں گی کہ انہیں دکھ نہ پہنچایئے، ان کا دل نہ توڑیے آپ کو جو زیادتی کرنی ہو، میں حاضر ہوں، شوق سے کیجئے۔"

شیبان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ نائلہ اس سے یوں بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگے گی۔ وہ کچھ دیر بڑی محبت سے نائلہ کی صورت دیکھتا رہا، نائلہ نے بھی شیبان کی وارفتگی کو محسوس کر لیا کچھ دیر تک جواب نہ پا کر بولی۔ "آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "نائلہ! میں تیری باتوں کا کیا جواب دوں؟ میں تیری ماں تو کیا کسی کا بھی دل نہیں دکھا سکتا۔ نائلہ! میں صوفی ہوں اور صوفی دل کو خدا کا گھر کہتے ہیں، پھر ایک صوفی خدا کے گھر کو کوئی نقصان کس طرح پہنچا سکتا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا اپنی انا کی خاطر کہا، میں مشتبہ لقمہ اپنی حلق سے نہیں اتار سکتا۔"

نائلہ نے کہا۔ "میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میرے گھر کا کھانا مشتبہ نہیں ہے، میں کہتی ہوں، میری بات پر یقین کیجئے۔"

شیبان نے کہا۔ "اچھا چل، میں نے تیری بات کا یقین کر لیا، بتا تو کیا چاہتی ہے؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "میں چاہتی ہوں کہ میری ماں خوش رہے، ہشاش بشاش رہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب آپ میری ماں کا دل نہ توڑیں۔"

شیبان نے ہتھیار ڈال دیئے، بولا۔ "نائلہ! تو کہتی ہے تو میں مانے لیتا ہوں جا اپنی ماں سے کہہ دے، کل سے میں تیرے ہی گھر میں کھاؤں گا لیکن اب ایک شرط میری بھی قبول کر لے۔"

نائلہ نے بڑے تیکھے انداز میں سر ہلا کر ترچھی نظروں سے شیبان کی طرف دیکھا، پوچھا۔ "وہ کیا؟ کون سی شرط؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "اب میں جو کچھ بھی کما کر لاؤں گا تیرے حوالے کر دیا کروں گا۔ اس سے کھانا پکا کرے گا اور ہم تینوں مل کر کھایا کریں گے۔"

نائلہ نے کہا۔ "تجویز تو اچھی ہے لیکن ماں کی منظوری ضروری ہے۔"

شیبان نے کہا۔ "تب پھر جا اور اسی وقت منظوری حاصل کر لے، میں تیرا انتظار کر رہا ہوں گا۔"

نائلہ نے شوخی سے پوچھا۔ "کیا اس طرح آپ مجھے بھگانا چاہتے ہیں؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "نہیں تو بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر تو یہ خبر اپنی ماں کو پہنچا دے گی تو اس کا غم ہلکا ہو جائے گا اور وہ خوش ہو جائے گی۔"

نائلہ کھڑی ہو گئی، بولی۔ "اچھا میں جاتی ہوں اور ماں کو خوشخبری سنائے دیتی ہوں لیکن ایک بات یاد رہے، وہ یہ کہ میں ابھی واپس بھی آؤں گی اور آپ سے بہت ساری باتیں کروں گی۔"

شیبان اسے منع نہیں کر سکا کہ رات کو وہ عبادت کرتا ہے اس لئے اب وہ واپس نہ آئے لیکن نائلہ چلی گئی اور شیبان اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا کیونکہ اب وہ ذرا سہم گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کہیں خدانخواستہ اس کی کوئی بات نائلہ کو بھی ناگوار گزری تو وہ بھی اپنی ماں کی طرح روٹھ کر چلی جائے گی۔

رات کے سناٹے میں کیڑے مکوڑوں کی آوازیں سکوت کو تہ و بالا کر رہی تھیں تہجد کا وقت بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ مصلے پر بیٹھا تھا اور معلوم نہیں مناجات میں کیا کچھ کہہ

رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی داڑھی بھیگ گئی۔ دل پر رقت یوں طاری تھی کہ حلق سے اس کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔

نائلہ اپنی بشاش ماں کا ہاتھ پکڑے ہوئے کٹیا میں واپس آئی اور شیبان کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ ماں کا بھی خوشی سے عجیب حال تھا، وہ بار بار یہی کہے جا رہی تھی "میں تو یہی کہوں کہ ایک صوفی کسی انسان کا دل کیسے توڑ سکتا ہے۔ یہ لوگ تو خلق و محبت کے مجسمے ہوتے ہیں۔"

دونوں شیبان کے سامنے بیٹھ کر اس کی مدح و ستائش میں لگ گئیں اور شیبان اپنے انجام کو سوچ سوچ کر کانپنے لگا۔ تہجد کا وقت آ گیا لیکن وہ دونوں نہیں ٹلیں۔ نماز کی طرف اس کی طبیعت ہی نہیں راغب ہو رہی تھی، یہی دل چاہتا تھا کہ نائلہ اس کے سامنے بیٹھی رہے اور وہ اس کی صورت دیکھتا اور آواز سنتا رہے۔

چند ہفتوں میں اس کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ ان دونوں سے بالکل بے تکلف ہو گیا۔ نائلہ اور اس کی ماں کو شیبان کا تقویٰ زیادہ پسند نہیں تھا۔ دونوں اس سے بحث کرنے لگتیں۔ شروع شروع میں تو اس نے خود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بڑی دلیلیں دیں لیکن بعد میں الجھنا اور بحث کرنا چھوڑ دیا۔ نائلہ ان دونوں کی بحث میں بہت کم حصہ لیتی۔ ایک بحث تو نائلہ کی ماں سے ہوتی تھی اور شیبان کو اس سے کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا تھا لیکن ایک بحث دل کے اندر جاری تھی۔ نفسِ امّارہ اور نفسِ لوّامہ برسرِ پیکار تھے۔ نفسِ امّارہ کہتا۔ "نائلہ کی ماں ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ ہر چیز اعتدال میں ہو تو اچھی لگتی ہے نہ افراط اچھی ہے نہ تفریط۔"

اسے رسول اللہ کا قول یاد آیا۔ "خیرالامور اوسطہا درمیانہ روی سب سے بہتر ہے۔"
لیکن نفس لوّامہ کہتا۔ "یہ خیرالامور اوسطہا پہلے کیوں نہیں یاد آیا تھا۔ نائلہ کو دیکھ کر کیوں یاد آیا؟"

نفسِ امّارہ ترغیب دیتا۔ "یہ دنیا اور اس کے متعلقات یوں ہی نہیں پیدا کئے گئے ہیں، یہ انسان کے لئے ہیں، آدمی کو ان سے حظ اٹھانا چاہیئے۔ لطف اندوز ہونا چاہیئے۔"
لیکن کمزور نفس مزاحمت کرتا، کہتا۔ "شیبان! تو غلط راہ پر جا رہا ہے تو دنیا کی طرف لوٹ رہا ہے۔"

ان جارحانہ اور مدافعانہ سوچوں کی کشمکش نے اسے ہلکان کر دیا۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھتا۔ "میرے رہبر! تمہارے اس قول کی صداقت آہستہ آہستہ آج ظاہر ہو رہی ہے

کہ عورتوں سے حذر کرو۔ آؤ دیکھو نائلہ نے مجھے کتنا اداس اور بدحواس کر دیا ہے۔ میری لذّت آہ وزاری چھین لی ہے۔ میرے دل میں ایک اور ہی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ میرا دل اب خلوتوں میں محض اللہ اللہ ہی نہیں کرتا، بلکہ اب وہاں سے نائلہ نائلہ کی آوازیں آنے لگی ہیں معلوم نہیں میرا انجام کیا ہوگا؟"

اس کشمکش میں جب ایک شخص اس کے پاس اس لئے آیا کہ شیبان اسے کچھ نصیحتیں کرے اور بتائے کہ وہ کس طرح اس دنیا سے پیچھا چھڑا کر محض اللہ کا ہو رہے تو اس نے اس کو منع کیا، بولا۔ "اے شخص! واپس جا، دنیا تیرا انتظار کر رہی ہے یہ راہ، جس پر میں چل رہا ہوں، بڑی کٹھن ہے اور شاید بے مزہ بھی۔ اپنی زندگی برباد نہ کر۔ میری جیسی زندگی ہر کسی کو راس نہیں آتی۔"

اس کا ارادت مند اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ شیبان نے مزید کہا۔ "یہ تو میری شکل کیا دیکھ رہا ہے، میں کیا کہہ رہا ہوں، غور سے سن، اپنی عمر اور زندگی کو خواہ مخواہ ضائع نہ کر۔ میں عبادت سے منع نہیں کرتا لیکن اس کی زیادتی سے منع کرتا ہوں جس طرح دولت کی زیادتی چوروں کا ڈر پیدا کر دیتی ہے، اسی طرح زہد و تقوے کی زیادتی شیطان کا ڈر پیدا کر دیتی ہے۔ آج کل میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں۔ ایک عذاب ہے جسے جھیل رہا ہوں اور اپنے تجربات کی روشنی میں تجھے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ قناعت اختیار کر، ہر قسم کی قناعت! مال و زر کی قناعت، زہد و تقوے کی قناعت، جو کچھ حاصل ہے اسی پر قناعت کر، ورنہ زندگی عذاب ہو جائے گی۔"

اس گفتگو کے دوران میں نائلہ آ گئی، بولی۔ "ماں نے کہا ہے کہ باہر سے آنے جانے میں بڑی زحمت ہوتی ہے، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ اپنی کٹیا کے عقب میں ایک دروازہ کھول لیں تاکہ آنے جانے میں آسانی رہے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "بیشک، بیشک۔ تو ٹھیک کہتی ہے۔"

اس کے ارادت مند نے نائلہ کے قیامت خیز حسن کو دیکھ کر شیبان کی باتوں کا لبّ لباب سمجھ لیا۔ اس نے جاتے جاتے طنزاً کہا۔ "صوفی! جس عذاب کا تو نے ذکر کیا تھا، اسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اب شاید یہ کٹیا اس لائق نہیں رہی کہ لوگ یہاں سے زہد و تقوے کا درس لے کر جائیں۔"

ارادت مند چلا گیا لیکن جاتے جاتے شیبان کو وہ ضرب لگائی کہ وہ بڑی دیر تک تلملاتا رہا۔ اس کے جاتے ہی نائلہ نے پوچھا۔ "یہ شخص کیا کہتا تھا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "اللہ سے ملنے کا درس لینے آیا تھا، وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ خدا کو کس طرح تلاش کرے، میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ اسے تو ابھی تک میں خود بھی نہیں پا سکا، پھر تجھے اس کا کیا پتہ بتاؤں، جا اپنا کام کر، اور ایک ایسے کام میں اپنی عمرِ عزیز ضائع نہ کر، جس کا صلہ یقینی نہ ہو۔"

نائلہ نے شوخی سے کہا۔ "اب آپ باتیں بڑی اچھی کرنے لگے ہیں۔"

شیبان نے بھی شوخی سے کام لینا چاہا، بولا۔ "نائلہ! یہ سب کچھ تیری بدولت ہو رہا ہے۔"

نائلہ نے پوچھا۔ "کیا سچ مچ؟"

شیبان نے افسردگی سے گردن جھکا لی، بولا۔ "نائلہ! میں ایک بدنصیب انسان ہوں، اور اس وقت میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں جس کے ایک طرف سنسان اور ویران سڑک ہے جب میں اس سڑک پر دور تک کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو کچھ نظر ہی نہیں آتا، اس راہ کے پیشوا دعویٰ یہ بتاتے گئے ہیں کہ اگر اس پر یک سوئی اور اعتماد سے چلتے رہو تو ایک نہ ایک دن کسی ایسی منزل پر ضرور پہنچ جاؤ گے جہاں قربِ الٰہی حاصل ہو جائے گا اور اس دوراہے کی دوسری سڑک دنیا کی طرف لے جاتی ہے جس پر بلا کی چہل پہل ہے، رونقیں ہیں دلچسپیاں ہیں اس سڑک پر ساری دنیا چل رہی ہے اور یہاں جو کچھ ہے یقینی ہے، قطعی ہے، جبکہ دوسری طرف جو کچھ ہے غیر یقینی اور مشتبہ ہے معلوم نہیں کیوں، ادھر کچھ دنوں سے یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا میں نے اپنے لئے صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے؟"

نائلہ نے بے چینی سے سوال کیا۔ "پھر اس کا کیا جواب ملا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "ابھی کوئی جواب نہیں ملا، اندر ایک جنگ جاری ہے۔ معلوم نہیں اس کا کیا جواب ملے۔"

نائلہ نے کہا "میں زیادہ گہرائی میں تو نہیں جا سکتی لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ آدمی کو بالکل جنگلی نہیں ہونا چاہیئے۔"

شیبان کو نائلہ کی بات سے دکھ پہنچا، نائلہ زہد و تقوے کو اتنا برا سمجھتی ہے! اس نے کہا۔ "نائلہ! کیا میں تجھے جنگلی دکھائی دیتا ہوں؟ کیا میں انسان نہیں نظر آتا؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "یہ بات نہیں ہے، بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ کو دین اور دنیا کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہیئے۔ ذرا سوچئے تو اگر پوری دنیا آپ کی اتباع میں دنیا کو ترک کر دے تو دنیا کا حال کیا ہو جائے؟ دنیا کی ترقی رک جائے اور دنیا کی ساری چہل پہل ختم ہو جائے۔ جدو

جہد اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا رجحان ہی ختم ہو جائے۔"

شیبان نے عاجز آ کر کہا۔ "نائلہ! میں تجھ سے بحث نہیں کروں گا۔ ہو سکتا ہے تو ٹھیک کہتی ہو لیکن میں اپنی اس زندگی کو ترک نہیں کر سکتا، میں نے یہ زندگی طمانیت اور سکون کی خاطر اختیار کی ہے۔"

نائلہ نے لاپروائی سے کہا۔ "آپ کی مرضی، آپ کو کوئی مجبور تو کر نہیں سکتا۔"

شیبان کو حیرت تھی کہ اس کے پاس نائلہ تنہا کیوں آجاتی ہے اور اس کی ماں اس کی اجازت کیوں دے دیتی ہے۔ اس نے کہا۔ "نائلہ! تیری ماں کہاں ہے؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "گھر میں۔ آج کل وہ بہت اداس رہتی ہیں، انہیں اس ویرانے میں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، ہر وقت بابا کی واپسی کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں۔"

شیبان نے پس وپیش سے پوچھا۔ "تجھ سے ایک سوال کروں نائلہ؟"

"ضرور کیجئے۔ میں نے منع کب کیا ہے؟"

شیبان نے کہا۔ "تیری ماں میرے جیسے مجرّد کے پاس تنہائی میں تجھے بھیج کیوں دیتی ہے؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "صرف اس لئے کہ وہ آپ کو ایک دیانتدار انسان سمجھتی ہیں اور انہیں یقین ہے کہ آپ سے کوئی نازیبا حرکت سرزد نہیں ہو سکتی۔"

شیبان ایک دم سنبھل گیا۔ وہ اپنے دل کے چور سے گھبرا رہا تھا، معلوم نہیں کب یہ چور کوئی ہنگامہ برپا کر دے۔ وہ اپنے دل کی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھا، جب اسے نائلہ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ اس پر اس کی ماں اندھا اعتقاد رکھتی ہے تو وہ سنبھل گیا اور اس نے نائلہ کے بارے میں احتیاط کی روش اختیار کی لیکن اب اسے ہر محاذ پر شکست ہو چکی تھی۔

کٹیا کے اندر ایک چھوٹا سا در پیدا کر کے ایک نئی راہ آمد ورفت قائم کر لی گئی۔ اس راستے سے وہ خود برائے نام جاتا لیکن نائلہ اور کبھی اس کی ماں برابر آتی جاتی رہتیں۔ اب شیبان کی نمازیں بھی قضا ہونے لگیں۔ تہجد کی پابندی بھی ختم ہو گئی، جب کبھی وہ اپنی پچھلی زندگی کا اس زندگی سے موازنہ کرتا تو اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی۔ نائلہ نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا اور اب بھی معلوم نہیں کس گھات یا کس تاک میں تھی۔

ایک دن وہ اتنا گھبرایا کہ اس نے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھ کر تہجد ادا کرنے کا مستقل ارادہ کر لیا۔ اس رات جب نائلہ اور اس کی ماں اس کی کٹیا میں داخل ہوئیں تو وہ ان دونوں سے بالکل نہیں بولا۔ وہ دونوں اس کی چٹائی پر بیٹھ گئیں۔ شیبان ان کی موجودگی کو

نظر انداز کر کے وضو کرنے لگا۔

نائلہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے آپ چپ چپ کیوں ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

شیبان نے مختصر جواب دیا۔ "ٹھیک ہوں تہجد پڑھنے جا رہا ہوں۔"

نائلہ کی ماں نے کہا۔ "ہم دونوں تو آپ کے پاس باتیں کرنے آئے تھے۔"

شیبان کچھ بھی نہ بولا، بس وضو کرتا رہا۔ وضو کر چکنے کے بعد وہ مصلّے پر آن کھڑا ہوا۔

نائلہ نے پوچھا۔ "بیٹھوں یا چلی جاؤں؟"

شیبان نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

اس بار نائلہ کی ماں نے کہا۔ "آخر آپ بول کیوں نہیں رہے؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

شیبان پھر بھی چپ رہا اور مصلّے پر نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

نائلہ کی ماں نے بدمزگی سے کہا۔ "یہ انہیں ہو کیا گیا ہے؟ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے گویا ان پر کسی قسم کا دورہ پڑ گیا ہے۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "نہیں، میرا خیال ہے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

ماں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تب پھر ہمارا بیٹھنا بیکار ہے۔ چلو چل کر آرام کریں۔"

نائلہ نے کہا۔ "اگر آپ آرام کرنا چاہتی ہیں تو شوق سے آرام کریں لیکن میں ابھی تھوڑی دیر بیٹھوں گی۔"

ماں نے جاتے ہوتے کہا۔ "اچھا میں تو چلتی ہوں لیکن تو بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گی۔"

شیبان ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا جس سے اس کی یکسوئی اور خشوع و خضوع میں فرق آ رہا تھا، لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ماں جا چکی ہے اور نائلہ تنہا بیٹھی اس کی منتظر ہے تو اندر ایک بھونچال سا آ گیا۔ جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی اور ایک پر لطف اور لذیذ بے چینی پیدا ہو گئی۔ اب اس سے تہجد بھی نہیں پڑھی جا رہی تھی بمشکل آٹھ رکعت پڑھ سکا اور سلام پھیر کر نائلہ کی طرف مڑ گیا، نائلہ اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی، دونوں کی نظریں جو ملیں تو دونوں ہی ایک ساتھ مسکرا دیئے، نائلہ نے پوچھا۔ "ابھی کتنی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا؟ بیٹھوں یا جاؤں؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "بس ذرا دیر اور، میں ابھی فارغ ہوا جاتا ہے۔"

نائلہ نے کہا۔ "اگر اب آپ نے ذرا دیر اور لگائی تو میں سونے چلی جاؤں گی۔"

شیبان نے کھڑے ہو کر نیت باندھتے ہوتے کہا۔ "بس ابھی آیا۔ تو ابھی جاتے

کی نہیں، سمجھی!"
اس کے بعد وہ نماز پڑھنے لگا اور نائلہ جماہیاں لینے لگی۔
حسبِ وعدہ دو رکعت کے بعد شیبان نماز سے فارغ ہو گیا اور دعا مانگ کر نائلہ کے پاس آگیا۔ آتے ہی پوچھا۔ "کیا بات ہے نائلہ؟ تجھے نیند کیوں نہیں آرہی؟"
نائلہ نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں آپ سے سچ نہیں بول سکتی۔ دراصل اپنے سچ سے میں ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ آپ کو ناراض نہ کردے۔"
شیبان کا دل دھک دھک کرنے لگا، بولا۔ "نہیں نائلہ، تو مجھ سے مت ڈر اور جو بات ہے سچ سچ کہہ دے۔"
نائلہ نے پوچھا۔ "آپ خدا شناسی میں تو زندگی بتلاتے دے رہے ہیں لیکن انسان شناسی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور اسے میں اپنی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہوں؟"
شیبان نے خوشامد کی۔ "نائلہ! تو اپنے دل کی ہر بات بے تکلفی سے کہہ سکتی ہے میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔"
نائلہ نے کہا۔ "میں آپ کے پاس کیوں آتی ہوں، کبھی اس پر بھی غور کیا آپ نے؟"
شیبان نے جواب دیا۔ "میں نے اسے کبھی اس لائق ہی نہیں سمجھا کہ اس پر غور کروں۔"
نائلہ نے آزردگی سے کہا۔ "وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ ویرانے کی زندگی نے آپ کو اس لائق ہی نہیں رکھا کہ آپ ان چھوٹی چھوٹی مگر بڑی معنی خیز باتوں پر غور کر سکیں۔ اس وقت تو میں چند باتیں کر کے چلی جاؤں گی لیکن آپ سے یہ کہتی جاؤں گی کہ آپ مجھ پر غور کریں، میری ایک ایک بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"
شیبان نے جواب دیا۔ "اگر تو کہتی ہے تو میں ان باتوں پر غور کروں گا اور تجھے سمجھنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر تو اشاروں میں بھی اپنا مفہوم واضح کر دے تو میں تیرا شکر گزار ہوں گا"
نائلہ نے کہا۔ "بس چلتے چلتے میں ایک بات کہہ جاؤں گی، اگر اس کے بعد بھی میری باتیں آپ کی سمجھ میں نہ آئیں تو میں آپ کی عقل اور ذہانت پر فاتحہ پڑھ لوں گی۔"
شیبان نے بے چینی سے کہا۔ "تو کچھ کہہ تو سہی۔ اب میں اتنا ناسمجھ بھی نہیں ہوں کہ تیری کوئی بات بھی نہ سمجھ سکوں۔"
نائلہ نے آہستہ آہستہ بڑے کرب سے کہا۔ "میں آپ کے پاس آتی ہوں اور گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی ہوں، میری ماں کو اسی پر اعتراض ہے وہ کہتی ہیں کہ جب بادا آئیں

گے اور میرے معمولات دیکھیں گے تو انہیں سخت غصہ آئے گا۔ میری ماں کہتی ہیں کہ ایک خشک زاہد کے پاس ہے ہی کیا جو کوئی اس سے دل لگائے لیکن میں یہ جواب دیتی ہوں کہ زاہد خشک کے پاس اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن دیانت، بھولپن، سچائی، نیکی اور تقویٰ تو ہے اور جس کے پاس یہ چیزیں ہوں، اُسے اور کیا چاہیئے۔"

شیبان دَرپَردہ اپنی تعریفیں سن سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ پوچھا۔ "پھر تیری ماں نے کیا کہا؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "وہ کیا کہتیں، مجبور ہو گئیں، بولیں۔ نائلہ! تو جان اور تیرا کام جانے۔ میں تیرے معاملوں میں دخل نہیں دوں گی جو تیرے دل میں آئے کرتی رہ۔"

شیبان نے ہنس کر کہا۔ "نائلہ! بخدا تو بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہے۔ میری طبیعت خوش کر دی۔"

نائلہ چپ ہو گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شیبان بالکل اس کے قریب چلا گیا، بولا۔ "انہوں نے اور کیا کہا؟ سننے میں آیا ہے کہ.."

نائلہ نے بات کاٹ دی، بولی۔ "وہ اور کیا کہتیں! بس ہر وقت یہی کہتی رہتی ہیں کہ شیبان ابھی بالکل خام مال کی طرح ہے اس میں وہ مضبوطی اور پختگی نہیں ہے جو اس عمر کے نوجوان میں ہونا چاہیئے۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ کبھی کبھی آپ پر کسی قسم کا دورہ بھی پڑ جاتا ہے اور آپ گفت و شنید بند کر کے اپنے کاموں میں منہمک ہو جاتے ہیں۔"

شیبان نے ذرا رُک کر جواب دیا۔ "نائلہ! یہ مجھ پر تہمت ہے کہ میں آدم بیزار ہوں، یہ بھی تہمت ہے کہ میں کسی ایسی بیماری کا شکار ہوں، جس میں انسان پر دورے پڑنے لگتے ہیں لیکن خود تو دیکھ لے کہ میں کس بیماری میں مبتلا ہوں، بات صرف اتنی سی ہے کہ میں جب بھی خدا کے دربار میں جانے والا ہوتا ہوں تو دنیا کے کسی بھی آدمی کی پرواہ نہیں کرتا، یہی صورتِ حال آج بھی پیش آئی اور میں نے تم دونوں کو نظر انداز کر دیا۔"

نائلہ نے کہا۔ "میں اس فضول بحث کو نہیں چھیڑتی۔ میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گی کہ کسی نوجوان کو یہ بات نہیں زیب دیتی کہ وہ کسی لڑکی سے اظہارِ محبت کی توقع کرے پہل عموماً مرد ہی کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن اس لڑکی کی بے بسی تو ملاحظہ کیجئے جس کو کوئی مرد اظہارِ عشق پر مجبور کر رہا ہو۔"

شیبان کا سر چکرا گیا، بات صاف ہوتی جا رہی تھی لیکن شیبان میں اب بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ نائلہ کے سامنے اس طرح کھل کر بات کر سکتا۔ اس کی زبان میں اب بھی

لکنت بھی۔ اس کا گلا بدستور رندھا ہوا تھا، اس کی قوتِ گویائی بدستور سلب تھی۔ نائلہ نے کچھ دیر تو جواب کا انتظار کیا لیکن جب کوئی جواب نہیں ملا، تو مایوسی سے کہنے لگی۔ "حالات ایسے ہیں کہ پتہ نہیں ہمیں یہاں سے کب جانا پڑ جائے، ماں یہاں سے بیزار ہیں اگر بادانہ بھی آتے، ماں تب بھی چلی جائیں گی۔ آپ اس مل بیٹھنے کو ذرا بھی غنیمت نہیں سمجھتے؟"

شیبان نے رُک رُک کر کہا۔ "نائلہ! جیسا کہ تو نے مجھے بتایا کہ تیری ماں مجھے سچا، دیانتدار، نیک اور متقی سمجھتی ہے، میں ایک محترم انسان ہوں، ہو سکتا ہے میں محترم نہ ہوں لیکن کم از کم لوگ مجھے ایسا سمجھتے تو ہیں، میں محترم بن کر ایک عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں، دل آرزوؤں اور تمناؤں سے پُر ہے لیکن لوگوں کے احترام نے اُسے سربمہر کر دیا ہے، اب میں اپنے دل کی بات کسی سے اگر کہنا بھی چاہوں تو نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میں محترم ہوں اور ایک محترم کو اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔"

نائلہ نے جزبز ہو کر کہا۔ "یہاں کون سی دنیا بیٹھی ہے، یہاں میں ہوں یا آپ ہیں، میں آپ کو محترم کے علاوہ بھی کچھ سمجھتی ہوں، اگر کوئی بات آپ زور سے نہیں کہہ سکتے یا زور سے کہتے ہوئے شرماتے ہیں تو میرے کان ہی میں کہہ دیجئے۔"

شیبان نے نائلہ کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کہہ دوں؟"

نائلہ نے کہا۔ "بالکل، یہ تامل کیوں؟"

شیبان نے شرماتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں، میں جب بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، میری قوتِ گویائی جواب دے جاتی ہے۔"

نائلہ نے کہا۔ "ہمت کیجئے، بہادر بنئے، یہ بزدلی ہے کہ آدمی اپنے دل کی بات کرتے ہوئے بھی ڈرے۔"

شیبان نے کپکپاتے ہاتھوں کو نائلہ کی طرف بڑھا دیا، بولا۔ "نائلہ! واللہ وہ تو ہی ہے جس نے میرے اور خدا کے درمیان کھڑے ہو کر ایک دیوار سی حائل کر دی ہے اور وہ تو ہی ہے جس نے پہلی بار مجھے ایک ایسی لذت سے آشنا کیا، جس سے اچھی کوئی اور لذت نہیں، نائلہ میرے نہاں خانۂ دل میں خدا کے ساتھ ہی ایک بت بھی موجود ہے اور وہ بت ہے تیری ذات۔"

نائلہ نے کسی قدر شرما کر سر جھکا لیا۔ شیبان پھر بولا۔ "تو نہیں جانتی نائلہ کہ جب سے میں نے تجھے دیکھا ہے، مجھ میں زبردست انقلاب آ گیا ہے۔ نائلہ! میں تجھے یہ بات کس طرح بتاؤں کہ تیرے بغیر میرا کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا۔"

نائلہ نے شوخی سے کہا۔ "اپنے تقوے کا خیال کیجئے اور اتنا بڑا جھوٹ نہ بولیئے۔ آپ مجھے کیوں یاد کرنے لگے، آپ تو خدا کی تلاش میں سکون حاصل کر چکے ہیں لیکن میں کیا کروں؟ میں تو عبادت ہی کو ایک رسمی سی چیز سمجھنے لگی ہوں۔"

شیبان نے دونوں گال تھپتھپاتے، بولا۔ "نائلہ! توبہ کر توبہ! یہ تو کیا کہہ رہی ہے عبادت کو ایک رسمی چیز کہہ رہی ہے تجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "ہر وہ کام رسمی ہو جاتا ہے جو عادتاً کیا جائے اور جس میں عقل نہ استعمال کی جائے۔"

اگر کوئی دوسرا یہی بات کہتا تو شیبان اس پر برس پڑتا لیکن نائلہ اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ بات ٹالتا ہوا بولا۔ "خیر اب اس موضوع کو بند کر۔ میں تجھ سے الجھنا نہیں چاہتا اب یہ بتا کہ ہم دونوں کا ہوگا کیا؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "آپ تو منازلِ سلوک طے کرتے رہیں گے اور میں اپنی ماں کے ساتھ یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

شیبان نے اپنا سر پکڑ لیا، بولا۔ "میرے لئے یہ خیال ہی سوہانِ روح بنا ہوا ہے کہ تو ایک نہ ایک دن مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی اور میں تنہا رہ جاؤں گا۔"

"اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو اس کا کوئی علاج کریں۔"

"بتا، کیا علاج کروں؟"

"یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے، میری ماں موجود ہے، اس سے بات کر لیجئے۔"

شیبان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں تیری ماں سے بات کروں؟ کیا بات کروں؟"

نائلہ کو غصہ آ گیا، جھنجھلا کر بولی۔ "یعنی ابھی تک آپ کا دل گو مگو کی حالت میں ہے اور آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا بات کی جاتی ہے۔"

شیبان نے کہا۔ "نائلہ! میں دنیا سے ایک کٹا ہوا انسان ہوں۔ میں دنیا والوں کے آداب اور رسوم بھی بھول گیا اور ایک یہ بات بھی ہے کہ میں تیری ماں سے جس موضوع پر بات کروں گا، کیا وہ سن کر سناٹے میں نہیں آ جائے گی؟ کیا وہ مجھ پر ہنسے گی نہیں؟ یہی سوچ سوچ کر میں پریشان ہو رہا ہوں، خدا مجھ پر رحم کرے۔"

نائلہ نے افسوس کیا۔ "تب پھر قصہ ختم سمجھئے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ واپس چلی جاؤں گی۔"

شیبان نے خوشامد کی۔ "نائلہ! مجھے خوفزدہ نہ کر۔ کچھ سوچنے کا موقع دے۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "سوچ لیجئے لیکن سوچنے میں اتنا وقت نہ گزار دیجئے گا کہ میں یہاں سے چلی جاؤں اور آپ سوچتے ہی رہ جائیں۔"

شیبان نے عاجزی سے کہا۔ "نائلہ! مجھے خوفزدہ نہ کر۔ مجھے دو دن سوچنے کا موقع دے۔"

دوسری طرف سے نائلہ کی ماں بھی آگئی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی بولی "یہ اتنی رات گئے تم ان سے کیا باتیں کر رہی ہو؟"

نائلہ نے گھبرا کر جواب دیا۔ "میں آنے ہی والی تھی ماں، میں اٹھنے ہی والی تھی۔"

ماں نے نائلہ کو سمجھایا۔ "نائلہ! میں جانتی ہوں کہ یہ ویرانہ ہے اور یہاں روک ٹوک اور طنز و طعن کرنے والے نہیں ہیں لیکن میں تو موجود ہوں اور تیرے باپ کے سامنے جواب دہ بھی ہوں، اس لئے میرا مشورہ ہے کہ تو احتیاط کر اور یہاں خلوت میں زیادہ وقت نہ دیا کر۔"

شیبان کے دل پر چوٹ سی لگی کہ نائلہ کی ماں یہ این زہد و تقویٰ اس پر اعتبار نہیں کر رہی ہے۔

ماں نائلہ کو لے کر چلی گئی اور وہ جس انداز میں لے گئی تھی، اس میں جھنجھلاہٹ تھی، غصہ تھا، برہمی تھی، ناراضی اور عدم اعتمادی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیبان کا حساس دل اس سے خاصا متاثر اور غمگین ہوا۔ وہ غمزدہ چٹائی پر لیٹ گیا، لیکن اس وقت اس کے سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی، اس آگ میں یہ غم بھی شامل تھا کہ نائلہ زبردستی لے جائی گئی ہے اور یہ غم بھی کہ نائلہ کی ماں شیبان پر اعتماد نہیں کرتی اور شاید وہ نائلہ کو نہ حاصل کر سکے۔

اس نے پوری رات کروٹیں بدل بدل کر کاٹ دی۔ اس کے دل میں کسک ہو رہی تھی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور نائلہ کے تصور کے ساتھ میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا، مستقبل میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ پوری رات کروٹیں بدلنے کے بعد اس نے علی الصباح بستر چھوڑ دیا، وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد وہ بے قصد و بے ارادہ کوہستانی سلسلوں میں نکل گیا۔ وہ سیبوں کے باغ میں گھس گیا، اس باغ میں وہ مزدوری کر چکا تھا۔ باغ کے مالک نے جب شیبان کو باغ میں داخل ہوتے دیکھا ، تو بہت خوش ہوا کیونکہ وہ شیبان کے زہد و تقوے سے بہت متاثر تھا۔ شیبان نے باغ کے مالک کو نہیں دیکھا ، اس لئے وہ ایک درخت کی جڑیں تنے سے پیٹ لگا کر بیٹھ گیا اور نائلہ کی آمد کے بعد پیش آنے والے واقعات

پر غور کرنے لگا۔ اسے اپنی حالت پر بڑا رونا آیا۔ نائلہ نے اس کو کہیں کا بھی نہ رکھا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے گڑگڑایا اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ اس کے دل سے نائلہ کی محبت زائل کر دے۔ وہ تصوّف کو نہیں ترک کر سکتا تھا بلکہ تصوف کی خاطر نائلہ کو چھوڑ سکتا تھا۔

باغ کا مالک اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا اور اس کی حالت زار پر غور کرتا رہا۔ اچانک شیبان کو بھی یہ احساس ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور باغ کے مالک کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ باغ کے مالک نے اسے زبردستی بٹھا دینا چاہا اور پوچھا۔ "حضرت میرے لائق کوئی خدمت ؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میرے بھائی! تو ذرا یہ تو بتا کہ تجرّد بہتر ہے یا تاہل ؟"

باغ کا مالک اس سوال پر چکرا گیا، بولا۔ "حضرت! آج آپ یہ کیسا سوال کر رہے ہیں ؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

شیبان نے جواب دیا۔ "میرے دوست، میرے ساتھی! میں پوچھ رہا ہوں کہ تاہل بہتر ہے یا تجرّد ؟"

باغ کے مالک کو شبہ گزرا کہ شاید شیبان کا دماغ چل گیا ہے ورنہ ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتا۔

وہ کچھ دیر باغ ہی میں رہا۔ باغ کے اس سنّاٹے میں بھی نائلہ کی یاد نے کروٹ لی اور وہ آہستہ آہستہ اس کا نام لے کر لطف و لذت حاصل کرنے لگا۔ دوپہر کے بعد وہ باغ سے بھی نکل گیا اور بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ شام سے ذرا پہلے اپنی کٹیا میں داخل ہوا۔ یہاں اس کے ارادت مندوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ ہجوم اسے دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ شیبان نے ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پوچھا۔ "تم لوگ کیوں آئے ہو ؟"

ہجوم نے جواب دیا۔ "آپ کی دعاؤں اور زیارت کے لئے۔"

شیبان کچھ دیر کے لئے ان سب کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔ "تم سب آج مجھے جی بھر کے دیکھ لو، ___ مجھے شبہ ہے کہ شاید آج کے بعد میں تمہیں نہ نظر آؤں، رہا دعا کا مسئلہ تو میں جہاں کہیں بھی ہوں گا تمہیں دعائیں دیتا رہوں گا!"

اس وقت نائلہ اپنے گھر سے نکلی اور ہجوم کے بیچ سے گزر کر کٹیا کے در پر آ کھڑی ہوئی اور تحکمانہ شان سے شیبان سے پوچھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں ؟ کیا مجھے چھوڑ کر ؟ یہ کس طرح ممکن ہے ؟"

شیبان نائلہ کو دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اسے اپنے ارادے میں تزلزل محسوس

ہوا۔ ہجوم نے نائلہ کو عجیب شک و شبہے سے دیکھا۔ شیبان نے گھبرا کر جواب دیا۔ "نائلہ! اس وقت تو یہاں کیا لینے آئی ہے؟ کیا یہاں آنے سے پہلے اپنی ماں سے اجازت لے لی تھی؟ یا خودسری سے چلی آئی؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "جناب والا! میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور میں نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ آپ کے معاملے میں ان کا کوئی حکم بھی نہ مانوں گی۔"

شیبان نے آہستہ سے پوچھا۔ "اور اپنے باپ کو کیا جواب دے گی؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "جواب دینا میرا کام ہے، میں کوئی اچھا سا جواب بابا کو بھی دے لوں گی۔"

ہجوم نائلہ کو دیکھ کر کسی اور ہی شک و شبہے میں پڑ گیا۔ شیبان بھی ہجوم کے شک و شبہے کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے نائلہ سے کہا۔ "نائلہ! تو اندر چلی جا، میں ابھی آتا ہوں۔"

نائلہ اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شیبان نے ہجوم سے پوچھا۔ "کیا تم لوگوں نے میرا دیدار کر لیا؟"

چند نوجوان ارادت مندوں نے طنزاً کہا۔ "دیدار کر لیا نہ صرف آپ کا، بلکہ آپ کی ان کا بھی۔"

شیبان کے پاؤں میں لرزش آگئی لیکن وہ ہمت کئے کھڑا رہا۔

کسی نے ہجوم سے کہا۔ "یارو! تم کس کی بات کر رہے ہو؟ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ یہ پیر آج کل اس لڑکی کے عشق میں مبتلا اپنے اللہ کے بجائے اس لڑکی کی تابعداری کر رہا ہے۔"

کسی طرف سے اور آواز آئی۔ "اللہ رحم کرے اور اسے اور اس کے تقوے کو اپنی پناہ میں رکھے۔"

لیکن کسی ارادت مند نے ان دونوں کو ڈانٹ دیا۔ "ظالمو! خدا کے غضب سے ڈرو اور اس بزرگ نوجوان پر کوئی ایسی تہمت نہ لگاؤ جس کے بارے میں تم کوئی بات یقین اور اعتماد سے نہ کہہ سکو۔"

شیبان کو ان آوازوں نے اور زیادہ دل برداشتہ کر دیا۔ ہجوم سے کہا۔ "لوگو میں ایک عاجز و درماندہ انسان ہوں اور میں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں کوئی بڑا متقی اور دین دار ہوں۔ میں تو ایک گناہگار انسان ہوں اور میری آپ سب سے یہ درخواست ہے کہ خدا کے لئے میرا تعاقب نہ کریں، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

یہ کہہ کر شیبان اندر چلا گیا۔ ہجوم کچھ دیر تو وہیں کھڑا رہا لیکن پھر منتشر

ہونے لگا۔

اندر جاتے ہی وہ نائلہ پر برس پڑا، بولا۔ "یہ تو نے کیا کیا نائلہ؟ اگر تجھے میری کٹیا میں آنا ہی تھا تو عقبی راستے سے آ گئی ہوتی۔ تو نے سامنے سے آکر بہت برا کیا۔ اب میں تیرے اور اپنے رشتے پر کس طرح غور کروں گا؟ میں بہت پریشان اور دل برداشتہ ہوں۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "اگر نادانستگی میں، میں نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے تو اس کی معافی چاہتی ہوں لیکن آپ کے ارادت مندوں کو بھی اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہیئے تھیں۔"

شیبان نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں تجھے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ایک محترم انسان ہوں، لیکن جب لوگوں کا جذبۂ احترام کسی طرح مجروح ہو جاتا ہے تو وہ اسی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

نائلہ نے سہم کر وعدہ کیا۔ "اب میں ان باتوں کا خیال رکھوں گی۔ مجھے اپنی غلطی پر افسوس ہے۔"

شیبان نے پوچھا۔ "تیری ماں کہاں ہے؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "گھر میں، اندر موجود ہیں۔"

شیبان نے کہا۔ "میرے خلوت کدے میں آنے پر تیری ماں کو اعتراض ہوتا ہے اس لئے تو یہاں نہ آیا کر۔"

نائلہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ "اگر آپ کو میرا آنا ناگوار گزرتا ہے تو میں جاتی ہوں اور اب کبھی نہیں آؤں گی۔"

شیبان نے نرمی سے جواب دیا۔ "ناگوار مجھے نہیں تیری ماں کو گزرتا ہے۔"

نائلہ نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "آپ خود تو میری طرف آتے نہیں، مجھے ہی آنا پڑتا ہے، اب آج سے نہیں آؤں گی۔"

شیبان کی مرضی یہی تھی کہ نائلہ چلی جاتے، لیکن جب نائلہ بگڑ کر چلی گئی تو اسے اپنے آپ پر اور ساتھ ہی ہجوم کے ان لوگوں پر بڑا غصہ آیا، جنہوں نے نائلہ اور خود اس پر فقرے بازیاں کی تھیں۔ اسے اپنی قابل احترام ذات سے نفرت ہونے لگی۔ وہ سوچتا، دنیا میں کوئی کچھ کرے، لوگ اس پر ہجوم کی شکل میں معترض نہیں ہوتے لیکن ایک صوفی کا کیا گناہ ہوتا ہے کہ لوگ ہجوم در ہجوم انگشت نمایاں کرنے لگتے ہیں۔ اسے تصوف سے چڑ ہونے لگی لیکن دوسرے ہی لمحے کسی نے دل میں کہا۔ "شیبان! بات وہ نہیں ہے جو تو سوچ رہا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ

ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے اور شاید خدا یہ نہیں چاہتا کہ تیری عبادت اور ریاضت نائلہ کے ذریعے خاک میں مل جائے۔ اس طرح خدا تجھ کو تنبیہ کر رہا ہے۔"

شیبان جس ذہنی ابتلا اور آزمائش میں پھنسا ہوا تھا، اس نے دل ودماغ پر ایک تاریکی سی مسلط کر دی تھی، وہ اپنی کٹیا سے نکل کر قاسیون کی پہاڑیوں میں ایک ایسی کھوہ تلاش کرنے لگا، جس میں وہ یکسوئی سے مراقبہ کر سکتا۔ وہ نائلہ سے اس صورت میں بچ سکتا تھا کہ یا تو نائلہ چلی جاتے اور نائلہ نہیں جاتی تو وہ خود کہیں روپوش ہو جائے۔ یہ دوسری صورت اختیاری تھی اس لئے اس نے اس پر کاربند ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ یکسوئی مراقبے کے لئے کسی گوشے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ یہیں مغارۃ الدّم نامی غار بھی ہے۔ کہتے ہیں دنیا کا پہلا قتل یہیں ہوا تھا اور قابیل نے ہابیل کا خون اسی غار میں بہایا تھا۔ وہ مغارۃ الدّم میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک پہاڑی چٹان پر خون کا سیاہ دھبہ اب بھی موجود تھا اور یہیں ایک بہت بڑا پتھر ہے جس سے ہابیل ہلاک کیا گیا تھا۔ شیبان خون کے دھبے اور پتھر کے درمیان بیٹھ کر روتے لگا۔ وہ بڑی رقت سے کہہ رہا تھا۔ "افسوس کہ انسان مظلوماً جہولا ہے۔ یہ اپنے آپ پر خود ظلم کرتا ہے۔"

اس کے بعد وہ اس غار میں رہنے لگا اور کٹیا واپس جانے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ نائلہ اس پر جو وبال لا رہی تھی شیبان اس سے کانپ رہا تھا، وہ اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتا کہ آخر اسے ہو کیا گیا تھا، اسے پہلے کیوں نہیں ہوش آیا۔ وہ مغارۃ الدّم میں پوری دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ یہاں اسے بہت زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی، ایک ایسی خوشی جو کسی انسان کو چوروں اور لٹیروں سے اپنا مال وزر بچا کے حاصل ہوتی ہے۔

دس دن تک وہ مغارۃ الدّم ہی میں روپوش رہا، پیاس لگتی تو وہیں کے ایک چشمے سے پیاس بجھاتا، بھوک لگتی تو وہیں کی جڑی بوٹیاں کھا کر معدے کو تسلی دے لیتا۔ ان دس دنوں میں بھی وہ ایک خطرہ برابر محسوس کرتا رہا۔ نائلہ اسے یہاں بھی یاد آتی رہی۔ ابتدائی چند دنوں میں تو اس کی یاد خیال کی طرح آئی اور نکل گئی لیکن اس کے بعد اس خیال میں شدت آنے لگی۔ نائلہ اس کے ذہن اور اعصاب پر چھاتی چلی گئی۔ اس کا چلنا پھرنا باتیں کرنا، مسکرانا، شوخی سے جواب دینا، اس کا قیامت آسا سراپا، غرضیکہ نائلہ کی ایک ایک چیز یاد آنے لگی۔ اس کے تصور میں مراقبے سے زیادہ لذت ملنے لگی۔ نائلہ کی جدائی اور اس کے وقفے نے شیبان کو یہ باور کرانا شروع کر دیا کہ اس کے دل میں نائلہ نام کی جس لڑکی کا بت جاگزیں ہو گیا ہے وہ مراقبوں اور غاروں کی عزلت نشینی سے نہیں نکالا جا سکتا۔ اس کی

نمازیں، اس کے وظیفے، اس کے اوراد، ایک نائلہ کے سامنے مجبور اور بے بس تھے۔ زہد و تقویٰ کی صفیں درہم برہم ہو رہی تھیں اور دس بارہ دن کی جدائی میں اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ راتوں کے پچھلے پہر سوتے میں وہ سرد آہیں بھر بھر کر نائلہ کا نام لیا کرتا۔ جاگتا تو بہت نادم ہوتا اور خدا سے توبہ و استغفار کرتا۔ ٹھیک پندرہ دن بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ اپنی کٹیا کی طرف مراجعت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے مغارۃ الدم پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور اپنی کٹیا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس خوف اور اندیشے سے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ اس دوران کہیں نائلہ اپنی ماں کے ساتھ واپس نہ چلی گئی ہو، لیکن وہ رجائی انداز میں یہ سوچتا کہ نائلہ موجود ہو گی اور اسے اپنے سامنے اچانک دیکھ کر اس کا خوشی سے کیا حال ہو جائے گا؟ تو اسے ایک عجیب سی لذت حاصل ہوتی۔ اس طرح وہ یہ بھی سوچتا کہ ممکن ہے نائلہ موجود ہی نہ ہو اور کہیں چلی گئی ہو، اس منفی سوچ سے وہ لرز جاتا اور دل و دماغ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے۔

جیسے جیسے وہ اپنی کٹیا کے قریب پہنچ رہا تھا، اس کے دل کی حرکت تیز ہوتی جا رہی تھی اس نے دور ہی سے اپنی کٹیا کے سامنے ایک چھکڑا کھڑا دیکھا، چھکڑے کے آگے ایک ابلق گھوڑا جتا ہوا تھا۔ اس کا دل اور زیادہ زور سے دھڑکنے لگا۔ جب وہ اپنی کٹیا کے در پر پہنچا تو اس نے چھکڑے پر نائلہ اور اس کی ماں کو بیٹھے دیکھا، آگے کوچوان کے متصل وہ آدمی بیٹھا تھا جسے اس نے اس دن دیکھا تھا، جب نائلہ اور اس کی ماں یہاں آئی تھیں اور یہ شخص انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا۔ اس نے چھکڑے کی طرف دیکھا اور پھر نائلہ کی صورت دیکھنے لگا۔ نائلہ اسے دیکھتے ہی چھکڑے سے اتر پڑی اور فرطِ خوشی میں شیبان کا ہاتھ پکڑ کر کٹیا کی طرف بڑھی بے اختیار پوچھا۔ "جناب! آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "نائلہ! میں بہت دور چلا گیا تھا، اور اتنے دنوں یہی کوشش کرتا رہا کہ تجھے بھلانے میں کامیاب ہو جاؤں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اس میں ناکام رہا۔"

نائلہ نے کہا۔ "لیکن اب میں اپنے گھر واپس جا رہی ہوں، میرا باپ مجھے لینے آ گیا ہے۔"

شیبان نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ "کیا واقعی؟ کیا تو رک نہیں سکتی؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "میں اپنے والدین سے یہ کس طرح کہہ سکتی ہوں کہ آپ دونوں جائیں، میں یہیں رہوں گی؟"

نائلہ کی ماں نے آواز دی۔ "نائلہ تو وہاں کیا کر رہی ہے؟ چل دیر ہو رہی ہے۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "ماں! میں ابھی چلتی ہوں، کیا آپ اللہ کے اس برگزیدہ بندے سے آخری ملاقات نہیں کریں گی؟"

ماں نے دور ہی سے جواب دیا۔ "میں اس وحشی صوفی سے نہیں ملوں گی، یہ تو ہمیں کچھ بتائے بغیر ہی چلا گیا تھا، پھر میں کیوں ملوں؟"

شیبان نے نائلہ سے کہا۔ "تیری ماں اگر مجھ سے نہیں چاہتی تو اسے مجبور نہ کر۔ وہ مجھ سے ناراض ہے، تو اپنے طور پر یہ سوچ کہ تو یہاں کس طرح رک سکتی ہے۔"

اس دوران نائلہ کا باپ بھی ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔ شیبان کو سلام کرتے ہوئے نائلہ سے کہا۔ "کیا بات ہے، تو چلتی کیوں نہیں؟" پھر شیبان سے پوچھا۔ "محترم بزرگ آپ تو بخیریت ہیں؟ آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں جس کی تلاش میں کٹیا سے نکلا تھا، اسے نہیں پا سکا اور اس کے آسرے میں، جو کچھ مجھے حاصل تھا، اسے بھی گنوا دیا۔"

نائلہ کے باپ نے جھگڑے والے سے کہا۔ "اے کوچوان! تو ہمارا انتظار کر۔"

نائلہ نے بڑی عاجزی سے باپ سے درخواست کی۔ "بابا جان! کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ میں کچھ دنوں کے لئے یہاں رہ جاؤں، رک جاؤں؟"

نائلہ کے باپ نے جواب دیا۔ "نائلہ! یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم سب تو چلے جائیں اور تو یہیں رہ جائے۔"

شیبان نے کہا۔ "آخر تم لوگ جا کیوں رہے ہو؟ یہیں کیوں نہیں رہ جاتے؟"

نائلہ کی ماں نے دور سے جواب دیا۔ "بڑی مشکل سے تو واپسی نصیب ہو رہی ہے اور تو کہتا ہے ہم یہیں کیوں نہیں رہ جاتے۔"

نائلہ کے باپ نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ "زبان دراز عورت! چپ ہو جا، درویش سے گستاخی نہ کر۔"

نائلہ نے درخواست کی۔ "بابا جان! کیا ہم چند دنوں کے لئے رک نہیں سکتے؟"

باپ نے جواب دیا۔ "نائلہ میں دو چار دن تو رہ سکتا ہوں، اس کے بعد مجھے قطعی واپس ہو جانا ہے۔"

نائلہ نے عاجزی سے کہا۔ "چلئے دو چار دن ہی سہی، اس کے بعد میں بھی واپس چلی چلوں گی۔"

لیکن نائلہ کی ماں نے پھر مخالفت کی، بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ

اس آدم بیزار سے اتنے متاثر کیوں ہو؟ مجھے تو یہ شخص ذرا بھی پسند نہ آیا۔"

نائلہ کے باپ نے پھر ڈانٹا۔ "میں کہتا ہوں تو اپنی زبان بند کرے گی یا نہیں؟"

نائلہ کی ماں آپے سے باہر ہوگئی۔ "تم لوگ اس وحشی کو جو چاہو سمجھو اور جیسی عزت چاہو کرو لیکن میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی کیونکہ یہ آدمیت کی بات کرتا ہی نہیں۔"

شیبان کو نائلہ کی ماں کی باتیں بڑی گراں گزر رہی تھیں لیکن نائلہ کی وجہ سے برداشت کرنا پڑ رہی تھیں، نرمی سے بولا۔" اے عورت! تجھے ضرور میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہے، اس لئے میری درخواست ہے کہ تو چند دن میرے قریب رہ، تاکہ میں تیرے دل سے کدورت اور نفرت کی وہ گرد دھو دوں، جس نے تجھے شاکی اور بیزار کر رکھا ہے۔"

نائلہ کے باپ نے چھکڑے والے کو حکم دیا۔"سامان اتار دیا جائے۔ ہم چند دن رہ کر کوچ کریں گے۔"

اسی وقت چھکڑے پر سے سامان اتار دیا گیا اور نائلہ اپنے والدین کے ساتھ پھر اپنے عارضی مکان میں چلی گئی۔ اس کے بعد نائلہ کے باپ نے شیبان کے پاس حاضری دی اور کہا۔"مرد بزرگ! میں نے آپ کو بہت ستایا، اب اس کی میں معافی چاہتا ہوں اور اس پر دل سے شرمندہ ہوں۔"

شیبان نے کہا۔" مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ آپ نے مجھے ستایا ہے! آپ نے مجھے کب ستایا؟"

نائلہ کے باپ نے جواب دیا۔" میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو آپ کے پڑوس میں چھوڑ دیا اور میں نے سنا ہے کہ میری عدم موجودگی میں آپ نے ان دونوں کا بڑا خیال رکھا، کیا یہ کوئی معمولی بات تھی؟"

شیبان نے عاجزی سے کہا۔" نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا، اس میں کوئی جبر نہیں شامل تھا۔"

وہ دونوں بڑی دیر تک یوں ہی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح نائلہ کا باپ کہیں چلا گیا، نائلہ چپ چاپ شیبان کے پاس چلی آئی اور المیہ صورت بنا کر شیبان سے کہنے لگی۔ "شیبان! تمہیں اپنے اس ڈھونڈنے میں کچھ ملا؟ کچھ حاصل ہوا یا یوں ہی چکر لگا کر واپس آگئے؟"

شیبان نے جواب دیا۔" یہ تو کہہ رہی ہے نائلہ؟ میں نے مغارۃ الدم میں جا کر یہ محسوس کیا کہ خدا تو ہر جگہ موجود ہے اس کے لئے کسی غار یا ویرانے میں بیٹھنا ضروری

نہیں، میں نے تیرے پاس سے جا کر سخت غلطی کی تھی۔"
نائلہ نے شوخی سے پوچھا۔ "اب تو نہیں جاؤ گے کہیں؟"
"نہیں۔" شیبان نے جواب دیا۔ "اب میں کہاں جاؤں گا۔" پھر ذرا شرما کر بات پوری کی۔ "میرا خیال ہے کہ اب مجھے اپنے دل کی بات چھپانا نہیں چاہئے، کہہ دینا چاہئے اگر تو اجازت دے تو میں کچھ عرض کروں؟"
نائلہ نے کہا۔ "میری طرف سے اجازت ہے۔"
شیبان نے کہا۔ "نائلہ! جب رسول اللہ نے مرد کے لئے عورت کو جائز قرار دیا ہے تو کوئی ادریاس میں اسے کیوں مسترد یا رد کروں! مجھے خدا کو منہ دکھانا ہے اور رسول اللہ سے شرمندگی نہیں اٹھانا ہے اس لئے میں اتباعِ رسول میں شادی بھی کر سکتا ہوں اور یہ کام شاید اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔"
نائلہ نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں، پوچھا۔ "پھر کس سے شادی کر رہے ہو؟"
شیبان نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے جواب دیا۔ "میں کس سے شادی کر رہا ہوں، یہ سوال مت کر، بلکہ یہ کہہ کہ وہ کون ہے جو مجھ سے شادی کر رہی ہے۔ مجھ سے جو بھی شادی کرنے کو کہے گی، میں کر لوں گا۔ انکار نہیں کروں گا۔"
نائلہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی، بولی۔ "شیبان! معاف کرنا، میں تمہارا نام لے رہی ہوں، تم بہت بھولے ہو، کیسی سادہ لوحی سے باتیں کرتے ہو، یعنی تم کو ابھی تک ایسی کوئی لڑکی نہیں ملی! جو تم سے شادی کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہو؟"
شیبان نے کہا۔ "اچھا اب تو ہی بتا کہ وہ کون سی لڑکی ہے جو مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے؟"
نائلہ نے جواب دیا۔ "ہر وہ لڑکی جو آپ کو قریب سے دیکھ لے گی آپ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔"
شیبان نے فوراً سوال کیا۔ "کیا تو تیار ہو جائے گی مجھ سے شادی کرنے پر؟"
نائلہ نے جواب دیا۔ "یہ مسئلہ میرے والدین سے تعلق رکھتا ہے، اگر وہ حامی بھر لیں گے تو میں بھی چپ ہو جاؤں گی۔"
شیبان نے کہا۔ "میں تو تیری بات کر رہا ہوں تو کیا کہتی ہے؟"
"اگر ماں اور باوا جان آمادہ ہو گئے تو پھر کون مزاحم ہو سکتا ہے؟"
شیبان نے کہا۔ "نائلہ! تو مجھ سے صاف صاف بات کر، میں تیرا عندیہ جاننا

چاہتا ہوں۔"

نائلہ نے چڑ کر کہا۔ "آپ کے پاس میرا بہت زیادہ وقت گزرتا ہے کیا یہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ میں آپ سے کچھ چاہتی، میں آپ کو کچھ سمجھتی ہوں۔"

شیبان اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا۔ "نائلہ! اب میں بہت مطمئن ہوں، تو یقین کر، جب میں نے اپنی کٹیا چھوڑی تھی تو یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں یہاں نہیں واپس آؤں گا۔ میں اس بات سے ڈر گیا تھا کہ تو اگر میرے پڑوس میں چند دن اور رہ گئی تو میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا، میں نے بربادی سے بچنے کی خاطر اپنی کٹیا چھوڑی تھی، لیکن، لیکن..."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ نائلہ نے کہا۔ "ہاں، ہاں، کہئے رک کیوں گئے؟"

شیبان نے کہا۔ "پھر میں مغارۃ الدم میں روپوش ہو گیا۔ میں نے وہاں خون کے ان دھبوں پر آنسو بہائے، جو قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے ڈال دیئے تھے۔ میں نے اس انسان پر جو ظلوماً جہولا ہے اور جو سراسر خسارے میں ہے خوب خوب آنسو بہائے، میں نے خدا کو بڑی یکسوئی سے یاد کیا لیکن اس دوران میں مجھ پر ایک عجیب سا انکشاف ہوا؟"

نائلہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "وہاں میں نے مراقبے اور یکسوئی میں یہ محسوس کیا کہ تو اور تیرا تصور کسی اجازت اور اطلاع کے بغیر میرے دل و دماغ پر چھاتے چلے جا رہے ہیں، میرے اعصاب کو جھنجھوڑے دے رہے ہیں۔"

نائلہ نے کہا۔ "آپ ذرا جلد باز ہیں، کوئی اس طرح جلدی جلدی قدم تھوڑی اٹھاتا ہے۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں جلد باز سہی، میں دیکھتا ہوں تو بھی کچھ کم جلد باز نہیں ہے!" پھر آنکھیں بند کر لیں اور گویا نشے میں کہنے لگا۔ "لوگو! اب میں برداشت نہیں کر سکتا، ایک ایسا عذاب جس کی فوری کوئی تدبیر نہ کی جا سکتی ہو۔"

نائلہ نے پوچھا۔ "تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ اور جو کچھ چاہتے ہیں اسے کس طرح حاصل کریں گے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "اصل مسئلے یا سوال یہ نہیں ہیں جو تو دہرا رہی ہے، بلکہ یہ بتا کہ میں اگر تیری بابت کوئی بات کر دوں تو، تو اس کی مخالفت تو نہیں کرے گی؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "نہیں، میں مداخلت نہیں کروں گی، آپ مطمئن رہیں۔"

رات کو عشاء کے بعد شیبان کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ اس وقت اندر سے نائلہ، اس کی ماں اور باپ بھی نمودار ہوئے۔ شیبان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نائلہ کی ماں آتے

ہی برس پڑی، بولی۔ "اے صوفی! تو میری بیٹی کو کیوں ورغلا تا رہتا ہے، جب تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ یہاں ہم دونوں موجود ہیں، پھر تو نے یہ بات براہ راست نائلہ سے کیوں کہی؟"
شیبان نے عاجزی سے جواب دیا۔ "میرے لئے لائق صد احترام عورت! تو بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، میں نے نائلہ سے جو کچھ کہا، اس کا عندیہ معلوم کر کے کہا تھا میں بڑی الجھن میں ہوں۔"
ماں نے پوچھا۔ "وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں کہ تو نے اس سے کیا کہا تھا؟"
شیبان نے جواب دیا۔ "تو میری بات پر یقین نہیں کرے گی، نائلہ موجود ہے تو اس سے خود ہی پوچھ لے۔"
باپ نے بھی مداخلت کر دی، بیزاری سے کہا۔ "آخر یہ جھگڑا کیا ہے، تم لوگ آپس میں کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔"
شیبان نے جواب دیا۔ "میں اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں بتاؤں گا نائلہ موجود ہے اس سے پوچھا جا سکتا ہے۔"
باپ نے نائلہ سے پوچھا۔ "نائلہ! کیا بات ہے؟"
نائلہ نے رک رک کر اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "یہ بزرگ مجھ سے شادی کی درخواست کر رہے تھے۔"
نائلہ کی ماں ایک دم برس پڑی۔ "وہی تو میں اس وحشی سے پوچھتے آئی ہوں کہ آخر یہ اس کو سوجھی کیا؟ اس نے اتنی بڑی درخواست آخر کس امید پر کر دی؟"
نائلہ کے باپ نے بیوی کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ "یہ تو اتنی زور زور سے چلانے کیوں لگتی ہے؟ میں تیرا شور و غل بالکل پسند نہیں کرتا۔"
ماں اس پر بھی بگڑ گئی۔ چیخ کر کہا۔ "تم میرا زور زور سے بولنا کیوں بند کر دینا چاہتے ہو؟"
باپ نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ تیری چیں چیں آواز سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے اور میرے دانتوں میں کسکساہٹ سی ہونے لگتی ہے۔"
ماں بدستور چیختی رہی۔ "تم بے شرم بن سکتے ہو لیکن میں نہیں بن سکتی، میں پوچھتی ہوں، آخر اس وحشی کی اتنی جرأت ہوئی کیسے؟"
شیبان نے شرمندگی سے کہا۔ "صاحبان! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"
نائلہ نے بھی ہمت اور جرأت سے کام لیا، بولی۔ "ہاں! اب اس جھگڑے کو ہمیں

تک رہتے دو اور میرا فیصلہ سن لو، میں نے اس نیک سیرت متقی نوجوان سے یہ درخواست کی تھی کہ یہ مجھ سے شادی کر لے، لیکن اس نے یہ کہہ کر میری درخواست مسترد کر دی کہ اپنے والدین کی موجودگی میں تو ایسی بات نہیں کر سکتی۔"

ماں نے نائلہ کو پھر ڈانٹا۔ "تو چپ رہ بنتِ غول بیابانی!"

نائلہ نے بھی اسی جوش سے جواب دیا۔ "میں پھر یہی کہوں گی کہ میں شادی کروں گی تو اس نوجوان سے، ورنہ میں یہیں، اسی کٹیا میں رہ جاؤں گی اور واپس نہیں جاؤں گی۔"

نائلہ کے باپ نے اسے حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ "کیا سچ مچ؟ کیا تو نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "ہاں، اور یہ فیصلہ میں نے کچھ عرصے پہلے ہی کر لیا تھا۔"

ماں نے بڑے غصّے میں کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ اس صوفی کو سحر آتا ہے ورنہ اس بے سروساماں وحشی پر کوئی لڑکی کس طرح ریجھ سکتی ہے۔"

باپ ایک دم مضمحل ہوگیا، بولا۔ "واقعی یہ نائلہ کا عجیب فیصلہ ہے، افسوس کہ میں اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتا۔"

ماں نے نائلہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور زبردستی اٹھانے کی کوشش کی، بولی۔ "اگر تم مخالفت نہیں کر سکتے تو نہ کرو، لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، میں نائلہ کی زندگی تباہ نہیں ہونے دوں گی۔"

نائلہ نے اکڑ کر کہا۔ "میں اپنی زندگی کی مالک ہوں، تباہ کر دوں یا شاندار بنا لوں، کسی اور کو بولنے کا کوئی حق نہیں۔"

باپ نے نائلہ سے کہا۔ "نائلہ! اتنے اہم معاملے میں عجلت سے نہ کام لے، خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کر۔"

ماں نے سختی سے کہا۔ "اوّل تو میں ایسا ہونے ہی نہ دوں گی اور اگر خدا کو یہی منظور ہے تو میں اس صوفی کو یہاں، اس ویرانے میں نہیں رہنے دوں گی اسے ہمارے ساتھ شہر چلنا ہوگا اور وہاں، دنیا داروں کی طرح کام کاج کر کے اپنی حیثیت بنانا ہوگی۔"

شیبان نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں یہاں بھی اپنی محنت ہی کا کھاتا ہوں، شادی ہو یا نہ ہو، میں شہر نہیں جاؤں گا۔"

نائلہ نے شیبان کی خوشامد کی۔ "شیبان! خدا کے لئے تم خاموش رہو اور بات مجھی کو کرنے دو!"

شیان چپ ہو گیا۔
اس رات تینوں میں دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا لیکن وہ نائلہ کے آگے بے بس ہو گئے۔
جب ماں باپ سو گئے تو نائلہ چپکے سے شیان کے پاس پہنچ گئی اور اسے سمجھایا۔ "شیان! تم میری ماں سے فضول بحث مت کرو، وہ جو کچھ کہتی ہے، کہنے دو، اصل فیصلہ تو میرا ہوگا۔"
شیان نے جواب دیا۔ "نائلہ! تیری ماں کے جسم میں کوئی خبیث روح حلول کر گئی ہے۔ کیا تو دیکھتی نہیں کہ وہ تصوّف اور زہد کے خلاف کیسے کیسے نازیبا اور نامعقول الفاظ استعمال کرتی ہے؟"
نائلہ نے کہا۔ "ہاں یہ بات میں نے بھی محسوس کر لی ہے لیکن اس وقت تو چپ رہو اور برداشت سے کام لو، ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔"
شیان نے بے بسی سے کہا۔ "اگر تو کہتی ہے تو میں چپ رہوں گا، بہتر ہے۔"
نائلہ شادی پر اصرار کرتی رہی، ماں مخالفت کرتی رہی، باپ متذبذب رہا۔ ماں اپنے اس موقف پر ڈٹی رہی کہ اگر شیان یہ وعدہ کرلے کہ وہ شادی کے بعد یہاں سے شہر چلا چلے گا تو وہ نائلہ کی شادی شیان سے کر دے گی۔
نائلہ کی ایما پر شیان نے کہہ دیا کہ وہ شرط پہلے سے قبول نہیں کرے گا ہاں شادی کے بعد اس پر غور کرے گا اور شاید وہ اس شرط کو پورا بھی کر دے۔
شیان نائلہ کے عشق میں اس بری طرح گرفتار ہو چکا تھا کہ فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف وہ خوش تھا کہ وہ نائلہ کو حاصل کئے لے رہا تھا، مگر دوسری طرف اسے یہ ملال بھی تھا کہ جو جس مقصد سے گھر سے نکلا تھا، اس میں شاید ناکام ہو رہا تھا، منازلِ سلوک طے کر کے وہ خدا تک پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن اب شاید اس میں ناکامی ہو، پھر وہ یہ سوچنے لگتا کہ رسول اللہ نے تو کئی شادیاں کرنے کے باوجود خدا سے رابطہ نہیں توڑا تھا تو وہ ایک شادی کر کے خدا کو کس طرح بھلا سکتا ہے؟
شیان اور نائلہ کی شادی ہو گئی۔ اس نے شادی کے بعد بھی یہی کوشش کی کہ خدا کے تقرّب کی کوشش کرتا رہے لیکن اب ایک نئی مصیبت پیدا ہو گئی تھی۔ باپ شہر واپس چلا گیا تھا لیکن ماں، بیٹی کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ وہ ہر وقت اس کوشش میں رہتی کہ کس طرح ان دونوں کو شہر لے جائے لیکن شیان انکار ہی کرتا رہا۔

اس واقعے کو کئی سال ہو گئے۔ اس دوران نائلہ تین بچوں کی ماں بن گئی دو لڑکے ایک لڑکی، لڑکے بڑے تھے لڑکی چھوٹی۔ اب نائلہ کی ماں نے جھگڑنے کا دوسرا انداز اختیار کیا۔ وہ بار بار یہی کہتی کہ تو نے تو اپنی زندگی اس ویرانے میں گزار دی، لیکن ان تینوں بچوں کا کیا بنے گا؟

اس نئے سوال نے نائلہ کو بھی فکر مند کر دیا اور شیبان بھی سوچنے لگا۔ کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے جو اجرت ملتی تھی وہ اتنی نہیں تھی کہ ان سب کی معقولیت سے گزر بسر ہو جاتی۔ بچے بیمار پڑتے تو ان کے دوا علاج میں بڑی دشواری پیش آتی۔ کھانے کو معقول غذا نہ ہوتی اور بچے روتے دھوتے لگتے تو ان تینوں کے دلوں پر سانپ سا لوٹ جاتا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی ہوتی چلی گئیں، جمع ہوتی رہیں انہوں نے نائلہ اور شیبان کو بھی متاثر کیا۔ اب اپنی ماں کے ساتھ نائلہ بھی یہ کہنے لگی تھی کہ "میں اس ویرانے میں مزید نہیں رہ سکوں گی، شہر چلو۔"

ماں تائید کرتی۔ "اگر شیبان نہیں چلتا تو نہ چلے، یہیں رہے، تو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر میرے ساتھ چل۔ کل یہ بچے بڑے ہو جائیں گے تو ان کا کیا بنے گا؟"

شیبان ان دونوں سے نہیں لڑ سکتا تھا، کہتا۔ "آخر شہر میں ہمیں کیا مل جائے گا، جو خدا وہاں ہے وہی خدا یہاں بھی ہے، وہ رازق ہے، پتھروں تک میں کیڑوں کو غذا پہنچاتا ہے۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "پہنچاتا ہو گا پتھروں میں غذا لیکن میں یہاں نہیں رہوں گی، میں انسان ہوں اور میرے بچے انسان کے بچے ہیں پھر میں کیڑے مکوڑوں کی طرح خدا کے رزق کا کیوں انتظار کروں۔ میرے بچے بھی دوسرے انسانوں کی طرح جدوجہد کریں گے اور کوئی مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

شیبان کی ساری دلیلیں بیکار ہو گئی تھیں، بولا۔ "نائلہ! آخر تجھے کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو تو ایسی نہیں تھی۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "پہلے تم بھی ایسے نہیں تھے، پہلے ہمارے یہ بچے بھی نہیں تھے۔"

شیبان نے بے بس ہو کر مہلت مانگی۔ "تب پھر مجھے سوچنے اور کسی قطعی فیصلے تک پہنچنے کا موقع دے۔"

نائلہ نے جواب دیا۔ "تم خوب سوچ لو اور جو چاہو فیصلہ کر لو لیکن ایک بات ذہن نشین رہے۔"

شیبان نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "وہ یہ کہ تم کوئی بھی فیصلہ کرو، لیکن میں اپنے بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی، تم اپنا فیصلہ مجھ پر مسلط نہیں کر سکتے۔"

شیبان نے کوئی جواب نہیں دیا اور تین دن تک اس موضوع پر کوئی بات نہیں چوتھے دن نائلہ نے پوچھا۔ "شیبان! تم نے کوئی فیصلہ کیا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تو جا سکتی ہے لیکن بچے میرے پاس رہیں گے۔"

نائلہ کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ کھیلنے لگی، بولی۔ "واہ کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس بیکار فیصلے میں خواہ مخواہ تین دن ضائع کر دیئے اور یہ نہیں سوچا کہ یہ مسئلہ ہی بچوں کی وجہ سے کھڑا ہوا ہے۔ بچوں کے مستقبل کی فکر نہ ہوتی تو میں یہیں اسی ویرانے میں اپنی زندگی بتا دیتی۔"

شیبان نے بڑے بے بسی سے کہا۔ "جب تو بھی چلی جائے گی اور تیرے ساتھ تینوں بچے بھی چلے جائیں گے تب پھر یہاں رہ ہی کیا جائے گا؟"

نائلہ نے طنز کیا۔ "خدا، جس کی تجھے عرصے سے تلاش ہے۔"

شیبان نے کہا۔ "لیکن خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔"

نائلہ نے پھر طنز کیا۔ "لیکن اس حقیقت کا تمہیں پہلے تو شاید علم نہیں تھا۔"

شیبان نے جواب دیا۔ "تھا، کیوں نہیں تھا۔"

نائلہ نے کہا۔ "اگر تمہیں اس کا علم ہوتا تو خدا کی تلاش میں ویرانوں کی خاک نہ چھانتے"

شیبان اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا، بولا۔ "نائلہ! میں حیران ہوں کہ یہ نکتہ پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آیا تھا۔"

نائلہ کی ماں بھی ان دونوں کی بات چیت سن رہی تھی، بولی۔ "شیبان! کیا تو بھی ہمارے ساتھ چلے گا؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "ہاں، میں بھی ساتھ چلوں گا لیکن میں یہ سوچ سوچ کر ہمت ہار بیٹھتا ہوں کہ اب میں دنیا میں خود کو اہل کس طرح ثابت کروں گا، دنیا کے لائق کس طرح بنوں گا۔"

نائلہ کی ماں نے کہا۔ "تو اس کی فکر نہ کر، میرا شوہر ایک بااثر شخص ہے، وہ کوئی اچھا سا منصب دلا دے گا۔"

شیبان ہچکچا رہا تھا، بولا۔ "معلوم نہیں کیوں، یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہتا لیکن نائلہ اور بچوں کی خاطر جانا ہی پڑے گا۔"

چند دنوں کے بعد نائلہ کا باپ بھی آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ چھکڑا بھی لایا تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ شیبان شہر جانے پر آمادہ ہو گیا ہے تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ بولا۔ "شیبان! میں اس فیصلے پر تجھے مجبور تو نہیں کر سکتا تھا لیکن میری خواہش یہی تھی، آج میں بہت خوش ہوں!"

شیبان کو اپنی کٹیا چھوڑنے کا بڑا ملال تھا، اس نے روانگی سے پہلے کٹیا پر ایک الوداعی نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل پہلے ہی سے امنڈا آ رہا تھا، اس نے اپنا قول مٹا دیا لیکن اپنے پدرِ نسبتی کا یہ قول لکھا رہنے دیا کہ

"تجرّد، تاہل سے بہتر ہے!"

نائلہ بہت خوش تھی! جب یہ سب چھکڑے میں بیٹھ گئے تو شیبان کے منہ سے چیخ نکل، بولا۔ "اے میری تنہائیوں کی رفیق کٹیا! میں نے تیری آغوش میں خدا کی جستجو شروع کی تھی اور اب سالوں کے بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ خدا تو ہر کہیں ہے اور اسے شہروں میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن، اگر میں شہر میں ناکام رہا تو میں شاید ایک بار پھر تیری آغوش میں سمٹ آؤں!"

نائلہ نے جھنجھلا کر، مگر ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم یہاں پھر واپس آؤ گے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو، ایسا کوئی ارادہ نہیں!"

ماں نے کہا۔ "پھر تو واپسی کی بات کیوں کر رہا ہے؟"

شیبان نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ جب میں نے دنیا چھوڑی تھی تو یہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا لیکن آج واپس جا رہا ہوں، اب مجھے کچھ پتہ نہیں کہ شہر میں مستقلاً ہی رہ جاؤں گا یا یہ کٹیا پھر آباد کرنا پڑے گی!"

نائلہ کے باپ نے اپنی بیوی کے کان میں کہا۔ "مت الجھ، اب یہ واپس نہیں آئے گا، بیوی بچوں کی مضبوط بیڑیوں نے اسے بے بس کر دیا ہے اور یہ بیڑی اتنی وزنی ہے کہ اسے بار بار اٹھایا بھی نہیں جا سکتا!"

خاصی دیر بعد ان کا چھکڑا دمشق میں داخل ہو گیا۔ شیبان نے اس شہر کو ایک مدت کے بعد دیکھا تھا، اب اس میں خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ یہیں اس کی ماں بھی رہتی تھی جس کا کچھ پتہ نہ تھا کہ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔ دمشق کے نظارے اسے ماضی کی یاد دلا رہے تھے۔ اس کا چھکڑا عام گذرگاہوں سے ہوتا ہوا ایک خاص شاہراہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں بڑے بڑے محلات کھڑے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کا چھکڑا ایک شاندار محل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ محل کے پھاٹک پر

سنتریوں اور محافظوں کا ایک دستہ مستعد اور چوکس کھڑا تھا۔ نائلہ کے باپ نے گاڑی سے اتر کر دربانوں سے بات چیت شروع کر دی۔ شیبان نے نائلہ سے دریافت کیا۔ "نائلہ! یہ کس کا قصر ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا ہم لوگ اس لائق ہیں کہ اس شاندار قصر میں قیام کریں؟"

نائلہ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں! میں تمہیں اسی لئے لائی ہوں کہ آدمیوں میں رکھ کر تمہیں آدمی بنا دوں۔"

کچھ دیر بعد بڑا پھاٹک کھل گیا اور یہ لوگ چھکڑے سے اتر کر پیدل اندر داخل ہو گئے۔ اس موقع پر نائلہ عجیب کردار ادا کر رہی تھی۔ اس نے تینوں بچے شیبان کے حوالے کر دیئے۔ شیبان نے دو کو تو کاندھے پر بٹھا لیا اور ایک کی انگلی پکڑ لی اور اس کے بعد یہ قافلہ پھاٹک کے اندر داخل ہو کر آگے بڑھا۔ پھاٹک کے بعد ایک بڑا سا قطعہ ملا، جس پر سبزے اور پھولوں کے درختوں کی روشیں بڑی بہار دے رہی تھیں۔ اس میدان کو عبور کرنے کے بعد محلات کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔ اوپر جھروکوں میں محافظ کھڑے ان کی آمد کا دلچسپ منظر دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً انہی محلوں میں سے کسی ایک محل سے کچھ لوگ باہر نکل آئے اور ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ شیبان کی رگوں میں خون خشک ہو گیا۔ ان میں جو شخص سب سے آگے تھا، اسے شیبان نے پہلی نظر میں پہچان لیا تھا، یہ ہشام بن عبدالملک خلیفۃ المسلمین تھا اور اپنی بھینگی آنکھ کی وجہ سے دور ہی سے پہچان لیا جاتا تھا خلیفہ کے اردگرد موجود لوگوں کو بھی شیبان نے پہچان لیا۔ ان میں ایک تو امیرالمومنین کا قاضی محمد بن صفوان تھا، وہی قاضی جسے خلیفہ کے دیئے ہوئے دینار چپکے سے دے دیئے گئے تھے، انہی میں امیرالمومنین کا کاتب سالم بھی تھا۔ یہ سب شیبان کو اس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے اور اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ شیبان کو چکر سا آ گیا۔

نائلہ کی ماں نے امیرالمومنین کو دیکھتے ہی ادب سے سلام کیا اور شیبان کی سفارش کی۔ "امیرالمومنین! یہ میرا داماد شیبان ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں، اسے دیر سے اس امید میں لے آئی ہوں کہ امیرالمومنین اسے بھی اپنے خادموں میں شامل فرما لیں گے۔"

ہشام نے اپنی بھینگی آنکھوں سے شیبان کی طرف دیکھا لیکن شیبان کو یہی گمان گزرا کہ ہشام کسی اور کو دیکھ رہا تھا، خلیفہ نے شیبان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں اس سے کہیں مل چکا ہوں۔"

قاضی ابن صفوان نے عرض کیا۔ "امیرالمومنین! یہ وہی شیبان ہے جس سے ہم سب جبل لبنان میں مل چکے ہیں اور جس کی کٹیا پر موٹا موٹا لکھا تھا۔ "انسان کے حق میں محنت آرام سے، گمنامی نام و نشان سے، اور داد و دہش قبول عطیات سے بہتر ہے۔"

شیبان نے شرم سے گردن جھکا لی، دونوں بچوں کو کاندھوں سے اتار دیا اور عرض کیا۔ "اب میں نے اس قول کے نیچے ایک قول اور لکھ دیا ہے۔"
قاضی ابن صفوان نے پوچھا۔ "کون سا قول؟"
شیبان نے جواب دیا۔ "تجرد تاہل سے بہتر ہے۔"
قاضی ابن صفوان مسکرانے لگا، بولا۔ "وحشی انسان! یہ قول تیرا نہیں امیرالمومنین کا ہے۔"
نائلہ کی ماں نے پھر درخواست کی۔ "امیرالمومنین میرے داماد اور چھوٹے چھوٹے نواسی نواسوں کے حق میں کچھ ارشاد فرمائیں۔"
ہشام نے اعلان کیا۔ "شیبان کو میرے مصاحبین میں شامل کیا جائے تاکہ اس کا اور اس کے بچوں کا مستقبل سدھر جائے۔"
جب ہشام یہ اعلان کر رہا تھا، اس وقت نائلہ کی ماں قاضی ابن صفوان سے سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔ "قاضی صاحب! میں نے آپ کی اور امیرالمومنین کی انا کی خاطر اس شاہین کو اسیر کر لیا ہے اور یہ میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے اس پر کتنی محنت کی ہے، اب مجھے میری محنتوں کا صلہ مرحمت فرمایا جائے۔"
اس کی اس سرگوشی کو شیبان نے بھی سن لیا، اس کے دل پر بڑی چوٹ پڑی۔
اسے رہنے کے لئے ایک شاندار محل عطا کیا گیا، اس نے رات کو رقت زدہ آواز میں کہا۔ "نائلہ! میں تیری اور تیرے بچوں کے مستقبل کی خاطر دمشق میں آ گیا ہوں، تجھے یاد ہو گا کہ میں کٹیا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن جب تو نے مجھے یہ بتایا کہ جو خدا اس کٹیا، اس ویرانے میں ہے وہی شہروں میں بھی موجود ہے، اس وقت میں نے تیری بات مان لی تھی لیکن شہر آ کر یہ عقدہ کھلا کہ مجھے تیری بات نہیں ماننا چاہئے تھی۔"
نائلہ نے کہا۔ "اگر میری تجویز پر تو عمل نہ کرتا تو میں بھی تجھے دیکھ لیتی۔
شیبان کو، اندر سینے میں جھٹکے سے لگتے محسوس ہوتے، اسے بڑے زور کا رونا آیا، ہشام نے اسے اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا تھا اور نائلہ اس سے تند و تیز لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان تند اور تیز ہواؤں میں تلاش حق کا چراغ کس طرح روشن رکھ سکے گا۔ پہلے تو اسے یہ یقین تھا کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور وہ اسے ہر جگہ تلاش کر سکے گا لیکن اسے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ خدا ہر کہیں ہو سکتا ہے لیکن انسانی بادشاہت کی عملداری میں شاید وہ موجود نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے مستقبل پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اب نائلہ کی ماں کے بقول شاہین اسیر ہو چکا تھا۔ شیبان کا دل امنڈا آ رہا تھا۔ وہ کسی بچے کی طرح زار و قطار رونے لگا۔

لہو کا چراغ

اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں جب انگریز تاجروں نے ہندوستان کے حکمران بننے کا خواب دیکھنا شروع کیا تو ان کا پہلا شکار نواب سراج الدولہ ہوا۔ اِس نوجوان اور ناتجربہ کار نواب کو زیر کرنے کے لیے سفید فام بدیسی تاجروں نے

کون کون سے حربے استعمال کیے ؟ یگانیوں اور بیگانوں کی مہربانیوں
اور قہرمانیوں کی خوبصورت کہانی - سرتاپا تجسس اور از اوّل تا آخر
قلم کی جادوگری کا شاندار مرقع - اس عہد کے تہذیب و تمدن کی ایک
خوبصورت تصویر - وہ سب کچھ جو ایک قاری ایک کہانی میں چاہتا ہے

مرشد آباد کے صوبے دار علی وردی خان نے اپنے نواسے مرزا محمد کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی کیونکہ یہی مرزا محمد مستقبل میں سراج الدولہ کے نام سے بنگال کی صوبے داری پر فائز ہونے والا تھا۔ شادی کی خوشی میں ایک ماہ تک پورے مرشد آباد کی دعوتیں ہوتی رہیں، محلے محلے اور گھر گھر کھانے تقسیم ہوئے تقریباً بیس لاکھ روپے کی خلعتیں اور جواہرات بانٹے گئے اور پورا شہر رنگ و نور میں ڈوبا رہا۔ جہاں چند ماہ پہلے تک مرہٹوں کے خلاف جنگ کے نقارے بجتے رہے تھے وہاں کی ہواؤں اور فضاؤں میں شہنائیوں اور نفیریوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

بارشِ انعام و اکرام کے امیدوار ملک کے گوشے گوشے سے چل کر مرشد آباد پہنچ چکے تھے، دہلی کی مغل سلطنت اپنے صوبے داروں کے ہاتھوں کمزور اور ذلیل و خوار ہو رہی تھی اور چونکہ ان کی داد و دہش اور شان و شکوہ صوبے داروں کے درباروں میں چلی گئی تھی۔ اس لئے صاحبانِ کمال اور اہلِ طرب بھی دہلی سے رخصت ہو ہو کر صوبے داروں کے آس پاس جمع ہو رہے تھے۔ مرشد آباد میں ولی عہد کی خانہ آبادی نے ملک بھر کے اہلِ طرب کو اکٹھا کر دیا تھا اور یہ اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کر کے توقع سے کہیں زیادہ انعام و اکرام حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے، آنے والے طائفوں کو محل کے مقابل چار برجوں والی پتھریلی عمارت میں ٹھیرایا گیا تھا۔ سازندے اور گانے والیاں امید سے زیادہ دولت کما لینے کی خوشی میں سرشار واپسی کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ ان کا سامان بندھ چکا تھا۔ بوندا باندی کا سماں تھا۔ شمالی افق کی بلندیوں پر بجلی کوند رہی تھی، اسی عالم میں چار برجوں والی پتھریلی عمارت کے صدر دروازے میں ایک سجا ہوا رتھ داخل ہوا۔ اس میں جُتے ہوتے شاندار گھوڑے کا سیاہی مائل سفید جسم کسی شفاف دھات کی طرح چمک رہا تھا۔ رتھ عمارت کے اندرونی درمیانی دروازے پر رک گیا۔ ایک درمیانی جسامت اور قد و قامت کا شخص اپنے خادم کے ساتھ نیچے اترا۔ اس کا سر بیٹ کے جسم پر چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ یہ دونوں عمارت کے بائیں گوشے

کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ خادم نے انگلیوں کے جوڑوں سے دستک دی اور جب تھوڑی دیر بعد یہ دروازہ کھلا تو اندر سے ایک میراثی نمودار ہوا وہ جھک کر اپنے معزز مہمان کی خدمت میں آداب بجا لایا اور سرتاپا فدویت سے مسکرا کر بولا۔ "حضور کی تشریف آوری کا کس طرح اور کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟"

معزز مہمان نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازداری سے کہا۔ "ہم اندر بیٹھنا چاہتے ہیں!"

میراثی اسے اندر لے گیا۔ وہاں جھاڑ فانوسوں کے سائے تلے قیمتی فرش بچھے ہوئے تھے۔ اور ان پر جگہ جگہ آلاتِ موسیقی رکھے ہوئے تھے نووارد مہمان جب مسند نشین ہو گیا تو اس کا خادم اس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میراثی نے اپنے ہاتھ ناف پر رکھ لئے اور سر جھکا کر پوچھا "ہمارے لائق کوئی خدمت؟"

نواب نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر کسی کو تلاش کیا پھر پوچھا۔ "بشو! منی کہاں ہے؟"

بشو نے جواب دیا۔ "ابھی حاضر کرتا ہوں!"

نواب نے حکم دیا۔ "ساتھ ہی بتو کو بھی حاضر کیا جائے؟"

بشو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نواب نے کلاہ اتار کر ایک طرف رکھ دی، اس کے سفید بال گدی پر بکھر گئے۔

تھوڑی دیر بعد بشو دو حسین فتنوں کو لے کر حاضر ہو گیا۔ ان کے جسموں پر کسا ہوا قیمتی لباس مسکنے کی حد تک چست تھا۔ چوڑی دار ریشمی پاجامے میں پنڈلیاں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں، اور کرتے پر تنگ اور کوتاہ زرکار کوٹیاں ابھرے ہوئے فتنے کو گویا یہ جبر روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی لمبی زلفیں چوٹیوں سے بے نیاز پشت اور شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ نواب کے سامنے آتے ہی جھک گئیں، اور تین بار فرشی سلام کیا۔ ان کے مسکراتے ہونٹوں کے پیچھے سے سفید موتیوں جیسے دانت دودھ کے بنے ہوئے لگتے تھے۔

نواب انہیں دیکھتے ہی تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔ "حسن و جمال کے نورانی پیکرو! تسلیمات بجا لا کر ہمیں شرمندہ مت کرو۔ ہم خود ہی تمہاری پرستش کے لئے یہاں حاضر ہوئے ہیں!"

اس کے بعد نواب چند قدم آگے بڑھا اور دونوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی نشست گاہ تک لے آیا۔

خود بیٹھ گیا اور اپنے آس پاس ان دونوں کو بٹھا لیا۔ ان کے روبرو چند گز کی دوری پر بشو ہاتھ باندھے کھڑا خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

نواب نے موٹے ہونٹ اور گدازجسم کی لڑکی کی ٹھوڑی پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور چہرے کو اوپر اٹھاتا ہوا بولا۔ "منی! مرشد آباد تمہیں پسند آیا؟"

منی نے بنا دئی شرم و حیا سے جواب دیا۔ "بہت زیادہ حضور نواب، اور آپ لوگوں کی بخششیں اور جود وسخا، انہیں تو کبھی بھی فراموش نہ کیا جاسکے گا!"

نواب کی ہوس آنکھوں میں سمٹ آئی اس نے بشّو کو گھور کر دیکھا اور حکم دیا: "تم باہر جاؤ!" اس کے بعد اپنے خادم کی طرف گھوم گیا اور نرمی سے کہا۔ "اور تم بھی!"

دونوں خاموشی سے باہر چلے گئے، نواب نے تحکمانہ کہا۔ "دروازے بند کر دیئے جائیں!"

حکم کی پوری پوری تعمیل ہوگئی۔ اس تخلیے میں نواب نے کچھ زیادہ جسارتوں سے کام لیا۔ دونوں نوخیز پھول، نادان بچیوں کی طرح بزرگ کی آغوش میں سمٹ گئیں، اٹھاون ساٹھ سالہ نواب بیس بائیس سالہ نوخیز جسموں سے یوں لطف اندوز ہوتا رہا جیسے کوئی تھکا ہارا ضعیف و ناتواں تشنہ کام پانی سے بھری ہوئی بھاری مشک سے الجھ کر رہ جائے۔ خاصی دیر بعد نواب نے فرصت کا سانس لیا اور دونوں لڑکیاں اپنی طبیعتوں کے تکدّر کو چھپائے۔ ادب سے اس کے آس پاس بیٹھ گئیں، نواب نے اپنی منظور نظر سے کہا۔ "منّی! تم یہیں رہوگی، تم دہلی نہیں جاؤگی!"

منّی نے کسمساتے ہوئے کہا: "لیکن یہ کس طرح ممکن ہے حضور نواب؟ کیا ہمارے پتا جی رضامند ہوجائیں گے؟"

"اوہ ہو!" نواب نے لاپروائی سے کہا۔ "بشو کی کیا مجال کہ ہمارے حکم سے سرتابی کرے، ہم میر جعفر خان سپہ سالار افواج بنگال ہیں، تم ہماری سلطنت کی حدود میں ہو اور ہماری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتیں!"

دونوں لڑکیاں خوفزدہ ہوگئیں، نواب کی آواز پھر ابھری، بولا: "لیکن تمہیں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں منی بیگم! ہم تمہیں مرشدآباد کے قیام کے عوض پانچ سو روپے ماہانہ ادا کریں گے!"

منّی نے کوئی جواب نہ دیا لیکن دوسری لڑکی بولی۔ "اور ہمارے لئے کیا حکم ہے نواب صاحب؟"

نواب نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے جب منی بیگم یہاں رہیں گی تو تمہیں بھی ٹھیرنا پڑے گا۔ اور تم سب کی رہائش اور قیام کی ساری ذمہ داریاں ہمارے سر رہیں گی!"

نواب کے جواب نے دونوں کے چہروں پر تازگی پیدا کر دی۔

تھوڑی دیر بعد بشّو کو اندر بلا لیا گیا اسے نواب کے فیصلے سے آگاہ کر دیا گیا، اسے کیا انکار ہو سکتا تھا، بخوشی رضامند ہوگیا لیکن میر جعفر نے ان پر یہ قید بھی لگا دی کہ اس کے تعلقات کا چرچا نہیں ہونا چاہیئے، اس عہد و پیمان کے بعد محفل رقص و موسیقی جمی اور بوڑھا نواب دیر تک

چراغ سحری کی طرح بھڑکتا رہا۔
میر جعفر کے جانے کے بعد لشو نے دونوں لڑکیوں کو خوب اچھی طرح سمجھایا کہ موقع بڑا اچھا ہے جلد از جلد جتنا زیادہ فائدہ اٹھانا ممکن ہے اٹھالیا جائے کیونکہ یہ آندھی کے آم ہیں، بوڑھا میر جعفر لب گور ہے معلوم نہیں کب چل بسے۔ میر جعفر ہر دوسرے تیسرے دن حاضری دیتا اور موعودہ رقم کے علاوہ کافی انعام واکرام دے کر رنگین محفل جماتا اور بڑ بھس نکال کر واپس جاتا۔ کچھ عرصے بعد میر جعفر یہ محسوس کرتے لگا کہ وہ دونوں لڑکیوں پر فضول دولت لٹا رہا ہے ان سے شادی کر لینا چاہیئے کیونکہ دونوں کو بیویاں بنا کر وہ بیک وقت دو فائدے حاصل کر سکتا تھا ایک تو یہ کہ جب دونوں بیویاں بن کر گھر آجائیں گی تو وہ روز روز کے انعام واکرام کے فضول خرچ سے صاف بچ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اب تک ان دونوں پر جو کچھ خرچ کر چکا تھا کسی حد تک اس کے واپس مل جانے کا امکان بھی پایا جاتا تھا لیکن لشو نے میر جعفر کی پیش کش کو نہایت نرمی سے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ "حضور والا! ہم کھاتے کمانے والے لوگ اگر اپنا کاسۂ گدائی آپ کے حوالے کر دیں گے تو ہم کیا کریں گے؟"
میر جعفر نے جواب دیا۔ "کسی فقیر کو اگر تاج و تخت مل رہا ہو تو اسے خدا کا شکر گزار ہونا چاہیئے، تمہاری دونوں بیٹیاں ہمارے حرم میں ملکہ کی حیثیت سے داخل ہوں گی تمہیں تو ہماری پیش کش پر فخر کرنا چاہیئے، تم دو ٹکے کے میراثی اپنی دونوں حسین بیٹیوں کے طفیل بنگالہ کے سپہ سالار اور صوبے دار علی وردی خان کے بہنوئی کے پدر نسبتی کا مرتبہ حاصل کر لو گے!"
لشو چپ ہو رہا لیکن اس خاموشی کے پیچھے خطرناک منصوبے جنم لینے لگے بظاہر اس نے جو خاموشی اختیار کر لی تھی اس کا میر جعفر نے یہ مطلب لیا کہ شاید وہ رضامند ہو گیا ہے، اس نے حکماً پوچھا۔ "پھر ہمیں کب تک تمہاری دونوں بیٹیوں کو اپنی ملکہ بنا لینا چاہیئے؟"
لشو نے افسردگی سے جواب دیا۔ "یہ تو حضور والا کی مرضی پر منحصر ہے جب چاہیں انہیں لے جائیں لیکن یہ خاکسار ایک درخواست ضرور کرے گا؟"
میر جعفر نے پوچھا۔ "وہ کیا؟ کہو!"
لشو نے کہا۔ "اگر حضور والا منی اور ببو کو ایک ساتھ اپنے حرم میں داخل کریں گے تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی اس لئے اس ناچیز کی رائے میں حضور کسی ایک کو اپنے ساتھ رکھیں، بعد میں، موقع محل دیکھ کر دوسری کی بابت بھی سوچ لیا جائے گا؟"
میر جعفر کو یہ تجویز پسند آئی، بولا۔ "آدمی عقل مند ہو!" اس کے بعد منی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولا۔ "یہ ہے ہماری منی بیگم، پہلے اسے ہم اپنی ملکہ بنائیں گے!"

اسی وقت دونوں میں شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ میر جعفر نے منی سے پوچھا۔ "کہو تمہیں یہ رشتہ پسند آیا؟"

منی نے جواب دیا۔ "کون ہے جو اس معزز رشتے کو پسند نہ کرے گا۔ میرے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ میں عنقریب بنگال کے سپہ سالار کی بیوی بن جاؤں گی!"

میر جعفر نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کی گھنیری داڑھی منی کے لب و رخسار میں گدگدی پیدا کرنے لگی۔

دوسرے دن علی الصباح بشو کہیں چلا گیا۔ دوپہر کو جب واپس آیا تو بہت خوش تھا، وہاں میر جعفر پہلے ہی سے موجود تھا۔ منی ناچ رہی تھی۔ اور وہ سامنے بیٹھا داد و تحسین کے پھول برسا رہا تھا۔ کسی کسی لمحے وہ سرد آہ بھی بھرنے لگتا۔ بشو نے میر جعفر کو سلام نہیں کیا اور تیزی سے چل کر میر جعفر کے قریب جا بیٹھا۔ بشو کی یہ گستاخی میر جعفر کو پسند نہ آئی۔ تیوریاں چڑھا کر بولا۔ "بشو! کیا تم درباری آداب اور منصبی احترام سے بھی واقف نہیں؟"

بشو ہنسنے لگا۔ بزرگانہ انداز میں بولا۔ "نواب صاحب عقلمند آدمی ہیں، کل آپ نے مجھے اپنا پدر نسبتی قرار دے دیا تھا۔ اس جدید رشتے اور تعلق کی بناء پر میں اسی عزت اور احترام کا مستحق ہوں جس کے حق دار نواب صاحب کے والد بزرگوار ہوں گے۔" پھر کچھ افسردہ ہو کر بولا۔ "لیکن میں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں کہ شرفا ہم جیسوں کو سبز باغ دکھا کر اپنا مطلب تو ضرور نکال لیتے ہیں لیکن ہمیں وہ عزت نہیں دیتے جس کا وہ جذبات میں آ کر وعدہ کر لیتے ہیں!"

بوڑھا نواب جوش میں آ کر ایک دم کھڑا ہوا اور عقیدت و احترام سے بشو کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔ اس طرح وہ بشو کے حضور اپنے رشتہ فرزندی کا اظہار کر رہا تھا۔ بشو نے نواب کے سفید بالوں والے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگا۔

منی کی بہن ببّو اس رشتے سے خوش نہیں معلوم ہوتی تھی، وہ خود بھی بوڑھے نواب کی بیوی بن کر محل میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ گو منی نے اسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ زیادہ فکر مند نہ ہو اس کے جاتے ہی ببّو بھی بلا لی جائے گی لیکن سر دست ببّو کے لئے یہ کیا کم دکھ تھا کہ میر جعفر منی کی موجودگی میں ببّو کو نظر انداز کر رہا تھا حالانکہ حسن و جمال میں وہ منی سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

بشو، میر جعفر اور منی کو سازندوں کے درمیان چھوڑ کر اندر چلا گیا، وہاں ببّو کو اداس دیکھ کر پوچھا۔ "ارے تو کیوں اداس ہو رہی ہے ببّو؟ تو کیا سوچ رہی ہے؟"

ببّو نے ابھی کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ بشو خود ہی کہنے لگا۔ "مجھے خوب معلوم ہے

تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی اسی طرح اداس ہو جاتا۔" پھر آہستہ سے ببّو کے گال تھپتھپا کر بولا: "کون لڑکی ہے جو کسی بوڑھے کے سرد پہلو میں اپنی جوانی گزارنا پسند کرے گی لیکن تو مت گھبرا، میں نے وہ شوشہ چھوڑا ہے کہ نواب میر جعفر اس میں پھنس کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے گا!"

ببّو نے جل کر جواب دیا۔ "بتا جی! میں نواب کی دلہن بننا چاہتی ہوں!"

"کیا"! بشو کی حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔ "تو اس بوڑھے کی بیوی بننا چاہتی ہے جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے!!"

ببّو نے جواب دیا۔ "ہاں میں نواب میر جعفر کی بیوی بننا چاہتی ہوں۔"

"یہ کیوں؟"

ببو نے جواب دیا۔ "میں دولت کے ساتھ ہی عزت اور مرتبہ بھی حاصل کرنا چاہتی ہوں، اور بوڑھے نواب کی بیوی بن کر میں دونوں ہی چیزیں حاصل کر لوں گی!"

بشو فکر مند ہو گیا۔ بولا: "میں تجھ پر جبر بھی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ مرشد آباد ہے یہاں صوبے دار، ولی عہد اور سپہ سالار کا حکم چلے گا لیکن اگر تو پسند کرے تو میں تجھے ایک مشورہ ضرور دوں گا!"

ببّو نے بڑی بڑی بادام جیسی آنکھیں بشو کی طرف اٹھا دیں، پوچھا "کیسا مشورہ، فرمایئے!"

"منی کو نواب میر جعفر ہی سے شادی کر لینے دے اور تو کوشش کر کہ ولی عہد بنگالہ نوجوان سراج الدولہ کسی طرح تجھے پسند کر لے، اگر تو نے اس نوجوان کو شکار کر لیا تو سپہ سالار میر جعفر تیرا ادنیٰ ملازم ہو گا!"

ببّو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن نوجوان شہزادہ ہمیں ملے گا کہاں؟ اس سے ملاقات کس طرح ہو گی؟"

بشو نے چٹکی بجائی بولا۔ "بس تو فوراً بن سنور کر تیار ہو جا۔ شہزادہ آنے ہی والا ہے، میں اسے خود ہی بلا آیا ہوں، میں اس پیر فرتوت کو منی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا دینا چاہتا ہوں، ایسا میں نے اس لئے سوچا تھا کہ میں تم دونوں کو بوڑھے نواب کی زوجیت میں نہیں دینا چاہتا تھا۔" پھر کچھ رک کر کہا۔ "لیکن اگر تو نے نوجوان شہزادے کو اپنی طرف رجوع کر لیا تو پھر میں منی کو میر جعفر سے بخوشی بیاہ دوں گا اور میں بیک وقت شہزادے اور سپہ سالار کا پدر نسبتی بن جاؤں گا۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہو گا۔ بہت بڑا مرتبہ، اور میرا شمار بھی یہاں کے امرائیں ہونے لگے گا۔"

ببّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور خاموشی سے اٹھ کر سنگار کرنے لگی۔ دوسرے لفظوں میں نوجوان شہزادے کو فتح کرنے کے لئے بناؤ سنگار اور ناز و ادا کے ہتھیاروں سے

مسلح ہونے لگی۔

گھنگھروؤں کی جھنکار، طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی ریں ریں میں ذرا سا انتشار پیدا ہو گیا۔ نوجوان سراج الدولہ اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے بوڑھے سپہ سالار کو اس رنگ میں دیکھ کر شرم سی محسوس کی لیکن میر جعفر بے شرمی سے بیٹھا رہا اس نے نوجوان ولی عہد کو ناچ گانے سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی، سراج الدولہ نے ہاتھ کے اشارے سے میر جعفر کو ایک طرف بلانا چاہا لیکن میر جعفر نے تخلیے کا حکم دے کر شہزادے کو اپنے پاس بلا لیا۔ جب سراج الدولہ اس کے پاس جا بیٹھا تو میر جعفر نے رازداری سے پوچھا۔ "کوئی خاص خبر؟ کہیں مرہٹوں کے چڑھ دوڑنے کی خبر لے کر تو نہیں آ گئے؟"

سراج الدولہ نے ذرہ پس و پیش سے جواب دیا۔ "آپ والدہ محترمہ کے پھوپھا ہیں، اس رشتے سے ہم بھی آپ کو پھوپھا کہتے ہیں، نانا جان ہمیں ولی عہد مقرر فرما چکے ہیں، مگر اقتدار سنبھالنے سے پہلے ہمیں علمی تربیت درکار ہے جو آپ لوگوں ہی سے مل سکتی ہے لیکن آپ کو یہاں دیکھ کر ہمیں عجیب طرح کی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے!"

میر جعفر زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ "صاحبزادے! یہ جگہ جہاں اس وقت آپ تشریف فرما ہیں، تربیت کا مشہور گہوارہ ہے، اہم امور ملکی اور جنگی میں سر کھپانے والے لوگ ذرا سکون کا سانس لینے یہاں آ جاتے ہیں، یہ طائفہ دہلی واپس جا رہا تھا ہم نے سوچا اس سے کچھ دن اور لطف اندوز ہو لیں!"

سراج الدولہ نے جذبۂ نفرت کو چھپانے کی کوشش کی۔ بولا۔ "لیکن ہم نے تو کچھ اور ہی سنا ہے!"

"وہ کیا؟" میر جعفر نے چونکتے انداز میں سوال کیا۔

"یہ کہ آپ انہیں روک رہے ہیں اور ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں!"

میر جعفر ابھی اس انکشاف پر پوری طرح حیرت کا اظہار بھی نہ کر سکا تھا کہ بشو اجازت لئے بغیر اندر داخل ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "قبلہ شہزادے کی تشریف آوری کا بندہ کس زبان سے شکریہ ادا کرے، اگر حکم ہو تو یہ ناچیز شہزادے کی دل بستگی کا سامان کرے!"

میر جعفر نے شوخی سے مسکرا کر حکم دیا۔ "اجازت، شہزادے ہمارے مہمان ہیں اس محفل بے تکلف میں رشتوں کے تکلفات ختم ہو جاتے ہیں!" پھر سراج الدولہ سے کہا۔ "صاحبزادے! قبل از وقت شہر کے اندیشے میں دبلے مت ہوئیے جب اقتدار کی باگ ڈور ہاتھ میں آ جائے اس وقت یہ باتیں اچھی لگیں گی!"

سراج الدولہ غصے میں اٹھنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت ایک دروازے سے بہو داخل ہوئی اور تسلیمات کرتی ہوئی دونوں کے قریب آگئی۔ میر جعفر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سراج الدولہ بھی اس عشوہ و ناز کے پیکر کو بغور دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ بہو کی پتلی کمر بل پر بل کھا رہی تھی، اس نے پہلے میر جعفر کے روبرو سر جھکا کر، دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے داہنے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد سراج الدولہ کی طرف بڑھی، گھٹنوں کے بل کھسک کر اس نے سراج الدولہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن شہزادے نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں بغل میں دبا لیا۔ بہو نے پھرتی سے بایاں ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ سراج الدولہ کو یوں لگا جیسے کوئی نشہ آور شے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔ بہو ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور لگاوٹ کی نظروں سے مسکراتے ہوئے شہزادے کو یوں دیکھا جیسے شکایت کر رہی ہو۔

نوجوان شہزادہ بھی بہو کے ناز و ادا سے اپنے دل میں معمولی سی لگاوٹ محسوس کرنے لگا میر جعفر دونوں کے جذبات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اسی لمحے جیب سے ایک قیمتی ہار نکال کر بہو کی طرف اچھال دیا جسے اس نے ایک ماہر کی طرح زمین پر نہیں گرنے دیا۔ سراج الدولہ بھی کوئی ایسی ہی حرکت کر سکتا تھا لیکن میر جعفر کی موجودگی میں ایسا نہیں کر سکا۔ بشو کو شہزادے کی طرف سے مایوسی ہوئی اس وقت اس کی نظر میں میر جعفر ہی بڑا آدمی تھا۔

اس کے بعد منی اور بہو نے مل کر رقص کا مظاہرہ کیا۔ جب وہ دونوں تھرکتی پیروں کو پھرتی سے کھلنے کے انداز میں اٹھاتی ہوئی گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ دونوں کے قریب پہنچتیں تو میر جعفر جھوم جھوم جاتا اور نوجوان سراج الدولہ ضبط و احتیاط کے باوجود ایسی محویت کا شکار ہو جاتا کہ اس کے سچے جذبات جسم کے ایک ایک عضو اور اس کی ایک ایک حرکت سے پڑھے جا سکتے تھے منی حسن میں ہی کم نہیں تھی لیکن بہو فنکارہ بھی تھی ایک بہترین رقاصہ، ایک ساتھ رقاصی کے بعد دونوں نے الگ الگ تنہا رقص کا مظاہرہ بھی کیا۔ اور اس میں بھی بہو نے منی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دونوں نے الگ الگ گیت سنائے اور بہو کی آواز سوز و ساز کا نشتر بن کر دونوں کے دلوں کو برما گئی لیکن میر جعفر منی پر زیادہ مہربان تھا۔ اس نے اسے اتنا نواز دیا کہ سراج الدولہ کو خفت ہونے لگی اور اس کے دل میں بہو کے لئے رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔

خاتمے پر میر جعفر نے سراج الدولہ سے پوچھا "کہیے صاحبزادے! کچھ پسند آیا؟"

سراج الدولہ نے جواب دیا "جو کچھ تھا خوب تھا!"

بشو نے ذرا قریب آ کر عرض کیا۔ "حضور اس ناچیز کو تو ایسا لگا گویا شہزادے صاحب رسماً تعریف فرما رہے ہیں!"

سراج الدولہ نے فوراً سمجھ لیا کہ بشو کہنا کیا چاہتا ہے، سراج الدولہ نے دونوں کو

انعام واکرام سے محروم رکھا تھا۔ یہ صورت حال بشّو سے یہی کہلوا سکتی تھی، اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہم یہاں اس مقصد سے ہرگز نہیں آتے تھے یہ ہم پر قرض رہا۔ پھر چکا دیں گے لیکن چلتے چلاتے یہ ضرور کہہ جائیں گے کہ سرِدست ہمارے سامنے شمشیر وسناں اور توپ و تفنگ کی بازی کبھی ہوئی ہے، پہلے اسے جیت لیں اس کے بعد بازی کی ہار بھی خوبصورت ہو جاتے گی!"

بشّو نے نظروں ہی نظروں میں پوچھا کہ کب ملاقات ہو گی؟

سراج الدولہ نے بشّو سے کہا۔ "تم ہم سے ملنا۔"

میر جعفر نے ان کے نامہ و پیام کا مفہوم پا لیا تھا، بولا۔ "کوئی ضرورت نہیں، ہمارے پاس جو کچھ ہے شہزادے کے نانا علی وردی خاں کا ہی دیا ہوا ہے، شہزادے کی طرف سے ہم خود ادا کریں گے!"

محفل اجڑ گئی۔ جو سراج الدولہ بشّو کی خواہش پر میر جعفر کو شرمندہ اور ذلیل کرنے آیا تھا۔ خود شرمندہ ہو کر واپس نکلا۔ سراج الدولہ نے اس نشست میں ایک بات بطورِ خاص محسوس کی، میر جعفر کو آداب نشست و برخاست، اندازِ بزم آرائی، اور خوبصورت اور پرکشش طرزِ تکلم پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور شاید حسین عورتیں ان کی رسیا ہوتی ہیں تبھی تو انہوں نے ایک نوجوان پر بوڑھے کو ترجیح دی۔

بشّو اپنے انعام کی خاطر سراج الدولہ کے پاس پہنچ گیا۔ سراج الدولہ نے اسے نواز دیا۔ بشّو نے کچھ کہنے اور کچھ نہ کہنے کے مذبذب انداز میں کہا۔ "کیا حضور والا نے ہیرا بی کا رقص بغور ملاحظہ فرمایا تھا؟"

سراج الدولہ نے سادگی سے جواب دیا۔ "ہاں انہیں اپنے فن پر کامل عبور حاصل ہے!"

"اور آواز کی بابت حضور والا کی کیا رائے ہے؟"

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "سرسوتی ان کے گلے میں اتر گئی ہے گیت اور آواز کی جتنی تعریف بھی کی جاتے کم ہے!"

بشّو کی باچھیں کھل گئیں، بولا۔ "بس حضور والا! جناب کے انعام و اکرام سے زیادہ قیمتی تو یہ تحسین و آفرین کے گرانمایہ الفاظ ہیں، مجھے کچھ بھی نہ ملتا اور یہ چند الفاظ کانوں کی راہ سے دل میں اتر جاتے تو بندہ یہ سمجھتا کہ اسے سب کچھ مل گیا!"

سراج الدولہ خاموش رہا۔ بشّو وہاں اس خیال سے بیٹھا رہا کہ نوجوان ولی عہد کچھ اور بھی کہے گا لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

بشّو نے خود ہی سراج الدولہ کو ٹٹولا۔ بولا۔ "اور رہی یہ بات کہ میں اپنی دونوں بیٹیاں

ہی حضور میر جعفر سے بیاہ دوں، تو یہ نا ممکن ہے۔ میں ایسا کیوں کر دوں ؟ ہاں منی کی حد تک تو گوارا بھی ہے مگر بہو کو کس طرح ان کے حوالے کر دوں ؟"

سراج الدولہ نے پوچھا "کیا وہ واقعی دونوں بہنوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں ؟"

"جی ہاں !" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میں بہو کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ دینا چاہتا ہوں۔"

سراج الدولہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "میر صاحب کے اس فعل کو نانا جان کس طرح گوارا کر لیں گے ؟"

بشو نے اپنی جھنجلاہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا: "اگر درمیان میں آپ آجائیں تو شاید وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرما لیں، ورنہ مجھ میں تو اتنا دم خم ہے نہیں کہ میر صاحب کا مقابلہ کر سکوں !"

سراج الدولہ نے صاف صاف جواب دیا۔ "بشو ! تم کسی اور خوش فہمی میں ہرگز نہ رہنا۔ اپنے دل میں فریب کا رخواہشات کو ہرگز نہ بسنے دینا۔ ہم ایک بات تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ ہم میر صاحب کی وضع کے آدمی نہیں ہیں، ہمیں تم سے ہمدردی ضرور ہے لیکن یہ میر صاحب جیسی ہرگز نہیں ہے !"

بشو کا خیال تھا کہ ولی عہد ابھی خام کار ہے اگر دو چار بار سراپا قیامت بہو کو اس سے ملا دیا جائے تو سراج الدولہ یقیناً اپنا فیصلہ بدل دے گا، پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ اس کی شادی ابھی نئی نئی ہوئی ہے لا محالہ بیوی کی چاہت دل میں گہری ہوگی، جب یکسانی اس چاہت کو کم کرے گی تو شہزادہ یقیناً ٹوٹ کر بہو پر مائل ہوگا !

اس نے سراج الدولہ سے درخواست کی۔ "حضور والا ! جب یہ خادم جناب کا انعام و اکرام لے کر بہو کے پاس پہنچے گا تو وہ شکریے کی ادائیگی کے لیے حضور والا کی قدم بوسی کی خواہش کرے گی، اس وقت کے لئے کیا حکم ہے ؟"

"ہماری طرف سے اس کا شکریہ تم وصول کر لینا !"

بشو نے مایوسی سے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جناب والا !" پھر غمزدہ آواز میں کہا "آپ لوگ ہی ہمیں منہ لگاتے ہیں اور ہمیں اپنی زندگی میں جو عزت بھی ملتی ہے اس کے منبع یا مخزن آپ لوگ ہی ہوتے ہیں ان اعترافات اور حقائق کے پیش نظر حضور والا کو ہمیں شرف قدم بوسی سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے !"

سراج الدولہ نے عاجز آ کر جواب دیا۔ "ہمیں منظور ہے، اگر بہو بیگم ہمارے روبرو ہی شکریہ ادا کرنا چاہیں تو انہیں ضیافت خانے میں حاضر ہو جانے کی اجازت ہے !"

بشّو نے خوش ہو کر کہا۔ "بندہ پروری کا شکریہ!"

اس کے جانے کے بیس بچیس منٹ بعد ہی میر جعفر بھی پہنچ گیا۔ اسے بشّو کی آمد اور واپسی کا کوئی علم نہ تھا۔ اس نے نوجوان ولی عہد سے کہا "مرزا محمد کیا آپ کو منّی پسند ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو پھوپھا جان! کیوں؟ خیریت تو ہے!"

میر جعفر نے پوچھا۔ "اور ببّو؟ وہ کیسی ہے؟"

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "اچھی ہے لیکن پسند کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا!"

میر جعفر نے بے شرمی سے کہا۔ "تو سن لو مرزا محمد، وہ دونوں عنقریب تمہاری پھپھیاں بن کر محل میں آنے والی ہیں!"

سراج الدولہ نے حیرت سے کہا۔ "اچھا! خوب!"

"ہاں، ہم تو بس ایک بات جانتے ہیں، ہم سب بازار میں کھڑے ہیں، ایک منڈی میں، یہاں لین دین ہو رہی ہے اگر چیز پسند ہے اور خریدنے کے لیے پاس دولت بھی ہے تو خریدار کو پس و پیش سے کام نہیں لینا چاہیئے!" جب میر جعفر نے یہ دیکھا کہ سراج الدولہ کسی طرح کھل ہی نہیں رہا۔ تو کہنے لگا "مرزا محمد۔ ہم بشّو کے پاس جانا چاہتے ہیں، ہم نے سوچا اگر ہم انہیں آپ کی طرف سے کچھ دیں گے تو بڑی سبکی ہوگی، ببّو یا منّی کو آپ کی طرف سے جو کچھ بھی دیا جائے اس کا آپ کی طرف سے باقاعدہ نام لے کر دیا جانا ہی وقت اور مصلحت کا تقاضا ہے!"

سراج الدولہ اس شاطر کی باتیں خوب سمجھ رہا تھا۔ پھر بھی پوچھا "کیا ہم آپ کو وہ چیزیں دے دیں جو بشّو یا ببّو کو پہنچانا چاہتے ہیں!!"

"یقیناً یقیناً!" میر جعفر نے جواب دیا۔ "ہماری خواہش ہے کہ یہ قرض فوراً ہی اتار دینا چاہیئے!"

سراج الدولہ نے تجاہل عارفانہ سے سوال کیا۔ "کیا نقد روپے دے دیئے جائیں؟"

"اس سے بہتر کیا بات ہوگی!!"

سراج الدولہ نے میر جعفر کو دس ہزار روپے دے دیئے اور اس پر یہ بات کسی طرح بھی نہ ظاہر ہونے دی کہ وہ بشّو کو پہلے ہی خوش کر چکا ہے۔

میر جعفر نے ساری رقم خود ہی دبالی۔

میر جعفر نے منّی سے شادی کر لی۔ ببّو تنہا رہ گئی۔ وہ بشّو کے ساتھ سراج الدولہ کے ضیافت خانے میں پہنچی اور نوجوان ولی عہد کے انعام و اکرام کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ سراج الدولہ ایک زرکار منقش آبنوسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل ببّو جھکی ہوئی تھی۔ ببّو کے پیچھے

تقریباً پانچ سات قدم دور بشو کھڑا تھا۔ بیّو نے شہزادے کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور انہیں اپنے پے در پے بوسوں سے آتش کدہ بنا دیا۔

سراج الدولہ اپنے ہاتھ نہ کھینچ سکا۔ اس نے اپنے جذبات کا ابلتا ہوا لاوا ضبط و احتیاط میں دبا دیا۔ بدقت تمام آہستہ آہستہ اس نے کہا۔"بی بی! تم دہلی واپس جاؤ، وہاں تمہیں مغل خاندان کے شہزادے مل سکتے ہیں، یہاں مرشد آباد میں کیا رکھا ہے، ایک سراج الدولہ جس کا بیدار مغز نانا علی وردی خان کسی اور ہی ڈھب کا انسان ہے ہم اس کی موجودگی میں بے بس ہیں!"

بیّو کو ایسا لگا جیسے سراج الدولہ عالم خواب میں بول رہا ہو، ذرا غمزدہ آواز میں مسکرا کر کہا۔"حضور والا! آپ نے بجا فرمایا۔ میں دہلی واپس جاؤں گی لیکن چند دنوں کے لئے مجھے یہ اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں آپ کے سامنے اپنے جملہ کمالات کا بھرپور مظاہرہ کرلوں!" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی وہ سراج الدولہ کا ردِّ عمل دیکھنا چاہتی تھی۔

سراج الدولہ نے جواب دیا۔"تم جب سے یہاں آئی ہو اپنے کمالات کا مسلسل مظاہرہ کر رہی ہو، کیا اب بھی کچھ ایسے کمالات ہیں جنہیں تم اب تک نہیں پیش کر سکیں؟"

بیّو نے سر اٹھایا۔ سراج الدولہ کا ایک ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ شہزادے کی آنکھیں چار ہوئیں تو بیّو کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے قطرات جھلملانے لگے اور رخساروں پر ان کی منحنی لکیریں حیرت اور کرب کا باعث بن گئیں۔

بیّو نے کہا۔ کمالات کا مظاہرہ قدر ناشناسوں کے سامنے نہیں کیا جاتا حضور والا! یہ تو خالص دل کے معاملے ہیں سینکڑوں کانوں اور آنکھوں کا ہجوم رقص اور موسیقی کے کمالات کو دل تک لے جانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اور وہ سوز جس میں ایک حساس مغنیہ یا رقاصہ دن رات بھٹکتی رہتی ہے نااہلوں، ناواقفوں اور ان جیسے بہروں کے دلوں میں کس طرح جگہ پا سکتا ہے!"

سراج الدولہ نے عاجز آئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

بیّو نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔"حضور والا! اب بھی کچھ نہیں سمجھے؟ اس سمجھ پر بنگالے کی صوبے داری؟ گستاخی معاف، اس ناچیز کی تو عقل حیران ہے!"

سراج الدولہ خفیف ہو کر بولا۔"صوبے داری میں حسن و عشق کا کیا کام کیا ہم یہ سمجھیں کہ تم ہم سے اظہارِ عشق کر رہی ہو؟ آخر تمہاری باتوں کا کیا مطلب ہے؟"

بیّو نے بے چارگی سے جواب دیا۔"بھلا میری کیا مجال کہ میں حضور والا سے اظہارِ عشق کروں، عشق اور صوبے دار کے محل میں! ایسا کبھی بھی ممکن ہوا ہے جو آج ہوگا!" پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بشو کی طرف واپس جاتی ہوئی بولی۔"بتا جی! واپس چلو، واپس دہلی چلو، میں یہاں سے اکتا گئی ہوں، اب میں یہاں

نہیں رہ سکتی!"

سراج الدولہ کرسی سے اُٹھ پڑا اور تیز تیز قدموں سے ان دونوں کے قریب پہنچا۔ بولا۔ "بی بی! تم ہمیں غلط نہ سمجھو، ہمارے سینے میں بھی دل ہے لیکن اس دل کا امورِ مملکت نے محاصرہ کر رکھا ہے، ہم دوسری فردی خواہشات کو اندر جانے ہی نہیں دیتے!"

بنّو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا اور منہ پھیر لیا؛ عشق تو ہم لوگ بھی نہیں کرتے۔ ہماری ذات تو اس معاملے میں بطورِ خاص شہرت رکھتی ہے لیکن چند دنوں سے میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ جونک پتھر میں بھی لگ سکتی ہے۔"

سراج الدولہ نے تالی بجا کر ایک خدمت گار کو بلایا اور اسے حکم دیا۔ "مفرح دل و دماغ شربت لاؤ!"

خدمت گار چلا گیا تو اس نے بنّو کو ایک کرسی پیش کی، بولا۔ "فی الوقت تم بیٹھ جاؤ!"
لیکن وہ کھڑی رہی اور آہستہ سے بولی۔ "حضور والا! یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ میں ان کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں!"

سراج الدولہ کو اس کی صحیح الدماغی پر شبہ ہو چلا تھا۔ بنّو کی بات متضاد تھی۔
شربت آ گیا۔ اشارہ پاتے ہی خدمت گار وہاں سے چلا گیا۔ سراج الدولہ نے دل نہ چاہنے کے باوجود شربت کا پیالہ بنّو کے منہ سے لگا دیا۔ بنّو نے احسان مندانہ نظروں سے سراج الدولہ کو دیکھا اور غٹ غٹ چڑھا گئی۔

سراج الدولہ نے بشو سے کہا۔ "پرسوں ہم بنّو کے کمالات کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں!"
بشو نے عاجزانہ دریافت کیا۔ "حضور والا کہاں؟"
سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "یہیں ضیافت خانے میں!"
بنّو نے سوگوار آنکھیں سراج الدولہ سے ملائیں اور بشو سے پہلے وہاں سے ہٹ گئی۔
بشو نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "حضور والا! بنّو کی گستاخی محسوس نہ فرمائیں، جب سے بڑی بہن منی اس سے جدا ہوئی ہے اداس اداس اور کھوئی کھوئی رہتی ہے اور حالتِ وارفتگی میں جانے کیسی کیسی حرکتیں کر گزرتی ہے!"
سراج الدولہ مسکرا دیا۔

تیسرے دن بنّو نے رقص و موسیقی کا جو شاندار مظاہرہ کیا، اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس دن اس کے فن میں محبت کی سوزش بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ سراج الدولہ سے متاثر ہو گئی تھی لیکن سراج الدولہ کو حاصل کر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی، اس کا چالاک، مدبر اور بیدار مغز نانا علی

وردی خاں یہ کسی طرح بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ سراج الدولہ کے پائے ثبات میں بھی لرزش آئی۔ لیکن وہ اس کام کی خود میں ہمت نہ پاتا تھا پہلے اس نے یہ کہا تھا کہ "بی بی! تم دہلی واپس جاؤ!" اور اس مظاہرے کے بعد اس نے یہ خواہش کی کہ "بی بی! تم یہیں مرشد آباد ہی میں رہو!"

میر جعفر بھی ان حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ بنو اس سے خوفزدہ تھی۔ اس نے اپنے خوف کا سراج الدولہ پر بھی اظہار کیا لیکن سراج الدولہ میر جعفر کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس نے بنو کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ "ہم جب بھی چاہیں گے نانا جان سے کہہ کر میر جعفر کو معزول کرا دیں گے!" اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا۔ "بی بی! ہم مستقبل کے صوبے دار ہیں، میر جعفر ہمارے پھوپھا ہیں اور ان کی خوش تدبیری ہمیں کبھی بھی ناراض نہ ہونے دے گی!"

لیکن بنو یہی کہتی "حضور والا! آپ اس شریر شخص کے فتنوں سے شاید پوری طرح واقف نہیں ہیں!"

"وہ ہمارے خلاف کون سا قدم اٹھا سکتا ہے؟"

"کیا یہ کم ہے کہ وہ مجھ ناچیز کو حضور والا سے ملنے نہیں دے گا!"

سراج الدولہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جہاں تک ہم دونوں کے ملنے کا تعلق ہے، نانا جان کے سوا ہمیں ملنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا لیکن اگر تمہارے ذہن میں ملنے کا کوئی بھی اور مفہوم ہو تو اس کی وضاحت کر دینا ہمارا فرض ہے!" پھر ذرا رک کر۔ "ایک ایسی ملاقات جو ہمارے شب و روز اور زندگی کے ہر لمحے پر محیط ہو جائے تقریباً ناممکن ہے!"

بنو نے اداسی سے اپنا سر جھکا لیا۔ بولی۔ "پھر مجھے دہلی چلا جانے دیجئے!"

سراج الدولہ نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "تمہاری خوشی! تمہاری مرضی!!"

ضیافت خانے کی تقریب سے اٹھ کر سراج الدولہ بیوی کے پاس پہنچا تو وہاں میر جعفر پہلے ہی سے موجود تھا۔ میر جعفر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "مرزا محمد! بنو تنہا آئی تھی یا بشو بھی ساتھ تھا؟"

بیوی لطف النسا سامنے بیٹھی تھی، میر جعفر نے نہایت نازک مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "بشو بھی ساتھ آیا تھا!"

لیکن میر جعفر نے بات کاٹ دی۔ "ہم نے سنا ہے کہ ساتھ آیا تو تھا لیکن بنو کو تمہارے حوالے کر کے چلا گیا تھا۔ کیسی ملاقات رہی؟" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

لطف النسا نے سوال کیا۔ "کیا بنو کو واقعی رقص و موسیقی میں کوئی کمال حاصل ہے؟"

میر جعفر نے شرارت سے جواب دیا۔ "ایسی ویسی!! وہ اگر چاہے تو بڑے بڑے فرماں رواؤں

کو نگنی کا ناچ نچا سکتی ہے اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اسے ہمارے دشمن مرہٹوں نے یہاں بھیجا ہے ہم نے اسی شبہے کے پیش نظر بہو کی بڑی بہن منی سے شادی کر کے انہیں مفلوج کر دیا ہے اور جب تک ہم زندہ ہیں ان کی ایک بھی نہ چلنے دیں گے !"

لطف النسا نے بے زاری سے کہا۔ "تب پھر اس حسین ناگن سے ہمیں چوکنا اور ہوشیار رہنا چاہیئے !"

میر جعفر تو یہ شوشہ چھوڑ کر چلا گیا لیکن لطف النسا اور سراج الدولہ میں اس بات پر کئی دن تک اَن بَن رہی، اور سراج الدولہ نے بہو سے ملنا جلنا یکسر ترک کر دیا۔

ایک دن اس نے اپنے ایک معتمد کو بہو کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا۔ واپس آ کر اس نے جو خبر دی اس سے سراج الدولہ کے غم و غصے کی انتہا نہ رہی، اس معتمد نے بتایا کہ جب وہاں وہ پہنچا اس نے میر جعفر کو بہو کی رقص و موسیقی میں مشغول دیکھا۔ میر جعفر نے اسے دیکھ کر یہ فقرہ بھی چھوڑا کہ "یہ مشغلے نوجوانوں کے لئے نہیں پختہ کاروں کے لئے ہیں، اس کے لئے ہمت اور تجربے کی ضرورت ہے !"

اس بات نے سراج الدولہ کو مشتعل کر دیا۔ اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ نانا علی وردی سے کہہ سن کر وہ بہر قیمت میر جعفر کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کرا دے گا۔

اس فیصلے کے بعد اس نے اپنے صوبے دار نانا سے ملنے اور بات کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ لیکن اس سے غلطی یہ ہو گئی کہ اس نے اپنے ارادے کا ذکر خاندان کے کچھ اور لوگوں کے سامنے بھی کر دیا۔ اس سے سراج الدولہ کا یہ مقصد تھا کہ وہ لوگ سراج الدولہ کے غم و غصے کی خبر میر جعفر تک پہنچا دیں، دوسرے یہ بات بھی تھی کہ اس میں سراج الدولہ کی مشتعل مزاجی، زود رنجی اور شاکیانہ روش بھی شامل تھی۔

سراج الدولہ کے ارادوں سے مطلع ہو کر میر جعفر اس کے پاس آیا اور ناگواری سے اس خبر کی تصدیق چاہی تو سراج الدولہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ "آپ اپنی اصلاح فرمالیں ورنہ پھر جو نتائج بھی نکلیں گے، اس کی ذمہ داری خود آپ پر ہوگی !"

میر جعفر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "اس کا کیا نتیجہ نکلے گا بھلا ؟"

سراج الدولہ نے بے مروتی سے جواب دیا۔ "وہی جو آپ دوسروں کی زبانی سن چکے ہیں ؟"

میر جعفر نے بے نیازی سے کہا۔ "یعنی یہ کہ آپ مجھے سپہ سالاری کے عہدے سے ہٹوا دیں گے ؟"

سراج الدولہ نے نرمی سے جواب دیا۔ "اگر آپ کی بے اعتدالیاں برقرار رہیں تو

ایسا کبھی ممکن ہے!"

میر جعفر نے نہایت تلخ اور متاسفانہ لہجے میں کہا۔"مرزا محمد! آپ کئی بار ہماری اہانت کر چکے ہیں، جو کسی طرح بھی اچھی بات نہیں اور ہم آپ کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ آپ جو چاہتے ہیں اس میں ناکام رہیں گے اپنی ران کا گھوڑا ہو یا عورت، ایک سپاہی کی ماہرانہ شہسواری ہی انہیں اس کے قابو میں رکھ سکتی ہے، آپ خیالی نوجوان ہیں، جنہیں حکومت ورثے میں مل جاتے گی،ان رموز اور نکات پر کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں!!"

سراج الدولہ نے غصے میں چیخ کر کہا۔"ہم ایسا ضرور کریں گے،آپ نے منی سے شادی کی اور اب اس کی چھوٹی بہن بتو سے بھی کرنا چاہتے ہیں،کیا آپ نے نابینا شاعر ابوالعلا معری کی وہ نظم نہیں سنی جس میں اس نے بڑھاپے کی شادی پر گہرا طنز کیا ہے،وہ کہتا ہے جب کسی بوڑھے کی نوجوان بیوی گھر میں موجود ہو اور اس کی دیوار کے سائے میں محلے کے اوباش نوجوان زور زور سے گیت گانا شروع کر دیں تو سمجھ لو کہ اس بوڑھے کی بدنصیبی کا بھیانک آغاز ہو چکا ہے!"

میر جعفر نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔"احمق نابینا لوگوں کی باتیں ہم آنکھ والوں کے لئے مشعل راہ کس طرح بن سکتی ہیں اور صاحبزادے! کل جب آپ اپنے نانا علی وردی خاں کے پاس ہماری شکایت لے کر جائیے گا تو انہیں یہ بات بھی بتا دیجئے گا کہ ان کی بیٹی اور آپ کی خالہ مہرالنسا کی حسن پرستی کی وجہ سے خوبصورت نوجوانوں نے بازار میں نکلنا چھوڑ دیا ہے"صاحبزادے! اگر آپ روک سکتے ہیں تو اپنی خالہ مہرالنسا کو روکیے جو اپنے شوہر کی موجودگی میں دوسرے مردوں سے ناجائز تعلقات رکھتی ہیں!"

سراج الدولہ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا غصے اور غم میں بھرا ہوا نانا کے پاس پہنچا اور نانا سے سب کچھ کہہ دیا۔علی وردی خاں مرہٹوں سے الجھا ہوا تھا۔اس کے پاس ان جھگڑوں کے لئے کہاں وقت تھا لیکن اس بات کی اجازت ضرور دے دی کہ سراج الدولہ اپنی خالہ مہرالنسا کے معاملے کی تحقیق کرے اور جو شخص یا اشخاص بھی مہرالنسا سے تعلقات قائم رکھنے کے گناہگار ہوں، انہیں قتل کر دیا جائے۔میر جعفر کی بابت یہ حکم ملا کہ یہ اس کا ذاتی فعل ہے اس میں دخل نہ دیا جائے۔

سراج الدولہ شرمندہ ہو کر واپس آ گیا۔

سراج الدولہ کے اندر ایک جنگ جاری ہو گئی۔اس جنگ کی فریق تھیں، بتو اور اس کی خالہ مہرالنسا جس کا شوہر نوازش علی ڈھاکے کا حاکم تھا اور اس کے نائب حسین قلی خاں سے اس کی خالہ مہرالنسا نے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے،سراج الدولہ حسین قلی خاں کے قتل کا خفیہ فرمان حاصل کر چکا تھا۔وہ سوچتا کہ اس کی خالہ جیسی گھناؤنی زندگی گذار رہی

ہے کیا وہ بنّو کے ساتھ اسی قسم کے تعلقات استوار کرے اور پھر اس کے بعد ہر حسین اور خوبرو عورت کا متوالا بن جائے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بنّو سر جھکائے اداس سامنے کھڑی پوچھ رہی ہے۔ "حضور والا! جب آپ کی حالت کو یہ آزادی حاصل ہے تو خود آپ نے اخلاقیات کی فضول بیڑی اپنے پیروں میں کیوں ڈال رکھی ہے؟"

اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ سراج الدولہ کسی کو بتلائے بغیر چپ چاپ باہر نکلا اور تنہا بنّو کے پاس پہنچ گیا، رات کی سیاہی کو کالی گھٹا ؤں نے اور زیادہ سیاہ کر دیا تھا۔ بشّو نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ غیر متوقع آمد پر بنّو کی ہلکی سی چیخ نکل گئی، سراج الدولہ نے اپنی جیب سے قیمتی موتیوں کا ایک ہار نکال کر بنّو کے گلے میں ڈال دیا اور روپیوں کی تھیلی آگے پھینک دی، دونوں ایک دوسرے کو آمنے سامنے کھڑے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں دیکھتے رہے آخر کار سراج الدولہ ہی نے اس سکوت کو توڑا۔ پوچھا "کیا تم لوگ سونے والے تھے؟"

"ہاں لیکن یہ کیسے جانا حضور والا نے؟"

اس نے جواب دیا۔ "شمعیں بجھائی جا چکی ہیں اس کی جگہ ایک دیا ٹمٹما رہا ہے اور ماحول کی ہر شے پر خوابیدگی طاری ہے!"

آپ نے کیسے زحمت کی، کوئی خوش خبری؟ بنّو نے مسرت سے پوچھا۔

"نہیں! تم سے ملنے کو جی چاہا چلے آئے!"

بنّو کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ بولی۔ "اس طرح دید و شنید سے حاصل! حضور والا تو آگ لگا کر چلے جائیں گے اور بندی تڑپتی سلگتی رہ جائے گی؟"

"بنّو!" سراج الدولہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا تم ہم سے بیٹھنے کو بھی نہ کہو گی؟"

بشّو وہاں سے ٹل گیا تو بنّو اس کے ساتھ مسہری پر بیٹھ گئی۔

سراج الدولہ نے اس کی زلفیں مٹھی میں لے لیں اور انہیں سونگھ کر بولا۔ "اگر تم چاہو تو ہم میں ایک رشتہ استوار ہو سکتا ہے!"

بنّو نے شک و شبہے سے پوچھا۔ "کون سا رشتہ؟"

"شادی کے بغیر ہم دونوں دوست کی طرح رہ سکتے ہیں!"

بنّو نے اس کی مٹھی سے اپنی زلفیں چھڑا لیں، بولی۔ "نہیں، یہ نہیں ہو سکتا!"

"کیوں؟ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا اس میں قباحت کیا ہے؟"

بنّو نے بے دلی سے جواب دیا۔ "میری طبیعت اس پر راغب نہیں ہوتی! میں عزت و احترام

اور پاکیزگی کی متلاشی ہوں۔"

سراج الدولہ نے کہا۔ "تمہارا مرتبہ بلند رہے گا۔"

بوّ نے اداسی سے جواب دیا۔ "مرتبہ! کاش آپ جان سکتے کہ میں کیا چاہتی ہوں حضور والا بھی وہی نکلے جو دوسرے ہیں!"

سراج الدولہ نے عاجز آکر پوچھا۔ "پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

"وہی درجہ، جو میری بہن منّی نے حاصل کر لیا ہے!"

"یعنی شادی!" وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ "لطف النسا کی موجودگی میں تم سے شادی، یہ کس طرح ممکن ہے، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

بوّ اس سے ذرا دور ہٹ گئی، بولی۔ "یہ رقابت کیوں، کیا مجھے جسارت کی اجازت ہے، میں درخواست کروں گی کہ مجھ سے دور رہیے اس کے بغیر کوئی بات بھی ممکن نہیں!"

سراج الدولہ دیے کی مدھم روشنی میں کچھ دیر بوّ کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "بس یہی کہنے آتے تھے ہم۔ تم دوست بن کر رہ سکتے ہیں میاں بیوی بن کر نہیں۔" پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ جب ہوش میں آیا تو بولا۔ "یا پھر تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد شاید تمہاری خواہش بھی پوری کر دی جائے!"

"کس بات کا انتظار؟ کس وقت کا انتظار؟"

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "ہمارے برسر اقتدار آجانے کے وقت کا انتظار، اور وہ دن زیادہ دور نہیں ہے، اس وقت ہم اپنی مرضی کے مالک ہوں گے!"

"ہم تند و تیز طوفان کی زد میں تو بیٹھے ہیں، اور کچھ پتہ نہیں کہ کب اور کہاں پھینک دیئے جائیں، اگر کچھ ہو سکا تو ابھی ہوگا ورنہ پھر شاید کبھی بھی نہ ہو سکے۔"

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "تم ہماری مجبوریاں کیوں نہیں سمجھتیں" وہ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔ کوئی واضح فیصلے کئے بغیر واپس چلا آیا۔

باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی، وہ بھیگتا ہوا اپنے محل میں داخل ہوا گیلے کپڑے اتارے اور کاغذ کا ایک ٹکڑا لے کر شمع کی روشنی میں کھڑا ہو گیا۔ یہ اس کے نانا علی وردی خاں کا فرمان تھا۔ اجازت نامہ، جس میں اسے اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی خالہ مہر النسا کے محبوب حسین قلی خاں کو قتل کر دے، اس کے چہرے سے درشتی اور عزم صمیم سپیدۂ سحر کی طرح جھلک رہے تھے، وہ فرمان کے مطالعے میں کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ اپنے پیچھے کھڑی ہوئی لطف النسا کے وجود کو محسوس تک نہ کر سکا۔ لیکن جب لطف النسا کو دیکھا تو علی وردی خاں کا فرمان چھپا لیا۔ بیوی

نے اس کی بابت پوچھا بھی لیکن اس نے کوئی معقول جواب نہ دیا۔

شمع کی کمزور روشنی میں وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ لطف النسا شوہر کے اضطراب کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود نہ جان سکی، اس کا غذ میں کیا ہے اس کا علم بھی نہ حاصل کر سکی، بہو۔ مہر النسا اور حسین قلی خاں، یہ تثلیث تھی جس نے سراج الدولہ کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ بہو سے تعلقات قائم کرتا ہے تو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی خالہ مہر النسا اور حسین قلی خاں کے درمیان حائل ہو اور حسین قلی خاں کو قتل کر دے، ہاں، اگر وہ بہو سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لے، تب پھر وہ خاندان کے ناموس کی خاطر حسین قلی خاں کو قتل کر دینے میں حق بجانب ٹھہرے گا۔

اور رات کے پچھلے پہر، صبح ہوتے ہوتے وہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گیا۔ بہو سے ہمیشہ کے لئے انقطاع تعلق اور حسین قلی خاں کا قتل، طلوع آفتاب سے دو گھڑی پہلے اس نے بستر چھوڑ دیا۔ غسل کیا۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ پھر لباس تبدیل کر کے جسم پر ہتھیار سجائے اور محل کے باہر نکل گیا۔ چھاؤنی سے دو سو سپاہی لئے اور موتی جھیل روانہ ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑی جھیل تھی جو اپنے عجیب محل وقوع کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتی تھی، اس کے وسط میں مہر النسا کا قلعہ نما محل تھا۔ اور محل تک جانے کے لئے ایک ہی تنگ سا راستہ تھا۔ سراج الدولہ اپنی سپاہ کے ساتھ موتی جھیل میں داخل ہو گیا۔ ولی عہد سے کون واقف نہ تھا۔ محل کے دربان تعظیم بجا لائے۔ سراج الدولہ سیدھا اپنی خالہ کے پاس پہنچا۔ مہر النسا اسے خلاف امید اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ پوچھا۔ "مرزا محمد! کیسے آنا ہوا؟"

سراج الدولہ نے اپنا ارادہ چھپائے رکھا، بولا۔ "ہم ڈھاکے کے نظم و نسق کی بابت حسین قلی خاں سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں!"

مہر النسا اسے حسین قلی خاں کی خواب گاہ میں لے چلی گئی۔

حسین قلی خاں کا کمرہ اشیائے تعیشات سے پر تھا۔ ڈھاکے کی ململ کا انگرکھا چوڑے چکلے جسم پر چپکا ہوا تھا اور آبِ رواں کے پردے ہوا سے پانی کی لہروں کی طرح ہلکورے لے رہے تھے۔ سراج الدولہ نے کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ حسین قلی خاں ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔ لیکن چہرے پر ناگواری کے اثرات صاف ظاہر تھے کیونکہ حسین قلی خاں خوب جانتا تھا کہ سراج الدولہ اسے پسند نہیں کرتا۔ مسلح سراج الدولہ نہتے حسین قلی خاں کے لئے تشویش کا سبب بن گیا تھا۔

حسین قلی خاں نے پھرتی سے باہر نکل جانا چاہا۔ لیکن سراج الدولہ نے اس کا راستہ

روک لیا۔ اور تلوار کی نوک اس کے پیٹ میں چبھوتے ہوئے حکم دیا۔ "بھاگنا مت، کیونکہ موت نے تمہیں محاصرے میں لے لیا ہے!"

مہر النسا خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ سراج الدولہ نے اپنی خالہ کو حکم دیا۔ "خالہ! کمرے کا باہری دروازہ کھول دیجئے!"

مہر النسا اس حکم کا مطلب سمجھے بغیر آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ کمرے کے باہر ہری ہری گھاس کے وسیع و عریض میدان میں سراج الدولہ کے مسلح سپاہی اپنے گھوڑوں پر اس کے حکم کے منتظر کھڑے تھے، ان کی نظریں اسی کمرے کی طرف لگی ہوئی تھیں، سراج الدولہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں قریب آنے کا اشارہ کیا۔ دو سو گھوڑے ایک ساتھ دوڑ پڑے اور ان کی ٹاپوں سے موتی جھیل کی فضا گونج گئی۔

حسین قلی خاں بے بسی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ سراج الدولہ نے اپنی خالہ کو حکم دیا۔ "خالہ! آپ اندر جائیں!"

حسین قلی خاں نے اپنی محبوبہ سے درخواست کی۔ "مہر النسا! ہمیں اس درندے سے بچالو!"

لیکن مہر النسا کو یقین ہو چکا تھا کہ حسین قلی خان اب بچ نہیں سکتا۔ پھر بھی اس نے سراج الدولہ سے تحکمانہ سوال کیا۔ "مرزا محمد! تم یہ سب اپنے طور پر کر رہے ہو یا اس کے لئے تم نے باداجان سے کوئی فرمان بھی حاصل کر لیا ہے؟"

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "فرمان ہماری جیب میں ہے کارروائی کے بعد آپ کو دکھا دیا جائے گا!"

حسین قلی خاں نے سراج الدولہ سے رحم کی درخواست کی۔ "مرزا محمد! تم مجھے معاف کر دو، میں زندگی بھر تمہاری غلامی کرنے کو تیار ہوں۔"

"ناممکن!" سراج الدولہ نے جواب دیا۔

"لیکن تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"او دشمن ناموس! کیا تو واقعی اتنا ہی سادہ اور معصوم ہے جتنا اپنی باتوں سے ظاہر کر رہا ہے؟"

حسین قلی خاں، مہر النسا سے مخاطب ہوا۔ "مہر النسا! تم مرزا محمد سے وہ فرمان تو طلب کرو، جس کی رو سے یہ مجھے قتل کر دینا چاہتا ہے!"

اس سوال سے حسین قلی خاں، سراج الدولہ کی توجہ ذرا سی دیر کے لئے اپنی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس ذرا سی عدم توجہی سے وہ اپنے تحفظ کا آخری قدم اٹھانا چاہتا تھا

لیکن چالاک مہرالنسا بھی برگشتہ مقدر کی طرح آنکھیں پھیر چکی تھی، بولی "مرزا محمد، باداجان کے فرمان کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا!"

سراج الدولہ کے آدمی کمرے کو محاصرے میں لے چکے تھے، سراج الدولہ نے پھر حکم دیا۔ "خالہ! آپ اندر جائیں!"

مہرالنسا نے جاتے جاتے حسین قلی خاں سے کہا۔ "حسین قلی! میں تجھ سے بے زار ہو چکی تھی، تیرے اس انجام سے میں بہت خوش ہوں، بے وفا انسان تو اسی انجام کا مستحق تھا!"

مہرالنسا اندر چلی گئی۔ حسین قلی خاں نے پوری قوت سے تلوار کو پیٹ پر سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن سراج الدولہ نے اسے پیٹ میں اتار دیا۔ حسین قلی نے خوفناک چیخ ماری، سراج الدولہ نے چلا کر اپنے آدمیوں کو کمرے کے اندر طلب کیا اور ذرا سی دیر میں پورا کمرہ سپاہیوں سے بھر گیا۔ سراج الدولہ کے اشارے پر کئی تلواریں کمرے میں لہرائیں اور حسین قلی خاں کا قیمہ بنانے لگیں، پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگتا ہوا لحیم شحیم جسم فرش پر گر کر پھڑکنے لگا اور خون کے فوارے سپاہیوں کے دامن تر کر گئے۔

مہرالنسا نے دروازے کی جھری سے اپنے محبوب کو قتل ہوتے دیکھا تو آنسو نہ روک سکی، بھرائی ہوئی آواز میں یہ کہتی اندر چلی گئی۔ "مرزا محمد! میں اس کا بدلہ لوں گی اور حسین قلی خاں کا خون تیرے منصب و اقتدار کو لے ڈوبے گا۔"

حسین قلی کے انجام نے بہتوں کو خوفزدہ کر دیا۔ اور وہ مرشد آباد سے نکل گئے۔ میر جعفر بھی ڈرا کہ کہیں یہ نوجوان کوئی اس کے خلاف قدم نہ اٹھا بیٹھے لیکن علی وردی خاں گھر میں انتشار نہیں پسند کرتا تھا۔ اس نے سراج الدولہ کو قابو میں رکھا۔ میر جعفر مہرالنسا سے ملا اور دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا۔ مہرالنسا اس بوڑھے سپہ سالار سے رو رو کر مدد کی درخواست کرتی رہی، لیکن میر جعفر اس کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا کیونکہ علی وردی خاں ابھی زندہ تھا اور اس چالاک اور ذہین انسان کے ہوتے ہوتے میر جعفر کی کوئی سازش بھی نہیں پنپ سکتی تھی، اس نے مہرالنسا کو یہ مشورہ البتہ دیا کہ وہ احتیاطاً اپنی حفاظت کے لئے ایک فوج ضرور تیار کرے تاکہ اگر پھر ایسا موقع پیش آئے تو سپاہ سے اس کا مقابلہ کیا جائے!

مہرالنسا نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور سپاہی بھرتی کرنے لگی۔

منی اب منی بیگم بن چکی تھی، میر جعفر کی اب بہو پر نظریں تھیں، اس نے بشو کو مال و دولت دے کر راضی کرنا چاہا لیکن اسے اس ڈر سے محتاط رکھا کہ کہیں نوجوان ولی عہد اس سے ناراض نہ ہو جائے۔ دوسرے خود بہو بھی یہ نہیں چاہتی تھی۔

سراج الدولہ نے ببو کا خیال دل سے نکال دیا تھا، وہ اپنے نانا علی وردی کی طرح پاکباز زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ ببو ہر روز اس کی راہ تکتی۔ بالآخر وہ مایوس ہوگئی۔ بشو ببو کو ڈانٹنے لگتا اور پوچھتا۔ "کیوں ری! کہیں آخری ملاقات میں تو نے شہزادے کو مایوس تو نہیں کیا۔ ورنہ اس طرح یکایک سراج الدولہ کا غائب ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے۔"

ببو نے اسے ساری روداد سنائی۔ تو صحیح بات سامنے آئی۔ بشو سراج الدولہ سے آخری بات کرنے گیا۔ جب اس نے نوجوان ولی عہد سے یہ کہا کہ "ببو کی شادی کے کئی اچھے رشتے آچکے ہیں، میں چاہتا ہوں حضور والا کی منظوری لئے بغیر یہ کام نہ کیا جائے!"

سراج الدولہ کے دل میں طوفان اٹھا کہ چلو ایک بار اس سے پھر مل لیں، لیکن خاندانی غیرت اور ناموس کے خیال نے اس کے پیر پکڑ لئے۔ سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "تم جہاں چاہو اس کی شادی کر دو!"

بشو افسردہ ہو کر واپس ہوا اور جب اس نے ببو کو ساری تفصیل سنائی تو ببو کو بڑا دکھ ہوا۔ بشو نے کہا۔ "آدمی دنیاوی رشتوں اور منصوبوں کے اعزاز پر سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ سراج الدولہ نے کبھی اپنی ولی عہدی اور خاندانی ناموس پر تجھے قربان کر دیا ہے، ببو! بول اب کیا کہتی ہے؟"

ببو نے جواب دیا۔ "پتا جی! دہلی واپس چلیے!"

بشو نے مجبوری سے کہا۔ "دہلی چلنے میں مجھے کوئی عذر نہیں لیکن اب دہلی میں کچھ بھی نہیں رکھا۔ مرشد آباد دہلی سے کئی گنا اچھا ہے!"

ببو نے زیادہ مزاحمت بھی نہیں کی۔

اسی لمحے میر جعفر اندر داخل ہوا۔ جب دونوں سے اس کی نظریں ملیں تو دل میں ایک عجیب طوفان اٹھا۔ میر جعفر نے کسی تمہید کے بغیر کہا "بشو! آج ہم تم سے ببو کا رشتہ مانگنے آئے ہیں!"

بشو کیا جواب دیتا وہ تو بہت دنوں سے راضی تھا، بولا۔ "یہ ناچیز حضور والا کے کسی فیصلے کے خلاف کبھی چل سکتا ہے بھلا؟!"

معلوم نہیں کیا سوچ کر ببو بھی راضی ہوگئی۔

پھر یہ افواہ پورے مرشد آباد میں گونجنے لگی کہ میر جعفر نے کسی ناچنے والی لڑکی سے پہلے شادی کی اور اب اس کی بہن سے کر رہا ہے جو شرعاً ناجائز ہے اور پھر لوگوں نے اس خبر کی تصدیق اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کر لی میر جعفر ببو کو دلہن بنا کر اپنے محل میں لے گیا۔

ایک دن میر جعفر منی بیگم اور ببو بیگم کو سراج الدولہ کے محل میں لے گیا۔ سراج الدولہ نے محل کی خواتین کو منی اور ببو کے سامنے جانے سے روک دیا۔ اس نے کہا۔ "ان باہر والیوں کے سامنے خاندان کی معزز خواتین کس طرح آسکتی ہیں بھلا!"

میر جعفر نے دونوں کی وکالت کی' کہا۔ "میں آپ کا پھوپھا ہوں' اور اس رشتے سے یہ دونوں آپ کی پھپھیاں ہیں' پھر ان سے یہ پردہ کیسا؟"

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "قبلہ! جو کچھ ہو چکا ہے شرمندہ کرنے کے لئے کافی ہے' خدا کے لئے اب اور زیادہ شرمندہ نہ کیجئے!"

ببو سراج الدولہ کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ اور زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر بس اسے دیکھتی رہی۔

شہزادے نے گھبرا کر کہا۔ "آپ یہاں سے تشریف لے جائیں' ورنہ مجھے ڈر ہے کہ ہم مشتعل ہو کر کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھا بیٹھیں!"

میر جعفر بیگمات میں چلا گیا کہ انہیں راضی کر کے اپنی دونوں بیویوں کو اندر لے جاتے۔ منی سراج الدولہ سے ذرا دور جا کھڑی ہوئی۔ ببو نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ "حضور والا! میں نے اس بوڑھے انسان سے اس لئے شادی کی ہے کہ یہ جناب کے خاندان کا ایک فرد ہے اور میں اس کے طفیل آپ کے محل میں آنے جانے کے لائق ہو جاؤں گی!"

سراج الدولہ نے جلدی جلدی کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ آپ پھر بھی وہ عزت اور مرتبہ حاصل نہ کر سکیں جس کا آپ کے دل میں ارمان ہوگا!"

"کوئی پرواہ نہیں!" ببو نے دل جلے لہجے میں کہا۔ "جناب والا نے میرا دل توڑا ہے' خدا آپ کے دل کو صحیح سلامت رکھے' اب یہ تو بتایئے کہ آپ ہمیں اپنی خواتین سے بھی نہیں ملنے دیجئے گا۔ یہ بےکلیوں اور ذلتوں کا سلسلہ کب تک چلے گا آخر؟"

شہزادے نے سرد مہری سے کہا۔ "جب تک ہم زندہ ہیں!"

اندر سے میر جعفر جھنجلایا ہوا باہر نکلا۔ محل کی خواتین ولی عہد سراج الدولہ کے خلاف اپنی مرضی سے کوئی قدم بھی نہ اٹھا سکتی تھیں' انہوں نے دو ناچنے گانے والیوں کو محل سرا میں آنے سے منع کر دیا تھا۔

منی نے غصے میں کہا۔ "میں بنگال کے سپہ سالار کی بیوی ہوں' میں اپنی بےعزتی کا بدلہ لوں گی!"

سراج الدولہ میر جعفر کا خیال کر گیا ورنہ اس گستاخ عورت کو کوئی سخت ترین

جواب مرحمت فرما دیتا۔
اسی سالہ علی وردی خاں استسقا کے مرض میں مبتلا بستر مرگ پر پڑا، زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا حکیموں نے اسے پرہیز کا مشورہ دیا۔ اس سمجھ دار انسان نے مسکرا کر کہا۔ "اس عمر کا استسقا ہمیشہ لاعلاج ہوا کرتا ہے، ہم زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں پھر پرہیز کا فائدہ؟"
اس نے نوجوان سراج الدولہ کو اپنے قریب بلایا۔ جب وہ اپنے نانا پر جھکا تو علی وردی خاں نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی اور کہا۔ "ہم تمہاری جانشینی کا اعلان کر چکے ہیں، ہمارے بعد تم بنگالہ کے صوبے دار ہو گے لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا چچازاد بھائی شوکت جنگ تمہاری جانشینی کو تسلیم نہ کرے گا اور سینہ تان کر تمہارے سامنے آ کھڑا ہو گا۔"
مغموم ولی عہد نے پوچھا۔ "اس وقت اس ناچیز کو کیا کرنا ہو گا؟"
علی وردی خاں نے جواب دیا۔ "شمشیر کی جگہ تدبیر سے کام لینا۔ لیکن بدرجہ مجبوری، آخری فیصلہ تلوار ہی کرتی ہے سو تم تلوار بھی اٹھا سکتے ہو لیکن بدرجہ مجبوری!"
سراج الدولہ نے سوگوار آنکھیں جھکا لیں اور سوال کیا۔ "نانا جان! اگر طبیعت اجازت دے تو اندرونی اور بیرونی دوستوں اور دشمنوں کی بابت بھی کچھ فرما دیجئے۔"
علی وردی کی آنکھوں میں چمک آ گئی، نواسے کا سوال بہت اچھا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے چراغ! ان زرد آباد کاروں (انگریزوں) سے بچ کر رہنا۔ انہوں نے جنوبی ہند کے نوابوں میں پھوٹ ڈال کر انہیں برباد کر دیا ہے، پھر مغل ہیں ان سے بھی ہوشیار رہنا جنوبی ہند کے مرہٹے ہیں جو تمہیں ہمیشہ تنگ کرتے رہیں گے لیکن خبردار ایک ہی وقت میں ان تینوں قوتوں سے مت الجھنا۔" یہ کہتے کہتے بوڑھے صوبے دار کا شہپر خیال ماضی میں چلا گیا۔ جہاں اس کا مصطفیٰ خاں نامی افغان حلیف جرنیل اسے انگریزوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دے رہا تھا اس نے علی وردی خاں کو کلکتے پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن علی وردی خاں ٹال گیا تھا۔
اس کے بعد مصطفیٰ، علی وردی کے دونوں بھائیوں کے ساتھ، اس کے پاس حاضر ہوا تھا اور تینوں نے مل کر انگریزوں پر حملہ آور ہونے کا مشورہ دیا تھا لیکن علی وردی مرہٹوں سے الجھا ہوا تھا، اس لئے اس بار بھی ٹال گیا تھا، علی وردی نے مصطفیٰ کو چلا جانے دیا تھا، اور اس کے پیچھے اپنے دونوں بھائیوں سے کہا تھا۔ "بابا! مصطفیٰ خاں تو سپاہی اور نوکری پیشہ شخص ہے، اس کا کیا ہے یہاں سے جائے گا تو کسی اور دربار سے وابستہ ہو جائے گا۔ مصطفیٰ خاں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہماری توجہ اسی پر رہے جو ناممکن ہے لیکن ہم تم دونوں سے یہ پوچھتے ہیں کہ آخر تمہاری عقلوں کو کیا ہو گیا ہے تم اس کی ہمنوائی کیوں کر رہے ہو۔ تم ہمیں یہ بتاؤ کہ انگریزوں نے ہم سے کیا برائی

کی ہے کہ ہم ان کا برا چاہیں، مرہٹے اڑیسہ اور بہار کے راستوں سے ہم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں ہمارے یہ خشکی کے دشمن ہی ہمیں چین نہیں لینے دے رہے، اور ان کی وجہ سے صحرا میں جنگ کی جو آگ جلی ہے وہی بجھنے کا نام نہیں لے رہی، ان حالات میں اگر ہم مصطفٰی خاں کی تجویز پر عمل کر کے دریا میں بھی آگ لگا دیں گے تو پھر کون ہے جو اس دو طرفہ آگ کو بجھائے گا!"

سراج الدولہ فکروں میں غرق علی وردی خاں کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک علی وردی بیدار ہوا۔ کھوتے کھوتے انداز میں پوچھا۔"ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے؟"

سراج الدولہ نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔" ایک ہی وقت میں تینوں قوتوں سے مت الجھنا۔"

"ہاں تو میرے چراغ! تجھے وہ افغان جرنیل، مصطفٰی خاں تو یاد ہو گا؟"

"خوب یاد ہے نانا جان! اس کی شجاعت اور جنگی تدبیر کا کوئی جواب نہ تھا!"

"ہاں تم سچ کہتے ہو!" علی وردی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔" اور تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ مصطفٰی خاں ہماری آپس کی ناانصافیوں ہی میں قتل ہو گیا!"

سراج الدولہ نے روتے ہوئے کہا۔" اس نے ہم سے بغاوت کی تھی اگر ہم اسے قتل نہ کرتے تو وہ ہمیں قتل کر دیتا!"

"تم ٹھیک کہتے ہو!" علی وردی خاں نے کہا۔" لیکن وہ بڑا زمانہ شناس اور مستقبل بین جرنیل تھا اس نے ہمیں کلکتے کے زرکاروں (انگریزوں) کی تباہی پر آمادہ کرنا چاہا تھا لیکن ہم نے اس وقت اس کا مشورہ رد کر دیا تھا۔ مگر آج! آج جب ہم اپنے دشمنوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ غیر ملکی تاجر ہی سب سے زیادہ خوفناک نظر آتے ہیں اگر ہم کچھ دن اور زندہ رہتے تو اس غیر ملکی فتنے کا خود ہی قلع قمع کر دیتے۔ لیکن اب یہ تمہارا کام ہے تم اقتدار سنبھالتے ہی ان سوداگروں کی طاقت توڑ دو، سراج میرے چراغ! انہیں سپاہی رکھنے اور قلعے تعمیر کرنے کی اجازت ہرگز نہ دینا اگر ایسا ہوا تو سمجھ لو کہ بنگال تمہارے ہاتھ سے گیا!"

علی وردی بولتے بولتے تھک گیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر کے لئے خاموشی اختیار کی، پھر کہا۔" ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے بہت سے امراء اور رشتے داران سفید فام سوداگروں کے کاروبار میں، حصے دار کی حیثیت سے سرمایہ لگا چکے ہیں، انگریزوں کے کاروباری شرکا بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں، انہیں پہچان کر ان سے ہوشیار رہنا!"

علی وردی خاں گراں قدر وصیتیں اور بیش بہا نیاں کر کے رخصت ہو گیا اور سراج الدولہ اس کا جانشین قرار پایا۔ امراء نے نذرانے پیش کئے۔

دوسری طرف سراج الدولہ کی خالہ مہرالنسا، اس کے اقتدار کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی، اس نے بیس ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کر رکھی اور وہ اپنی اس سپاہ کے ذریعے سراج الدولہ کی صوبے داری کا مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ سراج الدولہ کا چچا زاد بھائی شوکت جنگ بھی صوبے داری کا دعوے دار تھا اور وہ خود کو علی وردی خاں کا حقیقی جانشین تصوّر کرتا تھا۔ اس نے مغل فرماں رواں سے سند صوبے داری حاصل کرنے کے لئے اپنا نمائندہ دہلی روانہ کر دیا۔ سراج الدولہ نے بھی یہی کیا اور اپنی صوبے داری کی سند اور توثیق کے لئے اپنا وفد دہلی روانہ کر دیا۔ دہلی کے کمزور فرماں روا نے دونوں ہی کو بنگال کی صوبے داری کی سندیں عطا کر دیں، شوکت جنگ نے نعرہ بلند کیا۔ "علی وردی خاں کا اصل جانشین میں ہوں اور مجھے دہلی کے مغل فرماں روا نے صوبے داری کی سند بھی عطا کر دی ہے!"

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "مجھے بھی مغل فرماں روا کی سند صوبے داری حاصل ہے اور مرنے والا صوبے دار علی وردی خاں خود بھی مجھے اپنا جانشین مقرر کر گیا ہے!"

دونوں میں ٹھن گئی۔ شوکت جنگ بہار چلا گیا اور پورنیا کے قلعے میں بیٹھ کر جنگ کی تیاری کرنے لگا۔

قاعدہ تھا کہ جب کوئی نیا صوبے دار اپنا منصب سنبھالتا تھا تو امرا اور ماتحت با اثر قوتیں اس نئے صوبے دار کو نذرانے دیتیں اور مبارک باد پیش کرتیں۔ لیکن انگریز تاجروں نے ایسا نہیں کیا! انہوں نے نہ تو علی وردی کی موت پر رسم تعزیت ادا کی، اور نہ ہی سراج الدولہ کی تخت نشینی پر نذرانے اور مبارک بادی کی رسم ادا کی، اس نے اس غیر معمولی تغیر پر میر جعفر سے مشورہ لیا۔ بوڑھے سپہ سالار نے اسے مشورہ دیا کہ فی الحال انگریزوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے، کیونکہ اس کے دو بڑے حریف اس کے خاندان ہی میں موجود ہیں، پہلے ان سے نپٹ لیا جائے اس کے بعد انگریزوں پر توجہ دی جائے!

سراج الدولہ خوب جانتا تھا کہ اس کے یہ دو حریف کون ہیں؟ ایک تو اس کا چچا زاد بھائی شوکت جنگ تھا اور دوسری حریف اس کی خالہ مہرالنسا تھی۔

یہ میر جعفر کا گھر تھا۔ سراج الدولہ نے دوپہر کا کھانا اپنے پھوپھا کے ساتھ کھایا اس دستر خوان پر میر جعفر کا سب سے بڑا بیٹا مرزا صادق بھی موجود تھا۔ جسے لوگ صادق کے بجائے میرن کہتے تھے اور جس کے لئے مشہور تھا کہ وہ اپنے باپ کی طبعی اور فطری خصوصیات کا مثنیٰ تھا۔ بس ظلم اور بے رحمی میں وہ میر جعفر سے آگے تھا۔ اس کا یہ قول بہت مشہور تھا۔ "رحم اور انصاف کسی مصرف کے نہیں، ان سے معاملات بگڑ جاتے ہیں، رحم اور انصاف کے جذبات قابل نفرت ہیں"

اپنے اس قول پر وہ کاربند بھی تھا۔

یہیں اس کی بیٹو سے بھی ملاقات ہوئی جو میر جعفر کے خسر کا اعزاز حاصل کر کے امرا میں شامل ہو گیا تھا۔ یہیں منی بیگم بھی تھی جو کسی ملکہ کی طرح سپہ سالار کے محل پر حکومت کر رہی تھی اور یہیں ببو بیگم بھی موجود تھی جو منی بیگم کا مرتبہ تو نہیں حاصل کر سکی تھی لیکن منی بیگم کے بعد کا درجہ اسے بھی حاصل تھا۔ وہ ببو سے آنکھیں نہیں ملا سکا لیکن ببو بار بار اس کے آس پاس منڈلاتی رہی، نوجوان صوبے دار قیلولے کے لئے سپہ سالار کے محل ہی میں رک گیا۔ یہیں اس کی خدمت میں اس کی خالہ مہر النسا کے خلاف ایک شکایتی خط پیش کیا گیا، یہ خط میر جعفر نے ببو کے ذریعے سراج الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اسے جہانگیر نگر (ڈھاکے) سے کسی وقائع نویس نے بھیجا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔ وقائع نویس، صوبے دار بنگالہ کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچاتے ہوئے شرم اور اذیت محسوس کر رہا ہے کہ اس کی بیوہ خالہ مہر النسا نے میر نذیر علی نامی ایک شخص سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور اس نے اپنی حفاظت اور صوبے دار سے متصادم ہونے کے لئے بیس ہزار فوج بھرتی کر لی ہے، اگر ان خطرات کا فوری تدارک نہ ہوا تو شاید حالات قابو سے باہر ہو جائیں!"

سراج الدولہ تلملا کر اٹھ بیٹھا۔ دانت بھینچ کر بولا "ہم اس ذلت کو نہیں برداشت کر سکتے، مہر جاہم تیری سرکوبی کو جلد ہی پہنچتے ہیں!"

ببو، سراج الدولہ کے اضطراب سے لطف اندوز ہو رہی تھی، بولی "شرفا نے اپنے اطوار بدل دیئے ہیں، ہم ناچنے گانے والیاں جب کسی شریف مرد کا دامن پکڑ لیتی ہیں تو پھر کسی اور کا تصور تک نہیں کرتیں، لیکن اس دور کی شریف زادیاں!! خدا ان کے اطوار کا سایہ ہم پر نہ ڈالے!"

سراج الدولہ نے اسی وقت قلم دوات طلب کی اور مہر النسا کے نام فرمان جاری کیا۔

"جہانگیر نگر (ڈھاکے) کے مرحوم حاکم نوازش علی کی بیوہ مہر النسا کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ میر نذیر علی نامی افسر کے تعلق سے بدنامی اٹھا رہی ہے، یہ باتیں صوبے دار بنگالہ کے خاندان کے لئے شرمناک ہیں، اس فرمان کے وصول کرتے ہی مہر النسا کا یہ فرض ہے کہ وہ میر نذیر علی کو قتل کرا دے اور اس کا سر مرشد آباد بھیج دے!"

سراج الدولہ نے یہاں بھی ببو پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

سہ پہر کو میر جعفر سے مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ پہلے شوکت جنگ اور مہر النسا سے نپٹا جائے اس کے بعد انگریزوں پر توجہ دی جائے۔ سراج الدولہ اپنے محل میں واپس آ گیا۔

مہر النسا کا جواب آ گیا۔ اس نے سراج الدولہ کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا۔ سراج الدولہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ اور موتی جھیل کا قلعہ محاصرے میں لے لیا گیا۔ مہر النسا کے بیس ہزار سپاہی مدافعت کرنے لگے لیکن تیسرے دن یہ سپاہ محاصرے سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال

چکی تھی۔ مہرالنسا کی ماں اور سراج الدولہ کی نانی قلعے میں داخل ہوئی اور بیٹی کو سمجھایا۔ "مہرالنسا! سراج الدولہ سے مت لڑو، سراج تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا اور نہ ہی تمہاری دولت چھینی جائے گی۔ بشرطیکہ تم نواب کی چند شرطیں مان لو۔"

مہرالنسا مایوس اور بدحواس تھی بولی۔ "اماں! سراج الدولہ مجھے معاف نہیں کرے گا!"

ماں نے جواب دیا۔ "یہ تیری خام خیالی ہے تو مجھ پر اعتماد کر!"

مہرالنسا نے نا امیدی سے کہا۔ "وہ کہتا ہے کہ میں اپنے ایک افسر میر نذیر علی کا سر اس کے پاس روانہ کر دوں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی!"

ماں نے کہا۔ "میر نذیر علی کو ہمارے روبرو پیش کر دو!"

مہرالنسا ماں کو لے کر اس کمرے میں چلی گئی جہاں کچھ عرصے پہلے حسین قلی خاں قتل کیا گیا تھا وہاں ایک سرخ و سفید رنگت کا ادھیڑ عمر شخص سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیاں انگوٹھیوں میں چھپی ہوئی تھیں۔

مہرالنسا نے حسین قلی کے خون کے دھبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ظالم سراج الدولہ نے یہیں پر حسین قلی کو نہایت سفاکی سے قتل کیا تھا اور اب وہ میر نذیر کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے!"

ماں نے بردباری سے پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

مہرالنسا نے جواب دیا۔ "اپنی جان کا تحفظ اور میر نذیر علی کی زندگی کا ایک پروانہ، میں اسے بحفاظت تمام دہلی بھیج دینا چاہتی ہوں!"

بیگم علی وردی خاں نے اس کی شرط منظور کر لی، اور وہ قلعے سے نکل کر نواسے سراج الدولہ کی فوج میں چلی گئی، وہاں اسے جملہ کیفیت سے آگاہ کر دیا اور آخر میں میر نذیر علی کے لئے پروانۂ راہداری کے اجرا کی درخواست کی۔

سراج الدولہ نے جواب دیا۔ "اب اس کی کوئی ضرورت تو نہیں رہی کیونکہ خالہ کی سپاہ ہتھیار ڈال چکی ہے لیکن آپ کہتی ہیں تو ہم میر نذیر علی کو پروانۂ راہداری بھی عطا کر دیں گے مگر خالہ کو صاف صاف یہ بھی بتا دیجئے کہ وہ اپنے حواس میں رہیں! انہیں ہم سے پرخاش نہیں رکھنی چاہئے ہمیں نانا جان نے صوبے داری عطا کی ہے!"

حسب وعدہ میر نذیر علی کو پروانۂ راہداری عطا کر دیا گیا۔ مہرالنسا نے بہت سا سونا اس کے حوالے کیا اور تخلیے میں اس سے چمٹ کر خوب روئی، رو رو کر کہا۔ "نذیر علی! میں نے تمہیں بچا لیا ہے تم بنگال چھوڑ دو، تمہاری جدائی مجھ پر ازحد شاق گزر رہی ہے لیکن سراج الدولہ ہم دونوں کو یک جا نہیں دیکھ سکتا!"

میر نذیر علی نے مہر النسا کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا، بولا۔ "مہر النسا! میں تمہیں زندگی بھر یاد رکھوں گا!"

مہر النسا نے اس کے سینے میں سمٹتے ہوتے کہا۔" اور میں بھی۔ تم دہلی جاؤ اور وہاں میرے لئے فوج بھرتی کر دیں سراج الدولہ سے فیصلہ کن معرکہ چاہتی ہوں!"

میر نذیر علی نے کہا۔" اس کام کے لئے بہت سرمائے کی ضرورت ہے!"

"اوہ اس کی تم کیوں فکر کرتے ہو!" مہر النسا اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔" دولت میں دوں گی، میرے پاس بڑی دولت ہے، میں کسی نہ کسی طرح وقتاً فوقتاً روپے بھیجتی رہوں گی!"

میر نذیر علی جان بچا کر دہلی چلا گیا اور مہر النسا موتی جھیل کا قلعہ خالی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ سراج الدولہ نے اسے حراست میں لے لیا اور اس کے مال و دولت کو بحق صوبے دار ضبط کر کے خزانے میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن ان سپاہیوں کو معاف کر دیا گیا جو مہر النسا کی طرف سے سراج الدولہ سے جنگ کر رہے تھے۔

اسی دوران کسی نے سراج الدولہ سے مخبری کی کہ مہر النسا کا ہندو دیوان راج بلبھ اپنے بیٹے کرشن داس کے ذریعے بہت ساری دولت کلکتے روانہ کر چکا ہے اور آج کل وہ انگریزوں کے تحفظ میں ہے، سراج الدولہ نے راج بلبھ پر بھی سختی کی، اور اس سے دستیاب نہ ہو سکنے والے خزانے کی بابت معلومات حاصل کرنا چاہی لیکن راج بلبھ نے اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

مہر النسا، سراج الدولہ کے محل میں اتار دی گئی، جہاں اس کی چھوٹی بہن، سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم نے شاندار پذیرائی کی۔ مہر النسا نے رو رو کر اپنے بھانجے کے ظلم و ستم کی اپنی بہن سے شکایت کی لیکن آمنہ بیگم نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ اب مزید ظلم و ستم نہیں ہو گا، صبر سے کام لو سب ٹھیک ہو جائے گا!

مہر النسا نے آنچل پھیلا کر بھیک مانگنے کے انداز میں بہن سے درخواست کی۔" آمنہ بیگم! سراج الدولہ تمہارا بیٹا ہے، میرا دیوان راج بلبھ اس کی قید میں ہے کیا تم اسے رہا نہیں کرا سکتیں؟"

آمنہ نے جواب دیا۔" میں اسے رہا تو کرا دوں گی لیکن تم مجھ سے پہلے یہ وعدہ کرو کہ آئندہ تم سراج الدولہ کے خلاف سازشیں نہیں کرو گی!"

"میرا وعدہ، جس طرح چاہو وعدہ لے لو، چاہو تو ہاتھ میں کلام پاک دے کر عہد لے لو!"

آمنہ مطمئن ہو گئی، کہا۔" آج تمہارا دیوان راج بلبھ رہا ہو جائے گا!"

آمنہ کی پرزور سفارش پر سراج الدولہ نے راج بلبھ کو رہا کر دیا۔ آزادی پاتے ہی راج بلبھ اپنی محسنہ سے ملنے آیا۔ پہلے تو اس نے پردے کی آڑ میں موجود آمنہ بیگم کا شکریہ ادا کیا پھر جب آمنہ بیگم

چلی گئی اور اس کی جگہ مہر النسا آ بیٹھی تو راج بلبھ نے جھک جھک سجدے کرنے کے انداز میں مہر النسا کا شکریہ ادا کیا۔

مہر النسا نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔" راج بلبھ! تم یہاں تنہا ہو یا اور کوئی بھی ہے؟"

راج بلبھ نے جواب دیا۔" میں تنہا ہوں بیگم صاحبہ! ارشاد، حکم!"

مہر النسا کی محتاط آواز سنائی دی۔" تم کلکتے کے امی چند سے رابطہ قائم کرو، امی چند کمپنی کا بہت بڑا ٹھیکیدار ہے اور کلکتے میں اس کا بہت بڑا کاروبار ہے، اسے بیک وقت کمپنی اور سراج الدولہ کا اعتماد حاصل ہے۔ امی چند سے کہو وہ سراج الدولہ کے خلاف کارروائی کرنے پر کمپنی کو آمادہ کرے۔ اسے اس سلسلے میں کافی انعام دیا جائے گا!"

راج بلبھ نے سراج الدولہ کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ بولا" آپ بے فکر رہیں بیگم صاحبہ! سراج الدولہ سے بھیانک بدلہ لیا جائے گا۔"

مہر النسا نے ٹھنڈی سانس بھری، بولی۔" میں اس وقت تک شکم سیر ہو کر کھا پی نہیں سکتی جب تک سراج الدولہ کی لاش سڑکوں پر گھسٹتی ہوئی نہ دیکھ لوں گی!"

راج بلبھ نے تسلی دی، کہا۔" بے فکر رہو بیگم صاحبہ بے فکر رہو!"

میر جعفر اپنی دونوں بیویوں کو لے کر مہر النسا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سراج الدولہ کو یہ بات پسند نہ تھی لیکن وہ اپنی خالہ پر ضرورت سے زیادہ دباؤ بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میر جعفر کے پاس یہ بہانہ تھا کہ وہ مرحوم صوبے دار علی وردی خاں کی بیوہ بیٹی کی مزاج پرسی کو حاضر ہوا ہے، سراج الدولہ نے منی بیگم اور ببّو کو محل کی خواتین کے سامنے جانے سے منع کر رکھا تھا۔ لیکن مہر النسا نے اس پابندی کو اڑا دیا اور دونوں کو اپنے کمرے میں لے کر بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان میر جعفر بھی موجود رہا۔ وہ لوگ جتنی دیر بھی بیٹھے مہر النسا سراج الدولہ کی شکایت ہی کرتی رہی، وہ خدا اور رسول کے واسطے دے دے کر میر جعفر کو سراج الدولہ کے خلاف اکساتی رہی، اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ سراج الدولہ غاصب ہے، اس نے زبردستی صوبے داری ہتھیا لی ہے۔

میر جعفر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔" مہر النسا! ہم تمہارے پھوپھا ہیں تم مایوس مت ہو ہم تمہاری مدد کریں گے!"

مہر النسا نے جھنجلا کر سوال کیا۔" آخر کس طرح اور کب؟ جب سراج الدولہ انگریزوں کو بھی نکال باہر کرے گا، اسی وقت؟"

میر جعفر نے آہستہ سے کہا۔" تم عورت ہو مہر النسا! ملکی امور تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتے، بہرحال ہماری کوشش ہے کہ حق دار کو اس کا حق ضرور دیا جائے!"

مہرالنساء نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔" انگریزوں کو ملا لیجئے، یہی اس کا بہترین علاج ہے!"
میر جعفر نے جواب دیا۔" ہمیں انگریزوں کی کسی ایسی ہی پیشکش کا انتظار ہے جو صبح و شام آنے ہی والی ہے!"

وہیں سراج الدولہ بھی پہنچ گیا۔ اس نے بیوہ پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور میر جعفر کو حکم دیا۔
" آپ انگریز گورنر راجر ڈریک کے نام ہماری طرف سے فرمان جاری کیجئے کہ وہ اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں ورنہ اس کا بہت برا انجام ہوگا اور دیکھئے آپ اسے صاف صاف لکھ دیجئے کہ اب تک جو قلعہ بندیاں ہو چکی ہیں وہ انہیں تڑوا دیں، اور راج بلبھ کے بیٹے کرشن داس کو میرے حوالے کر دیں!"

میر جعفر، سراج الدولہ کے ساتھ محل کے دفتر میں پہنچا۔ ادھر مہرالنساء کو منی بیگم اور بیوہ سے باتیں کرنے کا شاندار موقع ہاتھ آ گیا۔ دونوں نے مہرالنساء کی بڑی تعریف کی جس نے انہیں اپنے پہلو میں بیٹھنے کی جگہ پیش کی تھی۔
منی بیگم نے کہا۔" بہن! میں تو اچھوتوں سے بھی بدتر تھی، سراج الدولہ نے ہم دونوں بہوؤں کا محل میں داخلہ بند کر رکھا تھا۔ اب تم آئی ہو تو ہمیں یہاں تک آنے کی اجازت بھی مل گئی ہے!"
مہرالنساء نے جواب دیا۔" بس چند دن کی بات ہے پھر نہ تو سراج الدولہ ہوگا نہ اس کے برے کرتوت اور نہ اس کے خلاف یہ شکایات ہوں گی!"
منی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔" یہ کیسا انقلاب آنے والا ہے! کچھ ہمیں بھی تو بتایئے!"
مہرالنساء نے لاپروائی سے جواب دیا۔" وہ وقت اب جلد ہی آنے والا ہے۔"
بیوہ کو سراج الدولہ سے گویا اب بھی ہمدردی تھی، بولی۔" سراج الدولہ اب اتنی نفرتوں اور سازشوں کے مستحق بھی نہیں ہیں، ان کا چہرہ تو دیکھو کیسا اترا ہوا رہتا ہے، ان کی حرکات سکنات سے ایسا لگتا ہے جیسے ہزاروں آدمیوں کے درمیان ایک بے سہارا انسان ہیں!"
منی بیگم نے اسے ڈانٹا۔ بولی۔" بدبخت! اپنی زبان بند کر، جس نے ہمارے گھروں میں ہمیں ذلیل کیا، اس کی بڑائی یا ہمدردی کا ذکر کر کے خواہ مخواہ ہمارا دل نہ دکھا۔"
اسی رات سراج الدولہ کو ایک بے نام چند سطری خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔
" حضور والا! ہوشیار رہیں کہ عورتیں تک آپ کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں، حضور کی خالہ مہرالنساء انگریزوں سے مل گئی ہیں، اور ان کی انگریزوں سے باقاعدہ خط و کتابت ہو رہی ہے انہیں پکڑنے کی کوشش کیجئے۔"
سراج الدولہ نے غیر معمولی منتظمانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا کہ مہرالنساء کے ہر طرف جاسوس بٹھا دیئے

اور مہرالنسا اس سے لاعلم رہی۔

منی بیگم کی آمد و رفت بڑھ چکی تھی اور مہرالنسا بھی اس کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ سراج الدولہ ان ملاقاتوں کو حکماً اس لئے نہ بند کر سکا کہ اس سے میر جعفر سے تعلقات خراب ہو جاتے اور جب سے چچازاد بھائی شوکت جنگ سے اختلافات ہوتے تھے اس کے امرا یوں ہی دو حصوں میں بٹ چکے تھے اب وہ میر جعفر جیسے بڑے عہدے دار کو اپنے خلاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ شوکت جنگی تیاریاں کر چکا ہے اور عنقریب مرشد آباد آنے والا ہے، سراج الدولہ نے پورنیا کا رخ کیا، وہ شوکت جنگ کو اس کے مستقر ہی میں شکست دینا چاہتا تھا۔ ابھی وہ مرشد آباد اور پٹنہ کے درمیانی شہر راج محل تک ہی پہنچا تھا کہ اس کی ماں کی طرف سے خفیہ پیغام ملا۔

آمنہ بیگم نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا۔ "سراج الدولہ! ہمیں محل کی ایک نئی کنیز میر دلا کے پاس سے چند خطوط ملے ہیں جو انتہائی پراسرار ہیں، انہیں ملاحظہ کرو اور ان کے مطابق اپنی سرگرمیاں جاری رکھو!"

سراج الدولہ نے بادامی کاغذ پر لکھے ہوئے ان تین خطوں کو پڑھا ان میں سے ایک میں لکھا تھا۔

"ہمیں آپ سے ہمدردی ہے، آپ کے ساتھ واقعی بڑی زیادتی ہوئی ہے نئے صوبے دار کا ایک فوجی افسر یار لطف خاں اس شرط پر ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہے کہ ہم سراج الدولہ کے بعد اسے صوبے دار بنا دیں، ہمیں آپ کی منظوری درکار ہے کیونکہ آپ علی وردی خاں کی سب سے بڑی بیٹی ہیں، یار لطف خاں کیسا ہے؟ کمپنی اس بابت بھی اطمینان کرنا چاہتی۔ یوں کمپنی شوکت جنگ کو برسرِ اقتدار لانا چاہتی ہے۔"

آخر میں ماجر ڈریک، انگریز گورنر کلکتہ کے دستخط تھے۔

دوسرا خط سراج الدولہ کے چچازاد بھائی شوکت جنگ کے نام تھا اس میں لکھا تھا۔

"کمپنی آپ کی طرف سے آپ کی خالہ مہرالنسا سے خاصی مراسلت کر چکی ہے، سراج الدولہ غاصب ہے جس نے اپنے رشتہ داروں کے حقوق غصب کر لئے ہیں، آپ کی خالہ کا خیال ہے کہ اگر سراج الدولہ کی جگہ آپ کو صوبے دار بنا دیا جائے تو کمپنی کے حق میں آپ زیادہ سود مند ثابت ہوں گے، کمپنی آپ کے لئے کام کرنا چاہتی ہے بشرطیکہ آپ ان تمام مصارف کی ادائیگی کا اقرار کریں جو اس مہم میں کمپنی خرچ کرے گی، اس کے علاوہ کمپنی تجارتی آزادی اور بعض اہم مصارف کی بھی خواہشمند ہے۔ آپ اس مراسلے کا جواب اپنی خالہ مہرالنسا کے توسط سے دے سکتے ہیں!"

اس پر بھی راجر ڈریک کے دستخط تھے۔

تیسرا خط سراج الدولہ کے نام تھا۔ یہ اس فرمان کا جواب تھا جس میں سراج الدو

کے قلعوں کو مسمار کر دینے اور اپنی خالہ مہر النساء کے دیوان زادے کرشن داس کو مرشد آباد بھیجنے کا حکم دیا تھا کلکتے کے انگریز گورنر نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا تھا۔

"کمپنی آپ کے احکام کی تابع نہیں ہے وہ نہ تو اپنی قلعہ بندیاں توڑے گی اور نہ کرشن داس کو آپ کے حوالے کرے گی۔ کمپنی آپ کو سرے سے جائز صوبے دار ہی تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے اس نے کسی ایسی تقریب میں آج تک حصہ نہیں لیا جو آپ کی صوبے داری کے زیر اثر منعقد کی گئی ہو!"

سراج الدولہ نے شوکت جنگ پر لشکر کشی موقوف کی اور راج محل سے قاسم بازار کی طرف چل پڑا۔ قاسم بازار مرشد آباد کے جنوب میں ذرا فاصلے پر واقع تھا اور یہاں کمپنی کی فیکٹری تھی، فیکٹری ایک شاندار قلعے کے اندر تھی، سراج الدولہ نے انگریز گورنر ڈراجر ڈریک کو زبانی کہلا بھیجا۔

"تم ہمارے دشمنوں کو پناہ دیتے ہو، ہمارے ملک کے اندر قلعہ بندیاں کرتے ہو، لیکن اب ہم تمہیں من مانی نہیں کرنے دیں گے اور تمہیں نیست و نابود کر کے دم لیں گے!"

سراج الدولہ طوفان کی طرح قاسم بازار پر ٹوٹ پڑا اور چشم زدن میں اس پر قبضہ کر لیا۔ ان کا سب سے بڑا افسر ولیم واٹسن گرفتار کر لیا گیا یہاں سے وہ کلکتہ روانہ ہونے والا تھا کہ خلاف توقع اس کی ماں آمنہ بیگم قاسم بازار پہنچ گئی اور اس نے سراج الدولہ کو کلکتے پر حملہ کرنے سے منع کیا۔ لیکن سراج الدولہ نے ماں کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ "نانا جان نے ہمیں اس کا حکم دیا تھا اور انگریزوں کے عزائم بھی اچھے نہیں ہیں، اس لئے بہتر یہی ہے کہ فتنے کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا جائے!"

آمنہ بیگم چپ ہو رہی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات یہی بتا رہے تھے کہ وہ بہت ملول ہے، سراج الدولہ نے پوچھا۔ "آخر آپ کیوں چاہتی ہیں کہ کلکتے پر حملہ نہ کیا جائے اور کمپنی کی تجارتی کوٹھیاں اور قلعہ بندیاں نہ توڑی جائیں!"

ماں نے افسردگی سے جواب دیا۔ "کلکتے کی مختلف کوٹھیوں میں ہماری بھاری رقمیں پھنسی ہوئی ہیں تمہاری حملہ آوری میں وہ ڈوب جائیں گی!"

سراج الدولہ نے کوئی جواب نہ دیا اور فوج لے کر کلکتے پہنچ گیا۔ انگریزوں پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ دریائے ہگلی میں کھڑے ہوئے جہازوں میں بیٹھ بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ فرار ہونے والوں میں ڈراجر ڈریک بھی تھا۔ سراج الدولہ نے کلکتے کا محاصرہ کر لیا جو انگریز فرار نہیں ہو سکے تھے وہ قلعے اندر چلے گئے۔ سراج الدولہ نے قلعے پر گولہ باری کا حکم دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے قلعے کی عمارتیں جلنے مقابلے کے نتائج کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد انگریزوں نے ہال ویل نامی ایک ہم قوم میں سراج الدولہ سے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔

چار گھنٹے بعد قلعے پر سفید جھنڈا لہرا دیا گیا۔ سراج الدولہ نے گولہ باری کی موقوفی کا حکم دیا اور پانچ گھنٹے بعد جب وہ اپنی فوج کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا تو انگریز اپنے رہنما ہال ویل کے ساتھ سراج الدولہ کے روبرو اس طرح پیش ہوتے کہ ان کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیئے گئے تھے سراج الدولہ نے ازراہِ ہمدردی ان کے ہاتھ کھلوا دیئے اور انہیں حکم دیا کہ کرشن داس کو حاضر کیا جائے۔ کرشن داس بھی حاضر کر دیا گیا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لیکن خلافِ امید سراج الدولہ نے اسے معاف کر دیا اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔

کلکتے کو انگریزوں سے پاک کرنے کے بعد سراج الدولہ مرشد آباد واپس ہونے والا تھا۔ اس نے مانک چند نامی ایک ہندو کو کلکتے میں اپنا نائب مقرر کیا۔ سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم اپنے فاتح بیٹے کی خدمت میں دبے قدموں حاضر ہوئی اور کچھ کہے سنے بغیر ایک طرف بیٹھ گئی، بیٹے نے ماں کو اداس دیکھ کر سوال کیا۔ "آپ اداس کیوں ہیں؟"

ماں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ "مرزا محمد! تم ایک بار میری درخواست رد کر چکے ہو اس لئے دوسری درخواست پیش کرتے ہوتے ہچکچا رہی ہوں!"

سراج الدولہ نے عقیدت و محبت سے ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور انہیں بوسہ دے کر کہا۔ "آپ درخواست نہیں حکم دیں، آپ اپنے پہلے جس حکم کا ذکر فرما رہی ہیں اس کے نہ ماننے میں ایک خاص مصلحت تھی لیکن اب جو حکم دیں گی اس کی تعمیل ہوگی!"

آمنہ بیگم نے کہا۔ "ہال ویل کو رہا کر دو!"

سراج الدولہ اس سفارش پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ماں نے ہال ویل کی سفارش کیوں کی؟ اس نے سوچا ہو سکتا ہے یہاں بھی ماں کا کوئی تجارتی مفاد آڑے آ رہا ہو، اس نے ہال ویل کو رہا کر دیا۔ جس نے انگلستان واپس جا کر سراج الدولہ کے خلاف خوب خوب الزام تراشیاں کیں اور تکلیف دہ تہمتیں لگائیں۔

سراج الدولہ نے شوکت جنگ پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دے کر ہمیشہ کے لئے اس فتنہ کو ختم کر دیا اس جنگ میں شوکت جنگ مارا گیا۔

مرشد آباد میں مہرالنسا کی سخت نگرانی شروع کر دی گئی اور متی بیگم یا کسی اور عورت کے اس کے پاس جانے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ دوسری طرف مدراس سے انگریزی فوج سراج الدولہ سے بدلہ لینے کے لئے چل کھڑی ہوئی۔ اس فوج کی قیادت امیر البحر واٹسن کے ذمے تھی اور اس کا نائب کلائیو تھا۔ کلائیو ایک پرجوش اور مہم جو سپاہی تھا جسے میدان جنگ میں لڑنے کے ساتھ ہی مکر و فریب سے کام نکالنے کا فن بہت اچھا آتا تھا۔ اس نے کلکتے کے نواح میں داخل ہوتے ہی سراج الدولہ کے

نانتے مانک چند کو ملا لیا۔ جس سے کلکتہ دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سراج الدولہ نے کلائیو کو ڈانٹا کہ وہ من مانی نہ کرے لیکن کلائیو نے الٹا انگریزوں کے نقصانات کا معاوضہ طلب کر لیا۔ سراج الدولہ مشتعل ہو گیا۔ کلائیو نے اس کے امراء کو سازش کے جال میں پھانسنے کی کوششیں شروع کر دیں؛

اس نے مہرالنسا کو لکھا۔" آپ اگر ذرا سی ہمت سے کام لیں تو آپ کی ساری شکایات دور ہو سکتی ہیں براہ کرم آپ صوبے دار کے فوجی افسروں سے ہماری بات چیت کرا دیں!"

مہرالنسا کو کلائیو کا یہ پیغام بڑی مشکل سے ملا۔ مہرالنسا میر جعفر سے ملنے کے لئے بے چین ہو گئی آمنہ بیگم نے اسے اجازت دلوا دی اور مہرالنسا سیدھی میر جعفر کے پاس پہنچی۔ منی بیگم اور ببّو نے اس کا استقبال کیا۔ مہرالنسا نے ببّو سے سرد مہری برتی اور موقع پا کر منی بیگم سے کہا۔

"منی! چاہے تم برا مانو لیکن میں یہی کہوں گی کہ ببّو اعتبار کے لائق نہیں ہے!"

منی نے منہ بنا کر کہا۔" میں خود بھی یہی سمجھتی ہوں کہ ببّو غاصب سراج الدولہ سے ہمدردی رکھتی ہے اور ہمیں اس کی طرف سے محتاط رہنا چاہیئے!"

اسی لمحے ببّو آ گئی، دونوں خاموش ہو گئیں، ببّو نے اس خاص حالت کو صحیح انداز میں محسوس کر لیا اور خود ہی وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جاتے کے تھوڑی دیر بعد مہرالنسا نے منی سے پوچھا۔" منی بیگم! کیا تم یہ پسند کرو گی کہ تمہارے شوہر کو صوبے دار بنا دیا جائے اور تم صوبے دار کی بیوی کہلاؤ؟"

منی بیگم کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا، پوچھا۔" یہ کس طرح ممکن ہے؟"

مہرالنسا نے کہا۔" پھوپھا جان کو بلاؤ۔ فرنگی انہیں صوبے دار بنانے پر آمادہ ہیں!"

اسی وقت میر جعفر کو بلا لیا گیا اور بڈھا سپہ سالار ہنسی خوشی غداری پر آمادہ ہو گیا۔

مہرالنسا نے کہا۔" پھوپھا جان! اب یہ کام آپ کا ہے کہ فرنگیوں سے رابطہ قائم کریں اور میرے حوالے سے اپنے معاملات طے کر لیں!"

اور اس کے دوسرے دن میر جعفر کا ایک خاص فرستادہ کلائیو کے پاس روانہ ہو گیا لیکن اس سے پہلے ببّو کا نمائندہ سراج الدولہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ببّو نے نوجوان صوبے دار کو لکھا تھا:۔

"حضور والا! آپ کی خالہ مہرالنسا نے ہوشیاری سے مجھے ہٹا کر میری بہن منی بیگم اور میرے شوہر میر جعفر سے کچھ صلاح مشورے کئے ہیں میں نے کئی بار ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی لیکن نہیں سن سکی۔ ہاں کئی بار کلائیو اور انگریزوں کا ذکر ضرور سننے میں آیا۔ حالات نہایت پراسرار ہیں نہایت چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے!"

سراج الدولہ نے اس کا قول اثر لیا۔ اور میر جعفر کو سپہ سالاری کے منصب سے ہٹا کر اس کی جگہ میر مدن کو سپہ سالار بنا دیا اس کے علاوہ میر جعفر کو حکم دیا گیا کہ وہ محل سے باہر نہ نکلے اور اس پر چوبدار مقرر کر دیئے گئے۔ میر جعفر اور میرن غصے اور حسد کی آگ میں جلنے لگے۔

انگریز کلائیو کی سرکردگی میں سازشوں کے سہارے چندر نگر تک پہنچ گئے۔ سراج الدولہ نے ان کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن فوجی سرداروں نے غداری کی اور سراج الدولہ کو مصلحت اندیشی سے کلائیو سے صلح کرنا پڑی ——— اس صلح کی رو سے ایک انگریز سفیر مرشد آباد میں رہنے لگا اور یہیں سے سازش کی آگ شعلے دینے لگی۔

انگریز سفیر واٹس میر جعفر کے پاس ڈولی میں بیٹھ کر گیا اور میر جعفر سے پوچھا "کلائیو یہ جاننا چاہتا ہے کہ اگر آپ کو بنگال کی صوبے داری پر فائز کر دیا جائے تو اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

میر جعفر اندر سے سادہ کاغذ لے آیا اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر کے کاغذ واٹس کے حوالے کر دیا بولا۔" کلائیو سے کہنا انہیں اختیار ہے جو چاہیں لکھ لیں، زبانی یہ ضرور عرض کر دوں گا کہ اگر میں صوبے دار ہو گیا تو انگریزوں کے دشمن فرانسیسیوں کے کارخانے اور کوٹھیاں تباہ و برباد کر دوں گا اور انہیں بنگال میں دوبارہ نہیں آباد ہونے دوں گا۔ کلکتے اور قاسم بازار کے حملوں میں انگریزوں کا جتنا نقصان ہوا ہے اس کا معاوضہ دوں گا اور کلکتے کے اردگرد انگریزوں کو مزید زمین دی جائے گی!"

واٹس یہ کاغذ لے کر واپس چلا گیا۔

کلکتے کا امی چند نامی سکھ آمنہ بیگم کے ساتھ مل کر کاروبار کرتا تھا۔ سراج الدولہ بھی اس کا احترام کرتا تھا انگریزوں نے اسے دوسرے امراء سے سازباز کرنے پر آمادہ کر لیا۔ سارے معاملات طے پا گئے لیکن انگریزوں نے نہایت عقلمندی سے امی چند کو سازش کی شرائط سے لاعلم رکھا۔ امی چند بلا کا چالاک تھا وہ انگریز سفیر واٹس سے ملا اور اسے دھمکی دی، بولا۔" واٹس! تم نے ہم سے دوررخی برتی ہے تم لوگ بہت بے ایمان ہو، تم نے مجھ سے کام لیا اور جب انعام کا وقت آیا تو میرا حصہ بھی تم خود ہضم کر جانا چاہتے ہو، بتاؤ اگر میں سراج الدولہ کو اس سازش سے آگاہ کر دوں تو کتنے ہیں جو زندہ بچیں گے اور میں ایسا ضرور کروں گا۔"

واٹس ڈر گیا، اس نے کہا۔" ہم خود تو کوئی وعدہ کر نہیں سکتے کلکتے کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے تمہارا مسئلہ رکھ دیا جائے گا۔ وہ جو فیصلہ بھی کرے گی، تمہیں اس سے مطلع کر دیا جائے گا۔"

امی چند نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔" تم اپنی سلیکٹ کمیٹی کو مطلع کر دو کہ سراج الدولہ کے خزانے سے جو کچھ نکلے اس کا پانچ فیصد میرے حوالے کیا جائے اگر یہ شرط منظور نہ ہو تو پھر مجھے تیس لاکھ روپے علی الحساب ادا کیے جائیں!"

واٹس نے امی چند کی بات چیت کلکتے کی سلیکٹ کمیٹی کو روانہ کر دی۔

واٹس سے بات چیت کے بعد امی چند نے سراج الدولہ سے ملاقات کی اور باتوں ہی باتوں میں کہہ دیا۔ "حضور والا! آپ کو صوبے داری سے الگ کرنے کے لئے میر جعفر اور انگریزوں کے درمیان کسی سمجھوتے کا امکان موجود ہے۔ شاید ابھی یہ معاہدہ نہیں ہوا ہے لیکن کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔"

سراج الدولہ نے امی چند کا شکریہ ادا کیا اور انعام و اکرام سے نوازا اور میر جعفر کے آس پاس سخت پہرا بٹھا دیا گیا۔

کلکتے کی سلیکٹ کمیٹی نے عہد نامہ مرشد آباد روانہ کر دیا۔ اس پر میر جعفر کے دستخط ہونے تھے۔ واٹس پریشان تھا کہ چوکی پہرے کی موجودگی میں میر جعفر کے دستخط کس طرح لئے جائیں آخر اسے اپنی پہلی ترکیب سوجھی۔ اس نے پردے دار پالکی منگوائی اور اس میں بیٹھ کر پردہ گرا دیا اور یہ پالکی میر جعفر کے محل میں داخل ہو گئی۔

دبلا پتلا سفید ریش میر جعفر اپنے بیٹے اور ولی عہد میرن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے معاہدے کی شرائط پڑھیں اور وہ دستخط کرنے ہی والا تھا کہ واٹس نے قلم پکڑ لیا۔ بولا "حضور نواب صاحب! یہاں کلام پاک کا کوئی نسخہ تو ضرور موجود ہوگا!"

میر جعفر اس کا مقصد سمجھ گیا۔ جزدان سے قرآن نکالا اور ایک ہاتھ سے قرآن پاک سنبھالا دوسرا ہاتھ اپنے بیٹے میرن کے سر پر رکھا اور کہا "میں ان دونوں کی قسم کھا کر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس معاہدے کی ہر دفعہ اور ہر شرط پر پوری دیانت داری سے عمل کروں گا۔"

اس کے بعد اس نے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔

واٹس اسی وقت واپس چلا آیا۔ امی چند سے اس نے یہ کہا کہ "تمہیں تیس لاکھ روپے ادا کر دیئے جائیں گے۔ سلیکٹ کمیٹی کا معاہدہ کلکتے میں موجود ہے، وہاں جا کر اسے دیکھ سکتے ہو!"

امی چند نے کلکتے پہنچ کر وہ عہد نامہ دیکھ لیا جس میں امی چند کو تیس لاکھ روپوں کی ادائیگی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ عہد نامہ بادامی کاغذ پر تھا اور اس پر امیر البحر واٹسن اور کلائیو کے دستخط بھی موجود تھے۔

ان معاہدات کے بعد کلائیو کا رویہ سخت ہو گیا، اور وہ کلکتے سے مرشد آباد کی طرف فوجیں لے کر بڑھا۔ اپنی اس پیش قدمی کے جواز میں کلائیو نے سراج الدولہ کو لکھا۔ "آپ کے اور انگریزوں کے درمیان اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں بہتر ہے کہ اس معاملے میں آپ اپنے ہی امرا کو حَکم بنا لیں، ان میں میر جعفر کا نام میں بطور خاص لوں گا، یہ اگر ہمیں مورد الزام ٹھہرائیں گے تو میں خاموشی اختیار کر لوں گا لیکن اگر انہوں نے آپ کو غلطی پر ٹھہرایا تو پھر آپ ہمارے نقصانات کی تلافی کریں گے، بارشیں شروع ہو چکی ہیں اور چونکہ

آپ کی طرف سے جواب آنے میں دیر ہو جایا کرتی ہے، اس لئے میں خود ہی آپ کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

سراج الدولہ پریشانی کے عالم میں نظر بند میر جعفر کے پاس پہنچا۔ اس مایوسی کی حالت میں سراج الدولہ نے یہی مناسب سمجھا کہ میر جعفر کو ناراض نہ کیا جائے کیونکہ انگریزوں سے جنگ کرنے کے لئے تجربہ کار سپہ سالار کی سخت ضرورت تھی۔

بوڑھا سپہ سالار نوجوان صوبے دار کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، بوڑھے سپہ سالار نے آج سراج الدولہ میں وہ چستی اور طراری نہیں دیکھی جو اس کا فطری خاصہ تھی۔ وہ سست اور مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تنہائی کا احساس پایا جاتا تھا۔

میر جعفر نے سوال کیا۔ "اس ناچیز کے لئے کوئی نیا حکم؟"

سراج الدولہ میر جعفر کے سینے سے لگ گیا۔ بولا۔ "آپ ہماری فوج کے سپہ سالار ہی نہیں ہمارے پھوپھا بھی ہیں، ہم دونوں میں خون کا رشتہ بھی موجود ہے کیا اس برے وقت میں آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟"

میر جعفر نے محبت سے سراج الدولہ کی پشت تھپتھپائی اور پر جوش آواز میں کہا۔ "مرزا محمد! آپ ہماری طرف سے ہمیشہ بدگمان رہے ہیں حالانکہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ آپ کے مقابلے میں ان سفید فام غیر ملکیوں کی کیا حیثیت ہے۔ آپ نے بے بنیاد شبہات پر ہمیں سپہ سالاری سے الگ کیا۔ ہمیں نظر بند کر دیا لیکن ہم نے ہمیشہ یہ سوچ کر ذلیتی گوارا کر لیں کہ آپ ابھی نوجوان اور ناتجربے کار ہیں کبھی نہ کبھی آپ پر اصل حقائق واضح ہو جائیں گے چنانچہ شاید وہ وقت اس وقت میرے سامنے ہے اور آپ اپنی غلطیوں پر ندامت محسوس کر رہے ہیں!"

"ہاں!" سراج الدولہ نے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ پرانی باتیں بھلا کر نئے سرے سے تعلقات استوار کریں!"

میر جعفر نے کہا۔ "ہم نے سب کچھ بھلا دیا!"

سراج الدولہ نے کلام پاک طلب کیا۔ جب یہ آگیا تو اس نے اسے اپنے سر پر رکھ لیا اور قسم کھائی۔ "ہم صوبے دار بنگالہ مرزا محمد سراج الدولہ یہ عہد کرتے ہیں کہ ہمیشہ اپنے پھوپھا میر جعفر کے ہمدرد رہیں گے، اور زندگی کے آخری لمحات تک ان کا ساتھ دیں گے!"

اس کے بعد میر جعفر نے قرآن پاک کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا اور چند قدم چل کر قسم کھائی۔ "ہم میر جعفر پھوپھا مرزا محمد سراج الدولہ عہد کرتے ہیں کہ ان کے ہمیشہ وفادار رہیں گے اور ان کی وفاداری میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے، اگر ہم اس سے روگردانی کریں تو خدا ہمیں کسی

عذاب میں مبتلا کر دے!"

میرن کچھ دور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، آخر میں نفرت سے منہ ٹیڑھا کر کے اندر چلا گیا۔

میر جعفر اور سراج الدولہ کی آوازیں بھر آگئیں، میر جعفر کی داڑھی اور سراج الدولہ کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں، اس کے بعد میر جعفر سراج الدولہ کی خاطر مدارات کے لئے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بہو چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور سراج الدولہ سے کہا "حالات کا کیا رنگ ہے میں نہیں جانتی لیکن ابھی میر جعفر اپنے بیٹے میرن سے باتیں کرتے ہوئے فارسی کا یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

بسالی ز جورت جگر خوں کنم　　　　بیک ساعت از دل بدر چوں کنم

(ایک سال تک تیرے جس ظلم سے جگر کو خون کرتا رہا ہوں (کس طرح ممکن ہے کہ) اسے ایک پل میں دل سے نکال دوں)۔

سراج الدولہ نے اسے جھڑک دیا۔ بولا۔ "ہمارا دماغ نہ خراب کرو۔ ہم نے اپنی کشتی مقدر حالات کے حوالے کر دی ہے، جو ہونا ہے، ہو رہے گا گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں!"

دریائے بھاگیرتی جنوب میں بہتے بہتے آموں کے باغ سے ذرا آگے ایک دم مغرب شمال کا رخ اختیار کرتی ہے اور پھر بتدریج گولائی میں گھومتی ہوئی، جنوب سے مشرق اور مشرق سے شمال مشرق میں عین اس جگہ پہنچ جاتی ہے، جہاں سے اس نے مغرب شمال کا رخ اختیار کیا تھا۔ اس گھماؤ پھراؤ نے بھاگیرتی کی شکل گھوڑے کے سم جیسی بنا دی تھی آموں کے باغ سے شمال مشرق کے آخری موڑ پر سراج الدولہ کی فوج پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ بھاگیرتی نے یہاں پر پھر مشرق میں گھومتے ہوئے بتدریج، دائرے میں جنوب مغرب میں بہنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں پر کلائیو اپنی فوج لئے پڑا تھا یہاں خندقیں کھدی ہوئی تھیں اور خندقوں کے اس پار دریا کے کنارے باغ تھا۔ اس باغ میں کلائیو اور اس کی فوج تھی، یہیں سراج الدولہ کی شکارگاہ تھی جس پر کلائیو قابض تھا۔ سراج الدولہ کی افواج نے اس کے مقابل پہنچ کر ہلالی شکل اختیار کر لی، اس ہلالی فوج کا وہ حصہ جو انتہائی جنوب میں پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ میر جعفر کے زیر کمان تھا، اور اس سے تھوڑے فاصلے پر کلائیو کی فوج تھی۔ بظاہر کلائیو سراج الدولہ کے ترغے میں آچکا تھا۔ کلائیو نے شکارگاہ کی چھت سے میدان جنگ کا نقشہ دیکھا تو گھبرا گیا کیونکہ اگر میر جعفر اور دوسرے فوجی سردار ذراسی وفاداری دکھا جاتے تو کلائیو کا ایک آدمی بھی بچ کر نہ نکل سکتا تھا۔ کلائیو نے امی چند کو اپنے پاس ہی روک رکھا تھا۔ اس نے امی چند کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔

"امی چند! یہ کیا چال ہے، مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ سراج الدولہ کی فوج بہت تھوڑی ہو

گی، لیکن یہ تو بہت بڑی ہے!"
امی چند نے کہا۔ "گھبرائیں مت، انتظار کیجئے۔ معاملات معاہدے کے مطابق ہی طے پا جائیں گے!"
کلائیو نے میر جعفر کو پیغام بھیجا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ جن معاملات کا خود آپ کی ذات سے تعلق ہے آپ ان میں ہمت سے کام نہیں لے رہے، میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں، اس وقت تک میں مذبذب اور فکرمند رہوں گا جب تک آپ کا جواب میرا حوصلہ نہ بڑھائے گا!"
میر جعفر نے اس کا جواب جوتے میں سی کر روانہ کیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "آپ پریشان نہ ہوں جب جنگ شروع کریں تو کسی طرح تھوڑی دیر پہلے ہمیں اس سے مطلع ضرور کر دیں، منصوبے پر پوری طرح عمل کیا جائے گا!"
دوسرے دن صبح سورج طلوع ہوا تو سراج الدولہ کی فوج میں ہاتھیوں کی سرخ جھولیں آگ کی طرح نظر آئیں شہسواروں کی تلواریں باہر آگئیں اور توپوں نے گولے اگلنے شروع کر دیئے۔ جواب میں انگریزوں نے بھی گولہ باری کی اور اتفاق کی بات کہ ان کا ایک گولہ سراج الدولہ کے وفادار ترین سپہ سالار میر مدن کے لگا جس سے اس کی ایک ٹانگ اڑ گئی، اسے زخمی حالت میں سراج الدولہ کے خیمے میں لایا گیا۔ اس نے چند اکھڑی اکھڑی سانسیں لیں اور رخصت ہو گیا۔ سراج الدولہ کی ہمت جواب دے گئی۔
دھوپ رخصت ہو گئی آسمان بادلوں میں چھپ گیا اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، میدان جنگ میں پھیلی ہوئی بارود کو پانی کے رحم و کرم پر ہی چھوڑ دیا گیا اور وہ ساری بھیگ کر بیکار ہو گئی لیکن کلائیو نے بارود کی ذخائر پانی سے بچا لئے تھے، یہ اطلاعات سراج الدولہ کو پریشان کر رہی تھیں، اس نے میر جعفر کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔
جب میر جعفر سراج الدولہ کے خیمے میں داخل ہوا تو سراج الدولہ نے اپنے سر سے دستار اتاری اور اس سفید ریش غدار کے قدموں میں رکھ دی اور بھرائی آواز میں کہا۔ "میر جعفر! خدا کے لئے ہماری غلطیاں معاف کر دیجئے یہ دستار جو اس وقت آپ کے قدموں میں پڑی ہے، علی وردی خاں کی دستار ہے جو آپ کا برادر نسبتی اور محسن تھا۔ دیکھو اس پر آنچ نہیں آنی چاہیئے!"
میر جعفر نے دستار دوبارہ سراج الدولہ کے سر پر رکھ دی، کہا۔ "مرزا محمد! آپ مطمئن رہیں، اس دستار پر ہم ہرگز آنچ نہ آنے دیں گے۔"
اور دونوں ایک بار پھر بغل گیر ہو گئے۔
جب میر جعفر دوبارہ اپنے کیمپ میں پہنچا تو وہاں کلائیو کا پیغام پہلے سے موجود تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "میں سخت پریشان ہوں، آپ نے میری کوئی مدد نہیں کی!"

میر جعفر نے فوراً جوابی پیغام بھیجا۔ "بالکل بے فکر رہیں، ہم اپنے عہد پر چٹان کی طرح قائم ہیں، وقت آنے دو، ہم اپنا فرض پوری طرح ادا کریں گے۔"

رات ہوئی تو سراج الدولہ نے افسروں کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔

ہر ایک نے یہی مشورہ دیا کہ بارود بھیگ چکی ہے اور عملاً ہم جنگ ہار چکے ہیں۔

سراج الدولہ نے مایوس ہو کر پوچھا۔ "اگر ہم جنگ واقعی ہار گئے تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

سب نے بالاتفاق کہا۔ "آپ فوراً مرشد آباد تشریف لے جائیں اور نئی فوج اکٹھا کریں، پٹنہ سے بھی مدد طلب کریں، جب تک آپ واپس نہ آئیں گے ہم یہاں لڑتے رہیں گے۔"

سراج الدولہ نے غداروں کے مشورے پر عمل کیا وہ پلاسی کے میدان سے بھاگ کر مرشد آباد پہنچا اور وہاں سے اپنی بیوی لطف النسا کو ساتھ لے کر پٹنہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

سراج الدولہ کے جاتے ہی میر جعفر نے کلائیو سے درخواست کی۔ "ہم ملاقات کرنا چاہتے ہیں!"

کلائیو نے ملاقات کو دوسرے دن پر ٹال دیا۔

دوسرے دن میر جعفر ہاتھی پر سوار ہوا۔ پیچھے اس کا بیٹا میرن بیٹھا تھا۔ ہاتھی کلائیو کے کیمپ کی طرف بڑھا۔ کلائیو کیمپ سے باہر نکلا۔ انگریزوں نے اسے سلامی دی، کلائیو نے اسے نیچے اتارا اور بغل گیر ہو گیا اور کہا۔ "اب آپ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے حکمران ہیں۔"

اس کے بعد تینوں ایک خیمے میں گئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے کلائیو نے میر جعفر کو مشورہ دیا کہ "فوراً مرشد آباد پہنچ کر سراج الدولہ کے خزانے پر قبضہ کر لیجیئے۔"

میر جعفر، دو سو انگریز اور تین سو ہندوستانی سپاہ کے ساتھ مرشد آباد میں داخل ہوا۔ اور سراج الدولہ کی املاک پر قابض ہو گیا۔ مہر النسا نے آگے بڑھ کر نئے صوبے دار کی پیشوائی کی اور ابھی وہ مبارک باد پیش بھی نہ کر سکی تھی کہ میرن آگے بڑھا اور اس کے رخساروں پر دو طمانچے رسید کر دیئے۔ مہر النسا چکرا کر گر گئی میرن نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ "اسے بند کر دیا جائے۔"

مہر النسا قید میں ڈال دی گئی۔

تین دن بعد سراج الدولہ کی کشتی راج محل سے چار میل دور موضع نیچر پور کے ایک ویران ساحل پر رکی اور بھوکے پیاسے میاں بیوی دم لینے کی خاطر اتر پڑے اور ایک ویران کٹیا میں پناہ لی۔ اس کٹیا کا مالک دانا شاہ سراج الدولہ سے واقف تھا دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کبھی کسی جرم میں سراج الدولہ نے اس کا ایک کان کٹوا دیا تھا۔ دانا شاہ نے مسکراتے ہوئے اس غریب الوطن صوبے دار کا استقبال کیا اور اپنے کٹے

ہوئے کان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔" حضور والا! میرا یہ کان آپ کے پاس امانتاً رکھا ہوگا کیا یہ امانت میں طلب کر سکتا ہوں؟"

سراج الدولہ نے کہا۔" ہم بھوکے ہیں پہلے ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کرو اس کے بعد کوئی اور بات ہوگی!"

دانا شاہ راج محل کے فوجدار میر قاسم کے پاس پہنچا اور اسے سراج الدولہ کی موجودگی کی اطلاع دی، میر قاسم، میر جعفر کا داماد تھا اس نے دونوں کو گرفتار کر کے مرشد آباد روانہ کر دیا۔

مرشد آباد کی مبارک منزل کے عظیم الشان باغ میں ایک شاندار اجتماع ہوا۔ امرائے رنگ برنگے لباس میں ملبوس تھے اور ان کی دستاروں میں قیمتی جواہرات چمک رہے تھے۔ میر جعفر سنگ مرمر کے ایک تخت کے قریب کھڑا کلائیو کا منتظر تھا۔ کلائیو آگے بڑھا۔ میر جعفر نے کلائیو کو ہار پہنایا اور اس پر عرقِ گلاب چھڑکا۔ کلائیو نے اسے تخت پر بٹھا دیا اور نذرانے میں سو اشرفیاں پیش کیں، اور سر جھکا کر نیاز مندانہ پیچھے ہٹا۔ اور بنگال، بہار اور اڑیسہ کے نئے حکمران کی حیثیت سے میر جعفر کی خدمت میں کورنش بجا لایا۔ اور اپنی مختصر سی تقریر میں درباری امرأ کو یہ بتایا کہ " اب میر جعفر تمہارے نواب ہیں ان کے ساتھ وفاداری سے پیش آنا تمہارے فرائض منصبی میں داخل ہے!"

شب کی سیاہی میں تیرہ بخت سراج الدولہ مبارک منزل کے اس شاہانہ کمرے میں جہاں کبھی وہ خود رہتا تھا۔ میر جعفر کے سامنے اس طرح پیش ہوا کہ وہ سر سے پیر تک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ غدار سپہ سالار نے بے حیائی سے سراج الدولہ سے آنکھیں ملائیں اور مسکرانے لگا۔ سراج الدولہ کی حیران آنکھیں ساکت رہ گئیں، سراج الدولہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میر جعفر سامنے سے ہٹ گیا۔ اور اپنی جگہ میرن کو بھیج دیا۔ میرن نے آتے ہی سراج الدولہ کے چند ٹھوکریں رسید کیں، سراج الدولہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔ کمرے کا ماحول دھواں دھواں ہو گیا یہاں کی ہر شے دھندلاہٹ کا شکار تھی، اس دھندلاہٹ میں اس نے ایک طرف خاموش بیو کو کھڑے دیکھا جو میرن کو منع کر رہی تھی "بس میرن! جو ہونا تھا ہو چکا اب یہ ہمارے رحم کا حق دار ہے!"

میرن نے حکم دیا۔" اسے قید کر دیا جائے!"

اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ اتنی خاموشی سے ہو رہا تھا کہ محل کی بیگمات تک تیزی سے پیش آنے والے واقعات سے بے خبر تھیں۔

منی اور ببو نے سراج الدولہ کی تاریک کوٹھری میں قدم رکھا اور اپنے آگے پیچھے دست بستہ خدمت گاروں کی چھوٹی سی فوج کے ذریعے اپنی بیگمانہ شان کا مظاہرہ کیا۔

منی نے تمکنت سے پوچھا۔" کہاں گئیں تیری خاندانی وجاہت اور آن؟ اب تیرے خاندان کی عزت اور عظمت میری جوتیوں میں ہے!"

بیوٹے نے لجاجت سے کہا۔ "متی! یہ مصائب کا مارا نوجوان ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے!"

اسی وقت میرن آیا اور انہیں کوٹھڑی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ دونوں کے ساتھ وہ خود بھی واپس گیا۔ باہر سے اس کی آواز صاف آرہی تھی، سراج الدولہ نے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "رحم اور ہمدردی کے جذبات کسی مصرف کے نہیں، یہ معاملات کو بگاڑ دیتے ہیں، اس لئے یہ قابلِ نفرت ہیں!"

تھوڑی دیر بعد کوٹھڑی کا دروازہ پھر کھلا اور محمد بیگ نامی ایک شخص، پہرے دار کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ سراج الدولہ نے سہم کر خنجر پر نظر ڈالی اور کہا۔ "کیا تمہیں یہ بات بھی پسند نہیں کہ ہم اپنی باقی زندگی اس کنجِ عافیت میں رہ کر گزار دیں؟"

محمد بیگ نے سراج الدولہ کی آواز کسی بہرے کی طرح سنی اور اپنی طاقتور کلائی سے سراج الدولہ کو چھید ڈالا۔ خنجر بار بار سراج الدولہ کے جسم میں پیوست ہو ہو کر نکلتا رہا۔ سراج الدولہ نے ادھر ادھر دیک کر اور ہاتھوں کو بار بار خنجر کے سامنے کر کے جان بچانے کی ناکام کوشش کی اور اپنی ہتھیلیوں اور کلائیوں کو بھی چھلنی کرا ڈالا۔ زخموں سے بے دم ہو کر وہ گر گیا۔ اس کا چہرہ تک لہولہان ہو چکا تھا۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی اور ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بس کرو، بس اب ہم خود ہی مر جائیں گے!"

مرنے کے بعد اس کی لاش ہاتھی پر ڈال کر مرشد آباد کی سڑکوں پر پھرائی گئی لوگ سراج الدولہ کے اس انجام پر حیرت زدہ رہ گئے، محل کے ایک جھروکے سے یہ عبرتناک منظر سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم نے بھی دیکھا اور پاگلوں کی طرح محل کے باہر نکل گئی، دوڑ کر ہاتھی کے پاس پہنچ گئی اور بدقسمت سراج الدولہ کی لاش ہاتھی پر سے اتاری اور اس کے چھلنی جسم کو بوسے دینے لگی۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی اس کا سر دوپٹے اور پیر جوتیوں سے محروم تھے، اس منظر کو میرن نے بھی دیکھا اور اس نے چند ملازموں کو آمنہ کی گرفتاری کے لئے روانہ کر دیا۔ ان ملازموں نے آمنہ بیگم کو نہایت بے رحمی سے پکڑ کر کھینچ لیا اور مارتے پیٹتے واپس لے گئے۔ اس کے بعد آمنہ بیگم اور مہر النسا کو جہانگیر نگر (ڈھاکے) روانہ کر دیا گیا۔

میر جعفر نے صوبے داری کے صلے میں دو کروڑ ستر لاکھ روپے کمپنی کو ادا کئے۔ اس میں سے بارہ لاکھ اسی ہزار کلائیو کے حصے میں آئے اور چوبیس پرگنوں کی زمینداری بھی کمپنی کو دی گئی۔ کلائیو کو الگ جاگیر ملی جس کی سالانہ آمدنی اٹھائیس ہزار پونڈ تھی۔

کلائیو اور میر جعفر باہر نکلے تو وہاں امی چند اپنے نوکروں کی پلٹن لئے ان کا منتظر نظر آیا۔ کلائیو اسے دیکھ کر مسکرایا اور رک لیتے ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ اور خود میر جعفر کے ساتھ آگے بڑھ گیا کلائیو کا ساتھی امی چند کے قریب گیا اور بے مروتی سے کہا۔ "امی چند! جو عہد نامہ تمہیں دکھایا گیا تھا، وہ جعلی تھا، کلائیو نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس فریب سے میں تمہیں مطلع کر دوں، تم سے دھوکا کیا گیا تھا اس لئے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا!"

امی چند نے کسی پاگل کی طرح آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور نیم ہوش آواز میں پوچھا "مجھ سے دھوکا کیا گیا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں تم سے دھوکا کیا گیا تھا۔ اصل معاہدہ جو سفید کاغذ پر تھا اس میں تمہارا کوئی ذکر نہیں ہے' دوسرا جو بادامی کاغذ پر تھا اور تمہیں دکھا دیا گیا تھا وہ جعلی تھا' اس میں ایڈمرل واٹسن کے جعلی دستخط بھی خود کلائیو نے کر دیئے تھے!"

امی چند بے ہوش ہو کر گر گیا اور اس کے آدمی اسے پالکی میں ڈال کر اٹھا لے گئے۔ جب وہ ہوش میں آیا تو پتہ چلا کہ اس کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے' کلائیو اس سے ملا اور اس نے اس پاگل کو تیرتھ یاترا کا مشورہ دیا۔ وہ مالدہ گیا اور دیوانگی ہی میں جان دے دی۔

کچھ عرصے بعد میرن نے مہر النساء اور آمنہ بیگم کو جہانگیر نگر (ڈھاکہ) سے مرشد آباد بلایا۔ جسارت خاں سو سواروں اور ایک جمعدار کے ساتھ ڈھاکے پہنچا اور انہیں مرشد آباد طلبی کا فرمان سنایا۔ دونوں کو کشتی میں بٹھا کر مرشد آباد روانہ کر دیا گیا۔ جب کشتی نے دو میل کا فاصلہ طے کیا تو جمعدار نے انہیں میرن کے اصل فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

"بدنصیب بیگمو! ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم کشتی میں سفر کر رہی ہو تو ہم تمہیں پانی میں گرا کر ڈبو دیں!"

جمعدار کے حکم پر سپاہی ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں بے بس کر کے ان کے پیروں میں بھاری پتھر باندھ دیئے' ان دونوں نے مچل مچل کر سپاہیوں سے چھٹ جانا چاہا لیکن سپاہیوں نے انہیں پانی میں دھکیل دیا اور جب انہوں نے دوبارہ کشتی پر چڑھنے کی کوشش کی تو ان کے سروں اور گردنوں پر لاٹھی کی ضربیں لگا لگا کر پانی میں دھکیل دیا گیا۔ کئی سپاہیوں نے ان کے مصروف جدوجہد ہاتھوں کو کلائی سے کاٹ دیا۔

کہتے ہیں ڈوبتی ہوئی آمنہ بیگم کے آخری کلمات یہ تھے۔ "خدایا! ہمیں یقین ہے کہ تو ظالم میرن کو معاف نہیں کرے گا اور انتقام تو خود لے گا!"

اس رات میرن پٹنے میں فوج لئے پڑا تھا۔ اس نے احتیاطاً اپنا خیمہ چھوڑ دیا اور ایک معمولی خیمے میں رات گزارنے چلا گیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی' ایک خوفناک کڑک کے ساتھ بجلی گری اور میرن کو جلا کر غائب ہو گئی اس کے سر میں چھ شگاف ہو گئے اور اس کے سرہانے رکھی ہوئی تلوار بھی جگہ جگہ سے چھلنی ہو گئی۔ جس چارپائی پر لیٹا تھا وہ بھی جل گئی۔

یہ ۱۷۶۵ء ہے' جنگ پلاسی کو گزرے آٹھ سال ہو چکے ہیں' میر جعفر دوسری بار مرشد آباد کے تخت پر بیٹھا۔

درمیان میں ایک بار انگریزوں نے اسے معزول کر دیا تھا۔ چوہتّر سالہ یہ بوڑھا محل کے ایک کونے میں یکہ و تنہا پڑا ہوا تھا۔ متی بیگم اور بہو قریب ہونے کے باوجود اس سے کوسوں دور تھیں، خدمت گار اس کے پاس جاتے ہوئے گھنیاتے تھے، اس کی ناک، کان اور انگلیاں گل کر گر چکی تھیں، وہ جذام میں مبتلا سسک رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس نے آخری سانس لی تو اس کے حلق میں پانی کے چند قطرے ڈالنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

تاریخ اسلام کے ظالم و جابر حجاج بن یوسف کی قلمی تصویر۔ اس کا نام خوف اور دہشت کا پیغام تھا، بڑے بڑے سرکشوں اور بہادروں کو لرزہ براندام کردینے والے سفاک مدّبر کا جب ایک عورت سے واسطہ پڑا اور یہ پتھر اُس شیشے سے ٹکرایا تو پتھر پاش پاش ہوگیا۔ دہشت، خوف، تجسس اور رومان کا ایک خوبصورت ترین امتزاج۔

سخی داستان

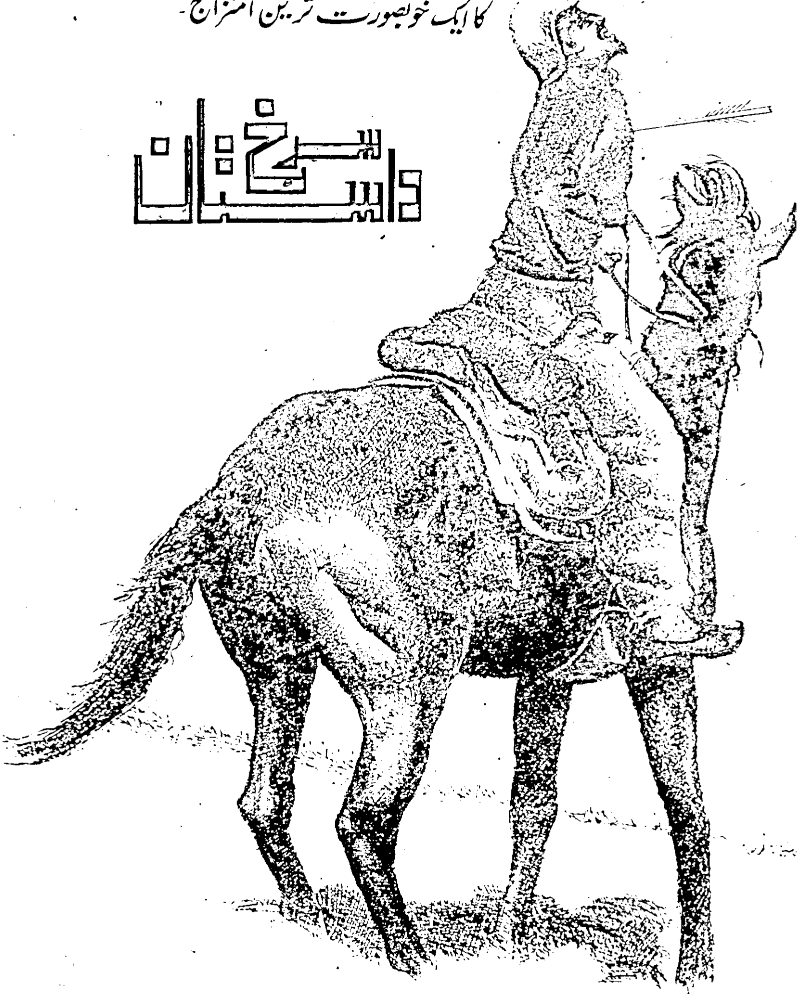

سانحۂ کربلا کو گزرے ہوئے تقریباً بارہ سال ہو چکے تھے اس مختصر مدت میں دنیائے اسلام پر اختلاف اور انتشار کی کئی آندھیاں حملہ آور ہوئیں اور سخت جان اسلام چٹان کی طرح ان کے مقابل ڈٹا رہا۔ کربلا میں حضرت امام حسین ؑ خود اپنے اپنے اہل و عیال اور رفیقوں کے خون سے اسلام کی مُرجھائی ہوئی جڑوں کی آبیاری کر چکے تھے۔ بنو اُمیہ کی خوش قسمتی سے انہیں عبدالملک بن مروان جیسا اقبال مند اور صاحبِ تدبیر خلیفہ میسّر آ گیا۔ چاروں طرف خودسری کی ہوائیں چل رہی تھیں جو سردار بھی اپنے آس پاس چند آدمی جمع کر لیتا وہ عبدالملک کے خلاف باغیانہ روش اختیار کرتا۔ عبدالملک کی اپنی فوج کا یہ حال تھا کہ جس کا جی چاہتا سفر و حضر میں عبدالملک کا ساتھ دیتا اور جس کا نہ جی چاہتا ساتھ چھوڑ دیتا۔ کوفے اور بصرے جیسی چھاؤنیوں کے لوگ آرام طلب اور موقع پرست ہو گئے تھے انہیں جنگوں سے زیادہ سازش اور سیاست پسند آنے لگی تھی۔ خلیفہ کے احکام سے روگردانی ان کے لئے نہایت معمولی بات تھی۔ قصرِ خلافت سے اُنہیں حکم ملتا کہ فوج کی اتنی تعداد باغیوں کے مقابلے پر روانہ کر دی جائے لیکن اس حکم کی تعمیل کرانے کی کسی ایک میں بھی ہمّت نہ تھی چاروں طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا۔

دمشق سے دُور مکّے میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے نواسے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضؓ اپنی خلافت قائم کر چکے تھے۔ ان کی موجودگی میں عبدالملک کا امیر المومنین بن جانا ناممکن تھا عبدالملک کو ہر وقت یہی دھڑ لگا رہتا کہ کہیں اس کے اپنے آدمی عبداللہ ابن زبیر رضؓ سے نہ جا ملیں۔ یہی خدشہ اسے سختی کے بجائے نرمی اور جنگ کے بجائے سازش اور سیاست پر کاربند رکھتا۔

عبدالملک نے کوفے سے بصرے کی طرف کوچ کیا تو اسے یہ دیکھ کر غصّہ آیا

کہ بہت سے فوجی بدستور کھانے پینے میں مشغول تھے اور ان کے چہروں پر سفر کے اضطراب کی جگہ قیام کے سکون کا قبضہ تھا۔ عبدالملک نے صاحب الشرطہ (انسپکٹر جنرل پولیس) روح بن زنباغ کو طلب کیا اور اس سے شکایتاً مشورے کے طور پر کہا "ابن زنباغ! فوج میں نظم و ضبط ختم ہو چکا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح بحال کیا جائے؟"

ابن زنباغ نے جواب دیا "امیر المومنین تشدد ہی اس کا حل ہے!"

عبدالملک نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا، بولا "ان حالات میں کہ مکے میں ابن زبیر خلافت کے دعویدار ہو چکے ہیں اور کوفے کے آس پاس بھی بغاوتیں ہو رہی ہیں کیا ہماری سختی سے یہ سرکشی اور سازشیں نہ اختیار کریں گے؟"

ابن زنباغ نے کہا "امیر المومنین! سختی آپ نہیں کریں گے بلکہ میں آپ کو ایک ایسا آدمی دیتا ہوں جو سب کو سیدھا کر دے گا!"

عبدالملک نے بے چینی سے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

ابن زنباغ نے جواب دیا "وہ میرا ماتحت ہے!"

حکم ہوا "اسے فوراً حاضر کیا جائے!"

ذرا دیر بعد ابن زنباغ نے گندمی مائل گھنیری داڑھی، بڑے بڑے کان، طوطے جیسی ناک اور چوڑے چکلے درمیانی قد کے ایک شخص کو عبدالملک کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس کے ہاتھ بھی دوسروں سے زیادہ لمبے تھے۔ کھڑے ہونے پر گھٹنوں کے اوپر تک پہنچ جاتے تھے، عبدالملک نے پہلی نظر میں ہی یہ محسوس کر لیا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخص ہے!

عبدالملک نے پوچھا "تیرا کیا نام ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "حجاج ابن یوسف!"

"تو کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "بنو ثقیف سے!"

عبدالملک نے کہا "اگر ہم تجھے اپنی افواج کا افسر اعلیٰ بنا دیں تو کیا تو اسے نظم و ضبط کا خوگر بنا دے گا؟"

حجاج نے جواب دیا "امیر المومنین! ماتحت کے سامنے دو راہیں ہوتی ہیں، حکم کی تعمیل یا موت، ان دو کے سوا مجھے کسی تیسری بات کا علم نہیں ہے اور اگر میرا کوئی ماتحت حکم کی تعمیل نہیں کرتا تو اسے اس بات کا پوری طرح یقین ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔"

عبدالملک اس عجیب و غریب شخص کی باتوں سے ذرا متاثر ہوا، پوچھا" زیادہ سختی لوگوں کو تمرد اور سرکشی پر آمادہ کردیتی ہے تیرے پاس اس کا بھی کوئی حل ہے؟"

حجاج نے جواب دیا" سازش، سیاست، تمرد اور سرکشی یہ سارے متعدی امراض ہیں ان پر سختی اور تشدد ہی سے قابو پایا جاسکتا ہے"

عبدالملک نے اسے اپنی افواج کا افسر اعلا بنا دیا۔

حجاج نے نظم ونسق کی بحالی اور سپاہ میں مستعدی پیدا کرنے کے لئے جس ظلم و شقاوت سے کام لیا۔ اس کا شہرہ جنگل کی آگ کی طرح دور دور پھیلتا چلا گیا۔

لوگ حجاج کی بابت طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے، وہ چند پر مہربانیاں کر کے اکثریت کو ظلم و تشدد سے دبائے رکھتا اور پھر اکثریت بھی اس کی اطاعت اور فرماں برداری ہی میں اپنی عافیت سمجھ کر اطاعت اور وفاداری کا دم بھرنے لگتی۔ اس نے بہت جلد سپاہیوں کے دلوں میں اپنا خوف بٹھا دیا۔

سرسبز و شاداب بصرے میں قیام کئے ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک تجربے کار اور عقلمند بوڑھے نے حجاج کو ایک انوکھی تدبیر سے زیر کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ اگر نشانہ خطا کر گیا تو اس کی موت یقینی ہے۔ اس نے بصرے کے شمالی محلے کی ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ کا بڑا چرچا سنا تھا، دو دن کی کوششوں کے بعد وہ اسے دیکھنے میں کامیاب ہوگیا، یہ واقعی بہت حسین تھی، اتنی حسین کہ اس بوڑھے نے اپنی ستر سالہ زندگی میں اس جیسی کوئی اور لڑکی نہ دیکھی تھی، دوشیزہ کا نام ہندہ تھا اور اس کے باپ کا نام نعمان تھا۔ یہ شخص طائف کا رہنے والا تھا اور یہاں تجارت کر کے گزر اوقات کر رہا تھا۔ بوڑھے نے سوچا اگر حجاج بن یوسف کا ہندہ سے سامنا کرا دیا جائے اور سنگدل حجاج اس پر عاشق ہوجائے تو اس کی ساری شقاوت اور مستعدی ہوا ہوجائے گی۔

بوڑھا ڈرتے ڈرتے خیمے کے پچھلے راستے سے اندر داخل ہوا تو حجاج کو مضطرب ٹہلتا ہوا پایا۔ آہٹ پاتے ہی حجاج نے گھوم کر دیکھا۔ اور خونخوار نظروں سے دیکھتا ہوا گرجا" تو کہاں تھا، او بدبودار عورت کے جنے؟"

بوڑھے کی غیرت جوش کھا گئی ذرا اونچی آواز میں بولا" سردار! مجھے گالی مت دو!"

حجاج کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ بڑھ کے کوڑے برسانے شروع کردیئے، بوڑھا اس مصیبت کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ اس نے تلوار کے دستے پر جیسے ہی ہاتھ رکھا حجاج نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور بجلی جیسی سرعت سے کام لے کر اپنی تلوار سے اس کا بازو کاٹ دیا بوڑھا چیخ مار کر ڈھیر ہوگیا۔

حجاج چیخ رہا تھا "کیا تو نہیں جانتا کہ اس وقت تو حجاج ثقفی سے باتیں کر رہا ہے جو حکم کی تعمیل یا موت کے اصول پر اپنے ماتحتوں سے تعلقات رکھتا ہے!"

بوڑھے نے تڑپتے ہوئے کہا "سردار تو مجھے ہلاک کر دے، مجھے کوئی پروا نہیں لیکن جب حسین ترین، حوروں جیسی شکل اور غیر معمولی عقل والی ہندہ کسی اور کے قالب میں چلی جائے گی، تب میں تجھے یاد آؤں گا!"

حجاج نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "کون ہندہ؟ کہاں ہے وہ؟ تو اسے کیونکر جانتا ہے؟"

بوڑھے نے نیم بے ہوشی میں جواب دیا "اُساوِرہ نہر کے کنارے اس پری پیکر اور حور شمائل کا مکان ہے، مجھے اپنی موت یا زخم کا کوئی ملال نہیں لیکن ملال صرف اتنا ہے کہ ہندہ تیرے لائق تھی سردار، مگر تیری لاعلمی کی وجہ سے وہ کسی اور کے تصرف میں چلی جائے گی!"

حجاج اس پر جھک گیا، بولا "جو کچھ تو کہنا چاہتا ہے سچ سچ بتا دے!"

بوڑھے کے کٹے ہوئے بازو سے خون کی دھار کسی سرشور چشمے کی طرح اُبل رہی تھی بوڑھا نیم بے ہوشی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا "اُساوِرہ نہر کے کنارے نعمان تاجر۔ اس کی بیٹی ہندہ۔ نہایت حسین، پری صورت، حور سیرت رسا اور طباع ذہن کی مالک..... پھر بے ہوشی میں بوڑھے کا تحت الشعور بڑبڑایا "ایک ایسا فتنہ جو تیرے سارے کس بل نکال دے گا!"

حجاج نے ساری باتیں ذہن میں محفوظ کر لیں، اس کے بعد اس نے ایک بار پھر جھک کر بوڑھے کی حالت کا جائزہ لیا اور یہ کہتا ہوا سیدھا ہو گیا "غالباً اب تجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں!" اس کے بعد اس کا تلوار والا ہاتھ ایک بار پھر فضا میں بلند ہوا اور بوڑھے کی گردن کٹ کر ایک طرف جا گری۔ بوڑھے کا لاشہ پھڑکنے لگا۔

پھر حجاج نے تالی بجائی جس کے جواب میں کئی خدمت گار حاضر ہو گئے۔

حجاج نے انہیں حکم دیا "اس ملعون کی لاش دجلہ کے حوالے کر دی جائے!"

غلاموں نے لاش سمیٹ لی اور اسے دریائے دجلہ میں پھینک کر واپس آ گئے۔

حجاج اپنے خیمے میں دیر تک ہندہ کی بابت سوچتا رہا۔ سینے میں ایک بھٹی جل رہی تھی جو اسے ہندہ تک پہنچنے اور اسے دیکھنے پر آمادہ کر رہی تھی۔

سہ پہر کو اس نے گھوڑا ران تلے دبایا اور نہر اُساوِرہ کے کنارے ہندہ

کی تلاش میں نکل گیا۔ بڑی دشواری سے ہند
بنانے والے نے اسے اس طرح بنوایا تھا کہ ا
رہی تھی اور مکان کا چھجا نہر پر جھکا ہوا تھا
وہ جس منصب اور مرتبے کا آدمی تھا
کہ کسی گنوار کی طرح وہ ہندہ کا دروازہ کھٹکھٹا
تیر نکال کر مکان میں اچھال دیا اور پھر ہندہ کا د
بعد دروازے کی آڑ سے ایک حسین چہرہ نمودار [illegible] آواز کانوں
میں رس کھولتی دل میں اترتی چلی گئی "تم کون؟ کس سے ملنا ہے؟"

حجاج نے جواب دیا "میں امیرالمومنین عبدالملک بن مروان کی فوج کا ایک سپاہی ہوں میرا ایک تیر تمہارے مکان میں کہیں آگرا ہے اگر تم اجازت دو تو میں اسے تلاش کرلوں!

ذہین اور حاضر جواب لڑکی نے برجستہ سوال کیا "کونسا تیر؟ اگر تیرے چوبی تیر کی نوک میں نیزے جیسی انی لگی ہے تو، تو میرے گھر میں داخل ہو کر بشوق اسے تلاش کر سکتا ہے لیکن اگر تیر سے تیری مراد وہ تیر ہے جس کی نوک پر تیرے ہوس کی انّی لگی ہوئی ہے تو اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں!"

حجاج اس کی لسانی کا شکار ہو گیا لیکن بگڑ کر بولا "زیادہ باتیں نہ بنا لڑکی، ہم سپاہی شاعری کی زبان میں باتیں نہیں کرتے!"

ہندہ ہٹ گئی اور حجاج اندر داخل ہو گیا، وہ ادھر اُدھر گھوم پھر کر اپنا تیر تلاش کرنے لگا۔ ہندہ اس کے سامنے کھڑی اس غیر معمولی انسان کو گھورتی رہی، حجاج نے اسے کئی بار غور سے دیکھا اسے ایسا لگا، جیسے بابل و نینوا کی اشتار (زہرہ) ہندہ کی شکل میں اس کی سنگ دلی کا امتحان لینے کی آسمان سے اُتر آئی ہے خلیج فارس کی راہ سے آنے والا ہندوستان کا سُرخ ریشمی کپڑا ہندہ کو بیر بہوٹی بنائے ہوئے تھا۔ کنگھی سے بے نیاز بڑے بڑے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور چہرے کا گلابی رنگ حیا کی سُرخی سے کچھ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔

حجاج نے سوال کیا "لڑکی تیرا نام کیا ہے؟"
ہندہ نے تُرشی سے جواب دیا "سپاہی! اپنا کام کر اور گھر کی راہ لے"۔
حجاج تلملا گیا "تیرا باپ کیا کرتا ہے؟"

...آخر تو یہ ساری باتیں کیوں کر رہا ہے؟ اپنا تیر تلاش کر

...زبان لڑکی!" حجاج غصے میں بولا "تو نہیں جانتی کہ میں کون ہوں، اگر ...ی باتیں ہرگز نہ کرتی!"

ہندہ نے اس کے غصے کی پروا کئے بغیر غصے میں کہا "تو کوئی بھی ہو، مجھے اس سے کیا۔ ظاہر ہے تو امیر المومنین یا حجاج ابن یوسف تو نہیں ہو سکتا، ان دونوں کے سوا تو کوئی بھی ہو، میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی!"

حجاج نے اس کے منہ سے اپنا نام سن کر بڑی خوشی محسوس کی۔ پوچھا "تو حجاج کو جانتی ہے؟"

"یہ پوچھ کہ اسے کون نہیں جانتا۔ طائف کے بنو ثقیف کا شیطان، آج اتنا ہی مشہور ہے جتنا فرشتوں کا معلم الملکوت۔"

حجاج خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اس نے اپنا تیر تلاش کر لیا اور واپس جاتا ہوا بولا "لڑکی تو نے ہمیں اپنا نام نہیں تبلایا۔ خیر کوئی بات نہیں، لیکن یہ تو بتا کیا ہم کبھی دوبارہ بھی یہاں آسکتے ہیں؟

کوئی ضرورت نہیں" لڑکی نے جواب دیا "مجھے تو، تو امیر المومنین کی فوج کا کوئی بھگوڑا معلوم ہوتا ہے!"

حجاج کو لفظ بھگوڑے پر ایسا غصہ چڑھا کہ اگر وہ ضبط و احتیاط سے کام نہ لیتا تو اس وقت ہندہ کے بال اس کے ہاتھ میں ہوتے اور وہ اس کی اتنی پٹائی کرتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتی!

حجاج وہاں سے چلا آیا لیکن ہندہ کی صاف گوئی اور اس کا بھولا بھالا حسن اپنا کام کر چکا تھا۔

حجاج نے کئی بار یہ کوشش کی کہ ہندہ کو اپنے دل سے نکال دے لیکن ناکام رہا وہ اسے جتنی بھول جانے کی کوشش کرتا۔ ہندہ اتنی ہی شدت سے اسے یاد آتی۔

بصرے میں اپنا نام ختم کر کے عبدالملک واپس جانے والا تھا۔ حجاج ...سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ہندہ کے معاملے میں کیا روش اختیار کرلے۔ بے بسی

اور مجبوری کے نام تک سے اسے چڑ تھی۔ اسے تو بس ایک بات آتی تھی وہ یہ کہ اس کی جو خواہش ہے اسے کسی نہ کسی طرح پورا ہونا چاہیئے اسے عقیدے کی حد تک یقین تھا کہ دنیا کی ہر شے طاقت کی تابع ہے، دنیا کا ہر کام ممکن ہے بشرطیکہ تکمیل کے لئے اس کی مطلوبہ متقاضی طاقت مہیا کر دی جائے۔

رات کو وہ طلایہ گردی کا معائنہ کر رہا تھا کیونکہ خارجیوں کے دستے ادھر ادھر سے اچانک نمودار ہو کر قتل و غارت کر کے فرار ہو جاتے تھے۔ بارھویں کا چاند سر پر تھا اور اس کی چاندنی میں کھجوروں کے درخت اس طرح کھڑے تھے جیسے وہ بھی چاندنی کے رومانی کیف میں مبتلا کسی کی محبت میں سرشار گم سم ہیں، طلایہ گرد دستہ اس کے خوف سے مستعد اور چوکس افواج کے گرد نگرانی اور حفاظت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چند سپاہی نیند میں بوجھل شرابیوں کی طرح بہکتے ہوئے ملے تو حجاج نے ڈنڈے سے پٹائی کر دی ادھر سے فارغ ہو کر اس نے ایک سپاہی ساتھ لیا اور ہندہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ نہر اُساورہ کے کنارے کنارے کھجوروں کے سائے میں گھوڑا دوڑاتا وہ ہندہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑے سے اُتر کر سپاہی کو حکم دیا "تو اپنے گھوڑے کے ساتھ میرے گھوڑے کی لگام بھی پکڑ لے، میں ابھی آتا ہوں!"

حجاج ہندہ کے دروازے پر کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر دروازے پر دستک دی، کچھ دیر بعد اندر مشعل ہاتھ میں تھامے کوئی آتا ہوا نظر آیا بالوسیدہ دروازے کے کئی چھوٹے چھوٹے شگاف اندر کی پردہ دری کر رہے تھے۔ آنے والا دروازے پر آ کر رک گیا اور پھر ایک ضعیف اور نقیہہ آواز سنائی دی "کون؟ تو کہاں سے آیا ہے اور کس سے ملنا ہے؟"

حجاج نے درشت لہجے میں کہا "شامت زدہ بوڑھے! دروازہ کھول!"

اندر سے جواب ملا "جب تک میں تیری طرف سے مطمئن نہ ہو جاؤں گھر کے دروازے کس طرح کھول سکتا ہوں!"

حجاج نے تحکمانہ کہا "شاید تیری شامت ہی آگئی ہے جو خواہ مخواہ بحث میں وقت ضائع کر رہا ہے، میں امیرالمومنین عبدالملک کی فوج کا ایک سردار ہوں!

دروازہ فوراً کھل گیا، حجاج نے بوڑھے کے پیچھے ہندہ کو بھی کھڑے دیکھا کرخت چہرے پر مسکراہٹ یوں نمودار ہوئی جیسے سنگلاخ چٹان پر چودھویں کی چاندنی پھیل جائے۔

ہندہ نے تسکا نیتا کہا! یہی وہ شخص ہے جو اپنے تیر کی تلاش کے

بہانے گھر میں گھس آیا تھا۔ مجھے یہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا!"
حجاج نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے حاکمانہ انداز میں کہا "تم دونوں سخت بداخلاق ہو، اپنے مہمان کو کہیں بٹھاتے بھی نہیں، میں یہاں دروازے پر کھڑے کھڑے باتیں کرنے کا بالکل عادی نہیں ہوں!"
بوڑھے نے نرمی سے کہا "میں ہندہ کا باپ ہوں تو کون ہے؟
میں نہیں جانتا۔ تو خود کو امیرالمومنین کی فوج کا سردار کہتا تو ممکن ہے تو سچ ہی کہہ رہا ہو لیکن یہ تو بتا تو ہم سے آخر چاہتا کیا ہے؟"
حجاج نے جواب دیا "پہلے کسی اچھی سی جگہ بٹھا کر نبیذ وغیرہ سے میری تواضع تو کرو اس کے بعد مطلب کی باتیں بھی ہو جائیں گی!"
بوڑھے کو ایسے ڈھیٹ مہمان سے کبھی کاہے کو واسطہ پڑا ہوگا۔
حجاج کے لب و لہجے سے وہ خوفزدہ ضرور ہوا۔ بولا "بھائی! میں ایک غریب تاجر ہوں اور میرے گھر میں تمہارے شایان شان کوئی جگہ بھی نہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہیں بات چیت کر کے اپنا راستہ لو اور مجھے زیادہ پریشان نہ کرو!"
حجاج نے بوڑھے کو اندر کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا "کیا تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ امیرالمومنین کو سپاہیوں کی ضرورت ہے اور تو تاجر بنا بیٹھا ہے تجھے کل صبح ہمارے پاس فوج میں حاضری دینی ہے!"
بوڑھے نے مجبور ہو کر حجاج کو ایک پر تکلف کمرے میں بٹھایا وہ حجاج کی آخری بات سے بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کے ضعیف اعضاء سپہ گری کے ہرگز متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ حجاج نے بیٹھتے ہی کہا "میں چاہتا تھا کہ تجھے کام کا آدمی بنا دوں لیکن تو جوانی اور توانائی کے ساتھ ہی عقل بھی گنوا چکا ہے!"
ہندہ اب تک خاموش رہی تھی اس سے اپنے باپ کی بے بسی نہ دیکھی گئی ذرا سختی سے بولی "تو خود عقل گنوا چکا ہے کہ تجھے یہ بھی نہیں معلوم ایک بوڑھے بزرگ سے کس طرح کلام کرنا چاہیئے، اگر میرا باپ فوجی خدمات انجام دینے تیری فوج میں چلا جائے گا تو یہاں میری دیکھ بھال کون کرے گا؟"
حجاج نے پوچھا "تیری ماں کہاں ہے؟"
ہندہ نے جواب دیا "اللہ کو پیاری ہو چکی!"

بوڑھے نے سہمے لہجے میں کہا "اگر امیر المومنین حکم دیں گے تو میں فوجی خدمات انجام دینے حاضر ہو جاؤں گا!"

حجاج نے سخت لہجے میں کہا "امیر المومنین تجھ حقیر تاجر سے خود تو باتیں کرنے سے رہے، انہوں نے یہ خدمت میرے سپرد کی ہے میں جو کہوں گا اس میں زبان تو میری ہو گی لیکن فرمان امیر المومنین کا ہو گا!"

بوڑھا بے بسی سے حجاج کی صورت دیکھنے لگا۔

ہندہ نے بے زاری سے کہا "تجھے جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ دے۔ میں کچھ کچھ تیرا مطلب سمجھ رہی ہوں!"

حجاج نے ہندہ کو ڈانٹا۔ پھر اس کے باپ سے مخاطب ہوا "بوڑھے یہودی! میری باتیں ذرا غور سے سن!"

بوڑھے کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، لفظ یہودی اس کے لئے گالی سے کم نہ تھا۔ اس نے تشکایتاً کہا "سردار! مجھے یہودی کہہ کر ذلیل نہ کرو، میں مسلمان ہوں!"

حجاج نے کہا "تو تاجر ہے اسی لئے میں نے تجھے یہودی کہا۔ امیر المومنین کو مجاہدوں کی ضرورت ہے اور تو جہاد سے جان چرا رہا ہے۔ ٹھہر جا میں تیری ساری سستی دور کر دوں گا!"

بوڑھا تو اس ہٹیلے انسان سے عاجز آچکا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے کس طرح پیچھا چھڑائے۔

ہندہ دوسرے کمرے میں جانے لگی تو حجاج نے اسے روکا۔ بولا "ٹھہر جا لڑکی! کیا میں تیرے باپ سے ملنے آیا ہوں؟ ہرگز نہیں۔" پھر اس کے باپ سے کہا "کیا تیری لڑکی کو کوئی مناسب رشتہ ملا؟"

بوڑھے نے جواب دیا "ابھی نہیں اس سلسلے میں فکر مند ہو رہا ہوں!"

حجاج نے کہا "تو پھر مبارک ہو کہ تیری یہ فکر اب دور ہو جائے گی!"

"وہ کس طرح؟" بوڑھا حیرت سے اس کی صورت تک رہا تھا۔

"مجھے تیری بیٹی پسند آگئی ہے، تو اسے میری زوجیت میں دے دے!"

ہندہ نے نفرت سے منہ بنایا "اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہوئی بولی "تیرے مقابلے میں اساورہ کی آغوش زیادہ اچھی ہے خبیث انسان"

حجاج نے بوڑھے سے کہا "مجھے میری بات کا فوراً جواب دے کیونکہ

باہر میرا گھوڑا کھڑے کھڑے تھک رہا ہوگا!"
بوڑھے نے جواب دیا "مجھے غور کرنے کا کچھ موقع دو!"
حجاج کھڑا ہوگیا۔ بولا "میں نے جو کہہ دیا وہی ہوگا!"
وہ دروازے کی طرف بڑھا، باہر نکلنے سے پہلے مڑا، بوڑھا ہاتھ میں مشعل لئے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔
حجاج ایک لمحے کے لئے رکا اور متکبرانہ شان سے بولا "اور ہاں اب جب کہ میں سارا معاملہ طے کرچکا ہوں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا تعارف بھی کرادوں، کل صبح جب تم فوج میں پہنچنا تو وہاں کسی سے بھی حجاج ابن یوسف ثقفی کا پتہ پوچھ لینا!"
بوڑھے کے ہاتھ سے مشعل گر گئی۔
حجاج باہر نکل گیا۔ اس کا ساتھی کھڑے کھڑے پریشان ہوگیا تھا۔ حجاج کے سائے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ پوری طرح چاق وچوبند ہوگیا۔ حجاج نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اُچک کر اس کی پشت پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھی نے اس کی تقلید کی حجاج اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا ہندہ کے مکان کی طرف لے آیا اور اچٹتی نظروں سے دروازے پر نظر ڈالی، وہاں دو سائے اس کی طرف نظریں جمائے دیکھ رہے تھے، اس نے سمجھ لیا کہ ان میں سے ایک تو خود ہندہ ہے اور دوسرا اس کا باپ۔

دوسرے دن عبدالملک نے کوچ کا حکم دیا۔ خیمے اکھڑنے لگے۔ میدان میں دُور دُور تک جلی ہوئی لکڑیوں کے کالے کالے نشانات اور راکھ کے ڈھیر پھیلے ہوئے تھے۔ حجاج تمام فوجیوں کو فوراً تیار ہوجانے کا حکم دیتا پھر رہا تھا۔
بالکل صبح فجر کے بعد ایک سپاہی ہندہ کے باپ کو دونوں شانوں سے پکڑ کر حجاج کے روبرو پہنچا۔ اب یہاں کا ٹھاٹھ ہی کچھ اور تھا۔ حجاج بن یوسف شاہانہ انداز میں گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہندہ کا باپ نعمان خوفزدہ تو پہلے ہی تھا اب کچھ زیادہ دہشت زدہ ہوگیا۔ وہ آتے ہی ادب سے حجاج کے رو بہ رو کھڑا ہوگیا۔ بولا "جناب! میں عسکری خدمات کے لئے حاضر ہوں میرے لئے کیا حکم ہے؟"
حجاج نے ڈنڈا سنبھالا۔ پوچھا "میری رات والی بات کا کیا جواب لایا؟"
بوڑھے نے مایوسی سے کہا "سردار! میں تو تیار تھا۔ لیکن ہندہ تیار نہیں ہوتی وہ معلوم نہیں کیوں تمہیں بالکل پسند نہیں کرتی!"

حجاج نے کہا "اس کی پسند!!" پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ بولا "پسند اور ناپسند کا اختیار تو مجھے ہے' اس ناسمجھ بھیڑ کو کیا پتہ کہ میں کیا ہوں اور وہ کس بلند پایہ شخص کی بیوی بننے والی ہے!"

بوڑھے نعمان نے کہا "میرے لئے کیا حکم ہے؟"

حجاج نے جواب دیا "تیرے لئے کوئی حکم نہیں تو ہمارے کام کا نہیں ہے' جو شخص اپنی لڑکی کو قابو میں نہ رکھ سکے وہ خطرناک دشمن کا مقابلہ کیا کرے گا۔ جا اپنے گھر جا اور اگر ہو سکے تو اس وقت تک ہندہ کی حفاظت کر' جب تک میں دوبارہ یہاں نہ آجاؤں' اس سے کہہ دینا کہ تو مہر میں جتنی رقم بھی چاہے مجھ سے طلب کر سکتی ہے۔"

نعمان نے جواب دیا "از روئے شریعت وہ بالغ ہے اور کسی بالغ کے معاملے میں کوئی کس طرح مداخلت کر سکتا ہے!"

"کج بختیے! بس چپ رہ اور زیادہ باتیں نہ بنا۔ میرا آخری فیصلہ بھی سُن لے' میرے چلے جانے کے بعد تو ہندہ کو میری امانت سمجھے گا۔ اور اس کی حفاظت کرے گا تیری ضعیفی کے پیش نظر میں اپنا ایک آدمی بھی یہیں چھوڑے جا رہا ہوں' وہ مجھے دم بہ دم کی خبریں دیتا رہے گا۔ تو واپس جا اور اپنی خودسر لڑکی کی حفاظت کرتا رہ!"

نعمان فوراً واپس چلا گیا۔

عبدالملک کی سواری آگے نکل گئی۔ اور حجاج کے ڈر سے فوج بھی اس کے ساتھ ساتھ کوچ کے لئے تیار ہو گئی۔

فوج کا وہ حصہ جو حجاج ابن یوسف کے محسن اور سابق آقا روح بن زنباغ کی ماتحتی میں تھا اب بھی ناونوش میں لگا ہوا تھا۔ ابن زنباغ کے ماتحت حجاج سے زیادہ خوفزدہ نہیں تھے کیونکہ وہ سب کچھ دنوں پہلے تک حجاج کے ساتھی تھے اور ان کا آقا ابن زنباغ حجاج کا محسن تھا۔

حجاج ٹہلتا ہوا ان خوش خوراکوں اور خوش فعلیاں کرنے والوں کے پاس پہنچ گیا ان سب نے حجاج کو دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیا "حجاج نے کہا "ملعونو! امیر المومنین کوچ کر چکے ہیں اور تم ہو کہ ابھی تک کھانے پینے ہی میں لگے ہوئے ہو!"

کسی شریر نے حجاج کا مذاق اڑایا۔ زور سے بولا "او بدروح کے جنے
دور کھڑا اکڑ کیوں کر رہا ہے' ادھر آ تو بھی اس ناونوش میں شریک ہو جا!"

حجاج کے لئے اب قابلِ برداشت بات نہ رہی تھی' فوراً فوج میں گیا ا

ہوئے بہادروں کی ایک جماعت لے کر ابن زنباغ کے مسخروں میں واپس آگیا۔ سامنے ہی ابن زنباغ کا شاندار خیمہ ایستادہ تھا۔ حجاج نے ابن زنباغ کے ایک سپاہی سے پوچھا " تمہارا سردار کہاں ہے؟"

اس نے کھجور کی گٹھلیاں اگلتے اور کھجور کی جگالی کرتے ہوئے جواب دیا " وہ ہمارا ہی سردار نہیں بلکہ تیرا بھی ہے کہ تجھے اس مرتبے تک اسی نے تو پہنچایا ہے زیادہ ٹرٹر کرے گا تو ابھی اس سے تیری شکایت کرکے معزول کرادوں گا!"

حجاج نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا " ان سب پر تشدد کیا جائے اور جو مزاحمت یا مقابلہ کرے اسے قتل کر دیا جائے"! اس کے بعد وہ چند نوجوانوں کو لے کر ابن زنباغ کے خیمے پر حملہ آور ہو گیا۔ نہایت پُرجوش اور بلند آواز میں حکم دیا " اس خیمے کو لوٹ لو اس سردار کی یہی سزا ہے، یہی تو ہے وہ شخص جس کے بل بوتے پر اس کے ذلیل آدمی ہماری بے عزتی کر رہے ہیں اور اسی شخص کی ڈھیل اور سستی کا نتیجہ ہے کہ اس کی ماتحت فوج امیر المومنین کے کوچ فرما جانے کے بعد بھی ڈیرہ ڈالے پڑی ہے!"

شور و غل کی آواز سن کر ابن زنباغ باہر نکل آیا یہاں اس نے جو منظر دیکھا اس نے ابن زنباغ کے ہوش اڑا دیئے اس کی سپاہ حجاج کے شوریدہ پشتوں کے ہاتھوں پٹ رہی تھی۔ ان کے خیمے نذرِ آتش کئے جا رہے تھے اور خود ابن زنباغ کے خیمے کو تباہ و برباد کیا جا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کا سارا سامان لُٹ گیا۔ ابن زنباغ کے چند غلام مقابلے میں نکلے لیکن انہیں حملہ آور ہونے یا دفاعی قدم اٹھانے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔

ابن زنباغ غصے میں حجاج کی طرف بڑھا اور طیش میں بولا " او ظالم احسان فراموش! یہ تو کیا کر رہا ہے اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے!"

حجاج ڈنڈا لے کر اس پر حملہ آور ہو گیا اور کئی زور دار ڈنڈے رسید کر دیئے ابن زنباغ بے دم ہو کر گر گیا۔ حجاج نے شیر کی طرح گرج کر کہا " احسان فراموش تو ہے کہ امیر المومنین کے احسانات کا یوں بدلہ چکا رہا ہے کہ تو اور تیرے آدمی امیر المومنین کی سواری کے آس پاس چلنے کے بجائے کاہل بنے ناؤ نوش میں مشغول ہیں، ظالم تو ہے کہ امیر المومنین کی نوازشات اور عنایات کا احسان تک نہیں مانتا اور اپنے ناپاک اور آرام طلب نفس کی ...ل خواہشات پر اس کی اطاعت کو قربان کر دیا ہے!"

اس محاربے میں کتنے ہی آدمی قتل کر دیئے گئے۔ بہتوں کے ہاتھ پیر توڑ دیئے گئے ... سر پھٹ گیا کسی کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جلے ہوئے خیموں کی قطاریں بڑا

بھیانک اور المناک منظر پیش کر رہی تھیں ان خیموں کا لوٹا ہوا سامان حجاج کے سپاہی اپنے قابو میں کر چکے تھے۔

ابن زنباغ نے پوچھا "امیر المومنین کہاں ہیں؟"

"کیوں ان سے کیا کام آپڑا؟"

ابن زنباغ نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور ایک گھوڑے کو ران تلے دبا کر عبدالملک کے پاس روانہ ہو گیا۔

کافی دیر بعد جب حجاج اپنی اور ابن زنباغ کی زخمی اور تباہ حال سپاہ کے ساتھ عبدالملک کے مستقر میں داخل ہوا تو اس کے ایک فوجی سردار نے اسے مطلع کیا "آپ کو امیر المومنین یاد فرما رہے ہیں!"

وہ درّانہ عبدالملک کے پاس چلا گیا۔ شاہی خیمے کے باہر ابن زنباغ کا چتکبرا گھوڑا بار بار دم ہلا رہا تھا اور جھرجھریاں لے کر پیر پٹک رہا تھا۔ ان جھرجھریوں کا زیادہ زور دایاں والے حصے پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

عبدالملک کے ایک خدمت نے اسے اندر تک پہنچا دیا۔ عبدالملک بہت برہم بیٹھا تھا اور اس کے سامنے زخمی ابن زنباغ گردن جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ اس کا لبادہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور زمین پر گرنے اور گھسٹنے کے باعث پسینے کی نمی نے مٹی کے داغوں کو بہت گہرا کر دیا تھا۔ لہولہان پیشانی کا خون رخساروں سے گزر کر داڑھی اور سینے کو تر کرتا ہوا قدموں میں جمع ہو رہا تھا۔

عبدالملک کی قاہرانہ نظریں حجاج کی طرف اٹھیں اور گرجدار آواز گونجی "او رائندہ عتاب خداوندی! یہ تو نے کیا کیا؟"

حجاج نے معصومیت سے پوچھا "کیا امیر المومنین؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا!"

عبدالملک نے حیرت سے پوچھا "ابن زنباغ کا یہ حال تو نے نہیں تو پھر کس نے کیا؟"

حجاج نے جواب دیا "امیر المومنین! ابن زنباغ کی جو درگت بنی ہے خود امیر المومنین کے ہاتھوں بنی ہے!"

اس عجیب وغریب جواب پر عبدالملک اور ابن زنباغ ایک ساتھ چونکے
عبدالملک نے کہا "کیوں جھوٹ بولتا ہے؟"

حجاج نے جواب دیا "امیر المومنین نے مجھے اپنی افواج کا سردار بنایا ہے اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں اس میں نظم و نسق قائم کروں!" اس کے بعد اس نے ساری تفصیل عبدالملک کے روبرو بیان کر دی۔ آخر میں بولا "ان دلائل اور واقعات کی روشنی میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ امیر المومنین کی تائید میں جو اقدام بھی کروں گا وہ خود امیر المومنین کا اقدام ہو گا۔ میں نظم و نسق کی بحالی اور قیام کی خاطر جو تشدد بھی کروں گا وہ امیر المومنین کی جانب سے ہو گا!"

عبدالملک حجاج کے جواب سے بہت خوش ہوا اور ابن زنباغ کا اُترا ہوا مغموم چہرہ اور زیادہ سُت گیا اور زیادہ اُتر گیا۔

عبدالملک نے فکرمند لہجے میں کہا "لیکن ابن زنباغ کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے لئے کیا کیا جائے؟"

حجاج نے جواب دیا "امیر المومنین کے قبضہ و اختیار میں بہت کچھ ہے جو ہاتھ خیموں کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے وہ اتنے ہی خیمے انعام میں بخش بھی سکتا ہے جو ہاتھ ابن زنباغ جیسے نافرمان اور جاہل کے خطاکار غلاموں اور سپاہیوں کو نظم و نسق کی بحالی کی خاطر قتل کر سکتا ہے وہ اسے ان سے زیادہ تعداد میں فراہم بھی کر سکتا ہے۔"

عبدالملک نے تالی بجائی۔ کئی حبشی غلام اور خوبصورت کنیزیں خیمے میں حاضر ہو گئیں۔

عبدالملک نے حکم دیا "حاجب سے کہو ابن زنباغ کے نقصانات کا جائزہ تیار کرے اور نقصانات کا مالی تخمینہ لگا کر اس کی دوگنی رقم دے کر اس فضول مقدمے کو ختم کرے!"

حبشی غلام فوراً جدھر سے آئے تھے اسی طرف غائب ہو گئے۔

عبدالملک نے ابن زنباغ کو سرزنش کی "ابن زنباغ! اس بار تو تجھے معاف کیا جا رہا ہے لیکن اگر تو نے یا تیرے آدمیوں نے پھر کبھی اس تساہل اور سستی کا اظہار کیا تو مجھے یقین ہے کہ بنو ثقیف کا یہ شیطان تجھے ہرگز نہ معاف کرے گا اور اب میرے پاس اس نوع کا کوئی دوسرا مقدمہ لانے کی ہمت بھی نہ کرنا۔"

ابن زنباغ کے واقعے نے حجاج ابن یوسف کی ایک خاص شخصیت عبدالملک کے سامنے عیاں کر دی، اس نے حجاج کے مرتبے میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ اور بخشش بہا

انعام واکرام سے بھی نواز دیا۔

قسمت قدم قدم پر حجاج کا ساتھ دے رہی تھی اور موقع شناس اور زیادہ سے زیادہ اختیارات اور اقتدار پر بھی قناعت نہ کرنے والا حجاج ہندہ کے معاملے میں بہت بے بس ثابت ہوا تھا جس نے ابن زنباغ اور اس کے ماتحتوں کے عبرتناک حشر سے بڑے بڑے سرکشوں کو لرزہ براندام کر دیا تھا، وہ ایک معمولی تاجر کی بیٹی ہندہ کو ذرا بھی مرعوب نہ کر سکا تھا۔ وہ فرائض منصبی کی بجا آوری کے دوران ہندہ کی تسخیر کی بات ضرور سوچتا تھا اس کے لئے بظاہر یہ کام اتنا دشوار نہ تھا۔ وہ چاہتا تو ہندہ کو زبردستی اٹھوا لیتا لیکن ایسا کرنے میں دو خیال مانع تھے، ایک تو یہ کہ آہستہ آہستہ وہ جس اقتدار کو حاصل کرنے کی فکر میں تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندہ جیسا کوئی معمولی سا واقعہ سنگ گراں بن کر بیچ میں آ گرے، دوسرے یہ کہ ہندہ کی محبّت نے اس کا دل گداز کر دیا تھا۔ اور وہ ہندہ کے معاملے میں اسے جبر و زیادتی سے منع کرتا رہتا تھا۔

دوسری طرف بصرے میں حجاج کے خوف نے ہندہ کے باپ نعمان کا برا حال کر رکھا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ بصرہ چھوڑ کر کسی دور دراز علاقے میں نکل جائے اور بقیہ زندگی گمنامی میں گزار دے لیکن حجاج بن یوسف کا آدمی سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

خوفزدہ ہندہ بھی تھی لیکن وہ زیادہ پریشان نہیں تھی، اسے حجاج پر رہ رہ کر غصہ آتا اور وہ اپنی مجبوری کی حدود میں بھی ایسے ایسے خیالی منصوبے بناتی رہتی کہ اگر انہیں کسی اور پر ظاہر کیا جاتا تو اس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا۔ کبھی سوچتی حجاج سے شادی کر لینی چاہیئے۔ اور زہر میں بجھا ہوا خنجر ساتھ رکھ کر پہلی ہی رات کو اس کا قصہ پاک کر دینا چاہیئے لیکن جب اس کے دوسرے پہلو پر غور کرتی تو اپنی ہزیمت کا امکان بھی دکھائی دینے لگتا کیونکہ حجاج جیسا چالاک اور عیّار شادی کے بعد ملاقات سے پہلے اس کی تلاشی بھی لے سکتا تھا اور تلاشی کے بعد جب زہر میں بجھا خنجر نکلے گا تو یہ ظالم خود اس پر اور اس کے بوڑھے باپ نعمان پر جیسا ظلم ڈھائے گا اس کا بھی اسے خوب اندازہ تھا۔ کبھی سوچتی حجاج کی شکایت لے کر عبدالملک کے پاس پہنچنا چاہیئے لیکن اس وقت تک ابن زنباغ

کا واقعہ اتنا مشہور ہو چکا تھا کہ حجاج کے مخالفین عبدالملک سے حجاج کے خلاف انصاف پانے سے مایوس ہو گئے تھے۔ ان مایوسیوں کی تاریک فضا میں امید کی ایک ایسی شعاع بھی موجود تھی جو ناقص عقل کے تھک ہار جانے پر عموماً دل کے ایک گوشے سے طلوع ہو کر طمانیت کا سبب بنتی ہے اور مایوس انسان ناامیدی کا بھاری پتھر بآسانی اٹھا لیتا ہے یہ شعاع اس امید کی تھی جو کسی معجزے یا کرامت کی تشکل میں کسی کوشش کے بغیر غیب سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نے بارگاہِ ایزدی میں گر گر، رو رو کر خدا سے حجاج کے ظلم و شقاوت سے نجات کی دعائیں مانگیں۔ اس کی سجدہ گاہ آنسوؤں سے بھیگ جاتی اور بہت سارے آنسو بہا چکنے کے بعد جب اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جاتا تو وہ یہ خیال کرنے لگتی کہ شاید اس کی دعائیں اب بابِ اجابت کو پہنچ چکی ہیں اور اب کچھ نہ کچھ غیب سے اس کی اعانت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ وہ یہ دعائیں بھی مانگتی کہ خدا حجاج کو کسی مہم پر بھیج دے جہاں سے اسے واپسی نصیب نہ ہو لیکن یہ ساری دعائیں تو ایک طرف رہیں۔ حجاج ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔

اسی دوران حجاج نے ایک اپنا ہی جیسا سخت مزاج قاصد بصرے بھیجا۔ وہ بوڑھے نعمان کے نام ایک سخت خط لے کر آیا تھا۔ یہ شخص اُسا ور نہر کے کنارے کنارے چل کر ہندہ کے گھر پہنچ گیا۔ حقیقتِ حال سے آگاہ ہونے پر نعمان نے اس کی شاندار پزیرائی کی، اس نے حجاج کا خط دیتے ہوئے نعمان کو پیغام زبانی درشت لہجے میں سنایا۔

"میرے ولی نعمت حجاج نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ اگر تم نے ان معاملات کی بھنک بھی امیرالمومنین کے کانوں تک پہنچائی تو وہ نفسِ نفیس تادیب کو تشریف لائیں گے، وہ خدا کے قہر کی ایسی تلوار ہیں جس سے دنیا کے کسی گوشے میں بھی پناہ نہیں۔ حجاج کا ہاتھ اتنا دراز ہے کہ وہ ہر کہیں پہنچ سکتا ہے۔"

نعمان نے سردی کی کپکپاہٹ میں حجاج کا زبانی پیغام سنا اور پھر اس کا خط پڑھنے لگا۔ یہ ایک عجیب خط تھا۔ جس سے لکھنے والے کی عجیب و غریب طبیعت کا عجیب سا اندازہ ہوتا تھا۔

قبیلہ بنو ثقیف کے سب سے زیادہ سخت خو حجاج ابن یوسف کے پتھر جیسے دل میں محبت کی تخم ریزی کرنے والی حور شمائل حسینہ ہندہ کے قابلِ احترام باپ نعمان کے نام بصرے سے آنے کے بعد میں اکثر تم دونوں کی بابت سوچتا رہا ہوں تم ہندہ کے باپ ہو اس لئے مجھ سے بھی اپنے عزت و احترام کا حق رکھتے ہو، میں ہندہ کو اپنی دلھن بنانے

کا اٹل فیصلہ کر چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میں تمہیں اپنی دامادی کے شرف سے سرفراز کروں، وہ دن دور نہیں جب لوگ تمہیں بھی ادب و احترام کی نظر سے دیکھیں اور تم جدھر سے بھی گزرو لوگ رعب اور احترام سے تمہارے روبرو اپنے سر جھکا دیں، میں تم پر اپنے الطاف و عنایات کی بارشیں کرنا چاہتا ہوں واللہ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی بیٹی ہندہ کے ساتھ موٗدبانہ میری طرف بڑھو اور جس عزت و شرف سے میں تمہیں نوازنا چاہتا ہوں اسے حاصل کرو، آج مملکت اسلامیہ میں امیرالمومنین عبدالملک کے بعد مجھ سے بڑا کوئی شخص بھی نہیں، تمہیں اللہ نے یہ موقع عطا کیا ہے کہ تم ہندہ کے وسیلے سے مجھ سے بھی برتر حیثیت حاصل کر لو، یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم نے ہندہ کو میری زوجیت میں دے دیا تو میں تمہیں خلافت کی طرف سے کسی بہت بڑی تجارت کا مالک بنا دوں گا۔

لیکن اگر تیرا جواب نفی میں نکلا تو او ذلیل تاجر اور سود و زیاں کے پیمانے سے زندگی کو ناپنے والے بوڑھے خبیث! اس سودے میں تجھے سراسر خسارہ رہے گا تیرے کمزور اور ناتوان ہاتھ ہندہ کی حفاظت نہیں کر سکیں گے اور وہ بجائے خوش قسمت بیوی کے لونڈی کی حیثیت سے میرے حرم میں آجائے گی۔ تجھے میں اپنے در کی دربانی پر ناپاک کتے کی طرح بٹھائے رکھوں گا۔ اور میرے معمولی خدمت گار اور غلام عقوبت کے فرشتوں کی طرح تیرے سر پر مسلط رہیں گے اور تجھے مرنے نہیں دیں گے، وہ صبح سے شام تک آتے جاتے تیرے منہ پر تھوکتے رہیں گے، سُن لے کہ میری بخشش خدا کی بخشش ہے اور میرا قہر خدا کا قہر ہے۔ ان دو میں سے جو تو پسند کرے اس سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔

میرا قاصد تجھے ہندہ کے ساتھ لینے آرہا ہے، اب یہ تیرے اختیار میں ہے کہ چاہے تو حجاج کے خوش قسمت نسبتی باپ کی حیثیت سے میرے پاس آئے یا حقیر و ذلیل لونڈی کے باپ کی حیثیت سے۔

بوڑھا نعمان لرز گیا اور فوراً ہی دمشق جانے پر رضا مند ہو گیا اس نے حجاج کے قاصد سے کہہ دیا "میں بخوشی ہندہ کو لے کر حجاج کی خدمت میں حاضری دینے کو تیار ہوں لیکن مجھے دو دن کا موقع دو!"

قاصد نے ترشی سے پوچھا "یہ دو دن کی مہلت کیوں؟"

نعمان نے جواب دیا "جس کا لینا دینا ہے اس سے فراغت حاصل کر لوں اور یہاں کی املاک کو بھی فروخت کر دوں کیونکہ اب میں بصرے میں رہ کر کیا کروں گا!"

قاصد نے دو دن کی مہلت بھی دے دی۔
وہ خط لے کر اندر پہنچا اور اسے ہندہ کے ہاتھ میں دے دیا اور اس کے چہرے کے تاثرات پر غور کرنے لگا۔
ہندہ خط پڑھنے لگی، وہ جیسے جیسے آگے بڑھی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا یہاں تک کہ جب وہ خط کے گریز والے حصے پر پہنچی تو اس کے چہرے پر کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ خط پڑھ کر ایک طرف پھینک دیا اور تھرتھرائی آواز میں پوچھا "آپ نے کیا فیصلہ کیا۔؟
بوڑھا اپنا فیصلہ سناتے گھبرا رہا تھا، بولا "جو تو فیصلہ کرے گی وہی میرا بھی فیصلہ ہو گا!"
ہندہ چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی، بوڑھا باپ اُمید کی نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا۔
ہندہ کی آنکھیں بھیگ گئیں بولی، اگر میں یہ کہوں کہ میں اس کے حکم کی تعمیل نہیں کروں گی تو کیا ہو گا؟"
بوڑھے باپ نے کہا "پھر وہی ہو گا جس کا اس خبیث نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے اس کا قاصد کہتا ہے کہ حجاج خدا کے قہر کی ایک ایسی تلوار ہے جس سے دُنیا کے کسی گوشے میں بھی پناہ نہیں، اس کا ہاتھ اتنا دراز ہے کہ وہ ہر کہیں پہنچ سکتا ہے!"
ہندہ نے دکھ سے کہا "عالمِ ارواح میں تو اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا ہم خودکشی تو کر سکتے ہیں!"
بوڑھا گھبرا گیا۔ جلدی جلدی بولا "نہ نہ بیٹی ایسی بات سوچنا بھی نہیں، اسلام نے خودکشی حرام قرار دی ہے اور پھر اس سے ہم دونوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"
ہندہ نے آنکھ ملائے بغیر اٹھتے ہوئے کہا "باواجان! آپ تاجر ہیں، تجارت نے آپ کو ہر مسئلے پر سود و زیاں کے حساب سے سوچنے کا عادی بنا دیا ہے عربوں کی شجاعانہ غیرت جو صرف بہادروں کی صفت ہے ایک تاجر میں کہاں مل سکتی ہے!"
بوڑھا ایک دم سنجیدہ ہو گیا، بولا "تب پھر میں اُس خبیث کے قاصد سے یہ کہے دیتا ہوں کہ مجھے اس کی دونوں صورتیں نامنظور ہیں!"
ہندہ دوسرے کمرے میں جاتے جاتے رک گئی لمحے بھر کے لئے باپ سے نظریں ملائیں اور پوچھا "آپ کے اس جواب کا انجام کیا ہو گا؟"
بوڑھے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "انجام کچھ بھی نکلے، مجھے اس کی پروا نہیں!"
ہندہ نے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا "اگر مردانہ وار حجاج

کے مقابلے کی ہمت موجود ہو تو یہ جواب بہت مناسب ہے ورنہ پھر ہمیں اس ملعون کی پہلی بات مان لینی چاہیئے، اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ اسی میں ہماری فلاح ہے!"

یہ کہہ کر ہندہ دوسرے کمرے میں چلی گئی نعمان بھی وہیں پہنچ گیا۔ ہندہ کے عاقلانہ جواب نے اس میں ذرا ہمت پیدا کر دی تھی، وہاں پہنچ کر وہ کچھ دیر ہندہ کے پیچھے کھڑا رہا۔ ہندہ بستر پر گر کر دوسری طرف منہ کرکے رو رہی تھی۔

پھر اس نے ہندہ کی سسکیوں کی آواز سُنی وہ اس کے پیچھے بستر کے قریب بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پھر بہ دقت تمام کہا۔ "ہندہ، میری بیٹی! تجھ پر کوئی بھی بات نہیں ہے، میں نے اس خبیث کے قاصد سے دو دن کی مہلت لے لی ہے ان دو دنوں میں ہم یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ چوری چھپے فرار ہو کر کہیں دور دراز علاقے میں چلے جائیں!"

ہندہ نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اس ظالم کا ہاتھ واقعی بہت لمبا ہے باوا جان، اس سے کہیں بھی مفر نہیں، آپ قاصد سے کہہ دیجئے کہ ہم باعزت طریقے سے اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہیں!"

بوڑھے نے داد تحسین کے انداز میں کئی بار اس کی پشت تھپتھپائی اس کے بعد اٹھتا ہوا بولا "ہندہ! میری بیٹی! خدا تجھے خوش رکھے تو نے میری مشکل آسان کر دی!"

حجاج کا جو آدمی پہلے سے نعمان کی نگرانی پر متعین تھا اس نے حجاج کے قاصد میں چونکا دینے والا تغیر محسوس کیا حجاج کا قاصد دو دن تک ہندہ کی جھلک تک نہ دیکھ سکا لیکن اس کی تاک جھانک سے یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہندہ کو ایک نظر دیکھنا ضرور چاہتا ہے، دو دن بعد اس نے نعمان سے پوچھا۔ "کیا تم نے اپنا کام ختم کر لیا اور دمشق کی روانگی کے لئے تیار ہو؟"

نعمان نے لجاجت سے جواب دیا۔ "ایک دن اور، کل تک میں ضرور روانہ ہو سکوں گا!"

قاصد نے فراخ دلی سے ایک دن کی مہلت اور دے دی کہنے لگا۔ "ایک دن اور سہی میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے، ہو سکتا ہے مجھے خود بھی چند دن رُکنا پڑے!"

نعمان قاصد کی نرمی سے بہت خوش ہوا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا۔

بصرے کے مشرق میں جہاں دجلہ اور فرات ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں، اُبلہ نامی ایک چھوٹا سا آباد اور مستحکم شہر ہے یہاں سے ایک شاندار نہر نکالی گئی تھی جو بصرے تک چلی گئی تھی اور اس کا نام شہر کے نام پر نہر اُبلہ رکھا گیا تھا۔ اُبلہ سے بصرے تک نہر کے دونوں طرف کنارے کنارے شاندار باغات کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ حدِ نظر تک مختلف نوع کے سرسبز و شاداب درخت عجیب بہار دے رہے تھے، ان کے نیچے کھجور، مچھلی، روٹی اور دودھ بیچنے والے اپنی دکانیں

لگائے بیٹھے تھے، خریداروں کے ہجوم سے کھوے سے کھوا چھلتا تھا' اُبلہ سے ذرا آگے خلیج فارس تھی ایک دن قاصد علی الصباح اُٹھ کر ابلہ چلا گیا اور وہاں سے خلیج فارس کے اس کنارے پہنچ گیا جہاں سے کشتیاں یا چھوٹے چھوٹے بحری جہاز مسافروں کو اُس پار یا مکران کے ساحل تک لے جاتے تھے۔ قاصد ساحل پر بہت ساری تفصیلات حاصل کر کے واپس آ گیا۔ اس کی پُراسرار حرکات و سکنات نعمان اور حجاج کے نمائندے بشیر کے لئے پریشان کُن تھیں۔"

خلیج فارس سے واپس آ کر قاصد نے بشیر سے پوچھا "کیا تو نے ہندہ کو دیکھا ہے؟"

بشیر نے جواب دیا "ہاں ایک آدھ بار اس کی جھلک دیکھی تو ہے!"

قاصد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "کیا یہ واقعی بہت حسین ہے؟"

"ہاں" بشیر نے جواب دیا "حجاج جیسا سنگدل شخص اُس پر یوں ہی تو نہیں لٹو ہو گیا!"

قاصد نے کہا "اسے میں بھی دیکھنا چاہتا تھا!"

بشیر نے بے دلی سے جواب دیا "تب پھر ہندہ کے باپ سے بات کرو!"

قاصد نے کہا "شاید وہ اسے پسند نہ کرے!"

بشیر چُپ ہو رہا۔ بشیر قاصد کی نگرانی کرنے لگا۔

رات کو عشا کی نماز کے بعد، مسجد سے واپس آتے ہوئے قاصد نے نعمان کے سامنے ایک چونکا دینے والی پیش کش رکھ دی، کہنے لگا "بزرگوار! حجاج ایک تند اور ظالم انسان ہے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ کی بیٹی ہندہ وہاں خوش نہ رہ سکے گی!"

نعمان نے بے بسی سے جواب دیا۔ "لیکن حجاج قضائے مبرم ہے اس سے پیچھا بھی تو نہیں چھڑایا جا سکتا!"

"پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے!" قاصد نے کہا "میرے ذہن میں ایک ایسی تجویز ہے کہ اگر آپ تیار ہو جائیں تو ہم سب حجاج کی ظالم دسترس سے دور ہو سکتے ہیں!"

"وہ کس طرح؟" نعمان نے حیرت سے سوال کیا۔

"پہلے رازداری کا عہد کیجئے!"

"تجویز سُنے بغیر کس طرح عہد کر سکتا ہوں، پہلے اپنی تجویز تو بتاؤ!"

قاصد نے سرگوشی میں کہا "میں خلیج فارس تک جا چکا ہوں وہاں ہمیں سواحل ہند تک لے جانے والے بحری جہاز مل جائیں گے۔ کیوں نہ ہم تینوں یہاں سے نکل چلیں میں زندگی کی آخری ساعتوں تک آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں!"

مذبذب نعمان سوچ میں پڑ گیا حسب عادت بولا "مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دو!"

"کتنا وقت؟"

"صرف ایک دن!"

"سوچ لیجئے!" قاصد نے کہا "چھ دن بعد ایک جہاز ساحلِ مکران جانے والا ہے ہمیں اس سے فرار ہو جانا چاہئے، مجھے آپ سے ہمدردی ہے!"

نعمان نے ہوشیاری سے کام لیا۔ بولا "بہتر ہے میں تمہارا ہمیشہ شکرگزار رہوں گا!"

اسی دن سہ پہر کو بوڑھے نعمان کی عدم موجودگی میں تیز طرار قاصد اندر گھس جانے کی ہمت کر بیٹھا۔ ہندہ کے لئے وہ کوئی اجنبی تو تھا نہیں لیکن اس نے قاصد کو ڈانٹ ضرور پلائی، بولی "تم بغیر اجازت اندر کیوں آگئے، کیا تم یہ بھول گئے کہ میں ایک ظالم شخص کی مطلوبہ ہوں!!"

قاصد ہنسنے لگا "اب تو کسی بھی ظالم کے حوالے نہ کی جائے گی، میں نے تیرے باپ سے اس معاملے میں بات چیت کر لی ہے تجھے خوش ہونا چاہئے کہ میں تیرے دو نفری خاندان کا نجات دہندہ ہوں!"

ہندہ نے بدستور ناگوار رویہ برقرار رکھا، بولی "اچھا تم اسی وقت باہر واپس جاؤ ورنہ میں تمہیں مار مار کر باہر نکال دوں گی!" یہ کہہ کر وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی اور وہاں سے ایک درّہ نکال لائی۔ قاصد نے بات بگڑتے دیکھی تو چپ چاپ باہر چلا آیا۔

باہر بشیر اسے گھور رہا تھا۔ قاصد گھبرا گیا بولا "دوست! میں غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ بوڑھا نعمان مجھے آواز دے کر اندر بلا رہا ہے۔ جب اندر پہنچا تو وہاں نعمان کا کہیں پتہ تک نہ تھا ہندہ کو دیکھتے ہی شرما کر بھاگ آیا۔ اُفوہ۔ نادانستگی اور غلط فہمی میں کیسی خطرناک چوک ہو گئی تھی مجھ سے، الہٰی توبہ، الہٰی توبہ!"

بشیر نے کوئی جواب نہ دیا جو کچھ ایک کان سے سُنا تھا دوسرے سے نکال کر سامنے سے ہٹ گیا۔ لیکن ہندہ کے بے پناہ مثالی حُسن نے قاصد کو دیوانہ بنا دیا۔

مستقبل کے حسین خوابوں نے قاصد کو سیر و تفریح پر مائل کر دیا وہ گھوڑے کو دالانوں تلے دبائے بصرے کے گلی کوچوں اور بازاروں کی سیر کرتا رہا۔

شام سے ذرا پہلے جب وہ بصرے کے قبرستان کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس نے اس جگہ نعمان کو کھڑے دیکھا یہ اس کے قریب پہنچ گیا پوچھا "جناب والا! یہاں کیسے آنا ہوا؟"

نعمان نے ایک قبر کے قریب کھڑی ہوئی ہندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میں اسے لے کر آیا تھا۔ یہ مزار حضرت حلیمہ سعدیہؓ کا ہے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ ہم نے سوچا جب ہم لوگ بصرے کو چھوڑ ہی رہے ہیں تو پھر کیوں نہ آخری بار مقامات متبرکہ کی زیارت کرتے چلیں۔"

قاصد نے اجازت طلب کی: "کیا میں بھی اس مزار تک جا سکتا ہوں؟"

نعمان نے جواب دیا: "تمہارے منصوبے کا ہندہ کو کوئی علم نہیں ہے اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کا ہم دونوں کے سوا کسی اور کو قبل از وقت علم ہو۔ تمہیں اپنے قریب دیکھ کر ہندہ بدک جائے گی!"

ہندہ دونوں ہاتھ پھیلائے فاتحہ پڑھ رہی تھی فاتحہ کے بعد اس نے دعا مانگی: "اے میرے مولا! حلیمہ سعدیہؓ کے طفیل میری گزارش سن لے۔ میں بنو ثقیف کے شیطان کو ذلیل کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے رسولؐ کے طفیل میری مدد فرما!"

نعمان نے دور سے آواز دی: "بیٹی ہندہ! شام ہو رہی ہے۔ اب گھر واپس چلو!"

ہندہ نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر لئے اور چپ چاپ باپ کے ساتھ ہولی۔ اپنے قریب قاصد کو دیکھ کر وہ چیں بہ چیں ہو گئی باپ سے پوچھا: "یہ یہاں کیوں آیا؟"

باپ نے جواب دیا: "بیٹی! یہ ادھر سے گزر رہے تھے ہمیں دیکھ پاس آ گئے۔ ویسے یہ بہت اچھے آدمی ہیں مجھے ان پر بڑا اعتماد ہے!"

قاصد نے کہا: "میری اچھائی برائی کا اندازہ یوں کس طرح ہو سکتا ہے۔ وقت آنے دو میں اپنے آپ کو خوب اچھی طرح ثابت کر سکوں گا!"

بوڑھے نعمان نے گھبرا کر کہا: "خاموش! خاموش! شرفاء سر راہ باتیں نہیں کرتے!"

گھر پہنچ کر نعمان نے قاصد سے تنہائی میں کہا: "جناب مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ تمہاری عجلت سارا کھیل بگاڑ دے گی۔ میری بیٹی ہندہ کے مزاج سے تم واقف نہیں ہو۔ اس سلسلے میں جلد بازی سے مت کام لو ورنہ پچھتاؤ گے!"

قاصد نے معذرت کے انداز میں کہا: "مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں آئندہ احتیاط سے کام لوں گا!"

نعمان نے سرگوشی میں کہا: "تم ایک بار پھر خلیج فارس کے جنوبی ساحل ہو آؤ اور بحری جہاز کی بات پکی کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر ہمیں دھوکا ہو جائے!"

قاصد دوسرے دن علی الصباح ابلہ کی راہ سے خلیج فارس کے جنوبی ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔

نعمان نے قاصد کے منصوبے سے بشیر کو مطلع کر دیا، بولا "تم بتاؤ ہمیں ان حالات میں کیا کرنا چاہیئے ؟"

بشیر نے فکرمندی سے جواب دیا "میں پہلے دن سے اس کی نیت پر شبہ کر رہا ہوں خدا اپنی پناہ میں رکھے، یہ شخص کتنا بے وقوف ہے جو حجاج کی آبرو پر ہاتھ ڈال رہا ہے، یہ تو ویسی ہی بات ہوگئی کہ کوئی گیدڑ شیر کے شکار پر منہ مار کے شیر کے ہاتھوں جہنم واصل ہو جائے !"

نعمان نے کہا "میں یہ ساری باتیں تمہارے علم میں اس لئے لے آیا ہوں کہ تم حجاج کی طرف سے یہاں متعین ہو اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو اس کے تم بھی ذمے دار ٹھہرائے جاؤ گے !"

"بے شک بے شک !" بشیر نے گردن ہلائی "لیکن اب آپ کا کیا منصوبہ ہے؟"

نعمان نے جواب دیا "ہم دمشق چلنے کو تیار ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ حجاج کا عناد ہمیں کہیں بھی سکون سے نہ رہنے دے گا !"

بشیر کسی خیال سے خوش ہوگیا، بولا "تب پھر ایسا ہوگا کہ آپ دونوں میرے ساتھ دمشق چلیں گے اس طرح قاصد کی خدمت میں انجام دے کر حجاج سے انعام واکرام کا مستحق ٹھہروں گا !"

نعمان نے تشویش سے پوچھا "اور یہ قاصد کا کیا بنے گا ؟"

بشیر نے جواب دیا "میں آج ہی اُبلہ کی راہ میں کہیں چھپ جاؤں گا اور جب قاصد یہاں واپس آرہا ہوگا تو میں پیچھے سے وار کر کے اسے جہنم رسید کر دوں گا۔"

نعمان نے پوچھا "تو اور حجاج خاموش رہے گا ؟"

بشیر نے جواب دیا "جب اس کے کرتوت حجاج کے رُوبرُو بیان ہوں گے تو وہ مجھے اس فعل میں حق بجانب قرار دے گا اور بہت ممکن ہے کہ مجھے انعام واکرام کا مستحق بھی قرار دیا جائے !"

نعمان کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس خاموشی کو خود بشیر نے توڑ دیا بولا "لیکن جناب اس سلسلے میں ذرا آپ کو بھی ساتھ دینا پڑے گا !"

نعمان نے پوچھا "وہ کس طرح ؟"

بشیر نے جواب دیا "قاصد کی ساری بددیانتی اور بے ایمانی کی تفصیل حجاج کے روبرو بیان کرنا پڑے گی !"

نعمان نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "میں اس کے لئے ہر طرح تیار ہوں !"

اس مشورے اور تجویز کے بعد بشیر اُبلہ کی راہ پر ہولیا۔ اور اُبلہ اور بصرہ کے درمیان بر راہ پائی جانے والی ایک سرائے میں فروکش ہوگیا۔ وہ تیر کمان لے کر کسی درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر صبح سے شام تک قاصد کا انتظار کرتا رہا۔ ایک دوپہر کو اس نے

قاصد کو گھوڑا دوڑائے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے تیر چلے میں رکھا اور اس کے حلق کا نشانہ لیا جب وہ بالکل زد میں آگیا تو بشیر نے تیر چھوڑ دیا۔ وہ سنسناتا ہوا قاصد کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ فضا میں ایک دردناک چیخ بلند ہوئی اور قاصد تیورا کر گھوڑے سے نیچے آگیا۔ بشیر دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور تلوار نیام سے نکال لی۔

بشیر اپنا کام ختم کر کے جب بصرہ واپس پہنچا تو یہ جان کر سناٹے میں آگیا کہ نعمان اور ہندہ اپنا مکان کسی اور کے ہاتھ بیچ کر فرار ہو چکے تھے، نئے مالک کو کچھ پتہ نہ تھا کہ دونوں کہاں گئے۔

بشیر پریشان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اب اسے دمشق جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے خیال گزرا کہ ہو سکتا ہے دونوں خود ہی حجاج کی خدمت میں چلے گئے ہوں۔ بشیر نے ہمت سے کام لیا اور تن تنہا دمشق روانہ ہو گیا۔

دمشق میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھا جامع مسجد پہنچا۔ یہ ظہر کا وقت تھا عبدالملک امامت کر رہا تھا۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح اس نے بھی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد عبدالملک نے لوگوں سے سوال کیا "لوگو! عبداللہ ابن زبیرؓ بدستور سرکشی اختیار کئے ہوئے ہیں، جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں، ایک آسمان پر دو سورج اور ایک ملک میں دو مساوی الاختیار بادشاہ نہیں رہ سکتے، اسی طرح ملت اسلامیہ پر دو خلیفہ کس طرح فائز رہیں گے، تم میں کون ایسا ہے جو عبداللہ ابن زبیر کو ہماری راہ سے ہٹا دینے کی عظیم الشان خدمت انجام دینے کی ہمت رکھتا ہے؟"

مجمع اس طرح خاموش رہا گویا سب ہی سوئے ہوئے ہوں۔ اسی عالم میں حجاج ابن یوسف کھڑا ہوا اور کہنے لگا "امیر المومنین! خدا آپ کو اس وقت تک سلامت اور فائز المرام رکھے، جب تک ایک فتنہ بھی باقی ہے، آپ مجھے عبداللہ ابن زبیر کے مقابلے کے لئے مکہ روانہ کر دیجئے، میں انہیں زیر کر لوں گا۔ کیونکہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں نے ابن زبیر کو گرفتار کر کے ان کی کھال کھینچ لی ہے، مجھے یقین ہے کہ میں ابن زبیر کو آپ کی راہ سے ہٹا دوں گا!"

عبدالملک نے اس کی درخواست منظور کر لی اور شامیوں پر مشتمل سپاہ اس کے حوالے کرنے کا فرمان صادر کر دیا۔

مسجد سے نکلتے ہوئے بشیر حجاج کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حجاج اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے بولا "تو بصرے سے کب آیا؟ میرا قاصد کہاں ہے؟ کیا ہندہ آ گئی؟"

بشیر نے ڈرتے ڈرتے ساری تفصیل عرض کر دی، حجاج غصے سے کانپنے لگا بولا "یہاں نہیں گھر چل، وہاں تیری روداد سن کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔"

بشیر اس خونخوار انسان کے ساتھ لرزاں و ترساں اس طرح گھر پہنچا جیسے بکری قصاب کے ساتھ کمیلے پہنچتی ہے۔

حجاج فکر مند اور بجھا بجھا سا ایک تخت پر بیٹھ گیا اور بشیر سے کہنے لگا "ہاں تو تو مجھ سے کیا کہہ رہا تھا' تو نے مجھے جیسی خبریں سنائی ہیں اس کے نتیجے میں تو بشیر کس طرح ہو سکتا ہے؟ بشیر کا مطلب ہے بشارت دینے والا۔ لیکن تو نے ہمیشہ مجھے ایسی خوفناک خبریں سنائی ہیں کہ میں تجھے دیکھ کر خوفزدہ ہونے لگتا ہوں میں کیوں نہ تیرا نام نذیر رکھ دوں۔ کیونکہ نذیر کے معنی ہیں ڈرانے والا۔ تو نے اب تک جتنی خدمات انجام دی ہیں ان سے نذرات ہی کی خبریں ملی ہیں!"

بشیر چپ چاپ کھڑا اپنی ذات پر کئے جانے والے تمسخر کو ہمت سے جھیلتا رہا۔

اچانک حجاج کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔ بولا "تو تو نے نئے ایمان قاصد کو ٹھکانے لگا دیا' لیکن تو مجھے کس طرح اس بات کا یقین دلائے گا کہ تو نے مجھ سے جو کچھ کہا۔ اس میں سب کچھ سچ ہے!"

بشیر نے جواب دیا "میں نے جو کچھ عرض کیا' وہ سارا کا سارا سچ ہے' افسوس کہ نعمان اور ہندہ یہاں موجود نہیں ہیں ورنہ وہ دونوں میرے سب سے بڑے گواہ ہوتے!"

"اچھا سر دست ہم تجھے قاصد کی موت اور نعمان اور اس کی بیٹی کے فرار کے جرم میں معمولی سی سزا دیں گے کیونکہ خطا چھوٹی ہو یا بڑی خطا ہی ہوتی ہے!"

بشیر کی جان ہی تو نکل گئی' بولا "مجھے ان کی تلاش کے لئے تھوڑا وقت درکار ہے!"

حجاج نے ہنستے ہوئے جان لیوا آواز میں کہا "خوب! تو اب تو بھی مجھے دھوکا دے کر فرار ہونا چاہتا ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا!" "گھبرا نہیں میں تجھے بھی وہیں روانہ کرتا ہوں جہاں قاصد تیرے ہاتھوں پہلے ہی پہنچ چکا ہے!"

اس کے بعد اس نے ایک سپاہی کو گردن زدنی کا حکم دیا اور پھر بشیر کا لاشہ تڑپنے لگا۔

اس رات وہ دیر تک ہندہ کو یاد کرتا رہا اور قسم کھائی کہ وہ جب بھی ان دونوں کو پا جائے گا نعمان کو قتل کر دے گا اور ہندہ کو اپنے حرم میں لونڈی بنا کر ڈال لے گا۔

اور دمشق سے چل پڑا۔

اس نے مکّے کا محاصرہ کرلیا اور منجنیقیں نصب کرکے سنگ باری شروع کردی، حرمِ پاک جہاں خون خرابہ اور قتل و غارت گری خدا کی طرف سے حرام قرار پاچکے تھے حجاج کی بدولت تباہ کاری اور غارت گری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عبداللہ ابن زبیر رضؓ اس کے مقابلے سے یوں قاصر رہ گئے کہ ان کے ساتھیوں کو لالچ دے کر پہلے ہی توڑ لیا گیا تھا۔ محاصرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ابن زبیر رضؓ خانہ کعبہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ حجاج نے خانہ کعبہ پر بھی سنگ باری شروع کردی۔ جب فوج والوں نے خدا کی قہر و عذاب سے ڈر کر منجنیقوں سے ہاتھ کھینچ لیا تو حجاج خود آگے بڑھا اور منجنیقیں چلانے لگا۔ پتھروں کی آتش بازی نے خانہ کعبہ کے غلاف کو جھلسا دیا اور متبرکات حضرت ابراہیم عؑ جل گئے۔

سات ماہ سے کچھ زیادہ مدت کے محاصرے کے بعد ابن زبیر رضؓ آخری مقابلے کے لئے باہر نکلے۔ انہوں نے اپنی کمر کو ایک رومال سے کس رکھا تھا۔ انہوں نے رجزیہ نعرہ بلند کیا "لوگو! مجھے پہچان لو، میں رسول مقبول صلعم کے دستِ راست صدیق رضؓ کا نواسا، ان کی محبوب بیوی عائشہ رضؓ کا بھانجا ہوں، میرے باپ رسول اللہ صلعم کے پھوپھیرے بھائی تھے اور ہم زلف بھی، اور مجھے اس بات کا شرف بھی حاصل ہے کہ میں ہجرت کرکے آنے والوں میں پہلا نومولود تھا جو مہاجرین میں پیدا ہوا، میری ماں اسماء رضؓ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اگر میں خود کو حق و صداقت پر سمجھتا ہوں تو اس راہ میں اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں"۔

اس کے بعد ابن زبیر رضؓ نے اتنا سخت حملہ کیا کہ حجاج کی فوج کو دور تک دھکیلتے چلے گئے۔ اس دوران حجاج کے کسی آدمی نے ایک بھاری پتھر ان کے منہ پر کھینچ مارا کنپٹی اور سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا، آپ کو چکر آ گیا اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ آپ نے اسی حالت میں جوش و خروش سے ایک شعر پڑھا۔

"ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو پشت پر زخم کھاتے ہیں اور ایڑیاں ان کے خون سے حنائی ہو جاتی ہیں بلکہ خون تو ہمارے پنجوں میں گرتا ہے"۔

شعر پڑھتے ہوئے حجاج کی فوج میں گھس گئے۔

اسی عالم میں ایک عورت چیخی "وا امیر المومنینا دا افسوس امیر المومنین ہلاک ہو گئے"

حجاج بھاگا ہوا اس عورت کے پاس پہنچا، پوچھا "مقتول ابن زبیرؓ کہاں ہے؟"
عورت نے ان کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "وہ رہے، سفید ململ کے لباس والے!"

ابن زبیرؓ کی لاش کو دیکھتے ہی حجاج سجدے میں گر گیا۔ اس کے بعد اس نے ابن زبیرؓ کا سر کٹوا کر فتح کی خوشخبری کے ساتھ عبدالملک کو روانہ کر دیا اور دھڑ کو صلیب پر چڑھا دیا تاکہ عبدالملک کے مخالفین اس سے عبرت حاصل کریں۔

تین دن گزر چکے تھے، حجاج ابن زبیرؓ کی مصلوب لاش کے پاس کھڑا لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایک تقریباً سو سالہ نابینا عورت ایک بینا عورت کا ہاتھ پکڑے وہاں پہنچی اور عورت سے پوچھا "ابن زبیرؓ کی لاش کہاں ہے؟"

اس عورت نے حجاج کو وہاں کھڑے دیکھا تو سہم گئی، منہ سے تو کچھ نہ بولی، نابینا عورت کا ایک ہاتھ پکڑ کر مصلوب لاش پر رکھ دیا۔ انہوں نے لاش کے مختلف حصوں کو ٹٹول کر دیکھا، پتہ چلا اس کا جوڑ جوڑ الگ ہے۔ پھر نابینا عورت نے دریافت کیا "کیا یہ سوار ابھی تک اپنے گھوڑے سے نہیں اترا؟ اس سے کہو جنگ ختم ہو چکی اب تو نیچے آجائے!"

حجاج نے اس عجیب و غریب نابینا عورت کے بارے میں سوال کیا "یہ کون ہے؟"
نابینا عورت نے جواب دیا "ابن زبیرؓ کی ماں اسماءؓ رسول اللہ ﷺ کی چہیتی عائشہؓ کی بڑی بہن اور ابوبکر صدیقؓ کی بڑی بیٹی۔"

حجاج خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ حضرت اسماءؓ نے کہا "میرا بیٹا میرے حوالے کیا جائے!"

حجاج نے جواب دیا "ایسا نہیں ہو سکتا!"
حضرت اسماءؓ واپس چلی گئیں۔

حجاج معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے حضرت اسماءؓ کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ "جا ان بڑی بی کو بلا لا"۔

لیکن جب حضرت اسماءؓ کو یہ پیغام ملا تو آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔

حجاج نے دوبارہ دھمکی آمیز پیغام بھیجا۔ کہلایا "اگر خیریت چاہتی ہو تو چپ چاپ چلی آؤ ورنہ بالوں سے گھسیٹتی لائی جاؤ گی"۔

حضرت اسماءؓ نے جواب دیا "میں ہرگز نہ جاؤں گی، اس ظالم سے کہو مجھے بالوں سے گھسیٹ کر بلوائے"۔

اس آخری جواب پر حجاج حضرت اسماءؓ کے پاس خود پہنچا اور کہا "اے دشمنِ خدا ابنِ زبیرؓ کی ماں! میں حجاج تیرے سامنے کھڑا ہوں!"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔

حجاج نے شقاوت سے ہنستے ہوئے پوچھا "بتا میں نے دشمنِ خدا ابن زبیرؓ کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟"

حضرت اسماءؓ کی بے نور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں آپ نے جواب دیا "تو نے میرے بیٹے کی دنیا بگاڑ دی اور میرے بیٹے نے تیری عاقبت خراب کر دی" پھر کچھ سکوت اختیار کر کے فرمایا "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بنو ثقیف میں ایک جھوٹا اور ایک ظالم پیدا ہوگا۔ جھوٹے مختار بن ابی عبید ثقفی کو تو دیکھ چکی ہوں اور ظالم تو ہے!"

حجاج، حضرت اسماءؓ کی دلیری پر دم بخود ان کو دیکھتا رہ گیا پھر ایک عجیب و غریب خواہش کا اظہار کیا۔ بولا "میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے نکاح کر لو!"

حضرت اسماءؓ چراغ پا ہو گئیں فرمایا "او ذلیل عاقبت نااندیش ظالم! ایک سو سالہ نابینا کو تو نکاح کا پیغام دے کر اسے ذلیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کیا تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ عزت اور ذلت خدا کی طرف سے ہے تیرے ذلیل کرنے سے میں ذلیل نہیں ہو جاؤں گی!"

حجاج نے خلافِ امید نرمی سے جواب دیا "نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، بلکہ میں رسول ﷺ اللہ کی ہم زلفی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دامادی کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا!"

حجاج نے ابن زبیرؓ کی لاش اُتروا کر یہودیوں کے قبرستان میں پھنکوا دی جہاں سے حضرت اسماءؓ نے اٹھوالی اور اپنی نگرانی میں غسل دلوا کر تجہیز و تکفین فرمائی۔

انہی دنوں بصرے اور کوفے میں خارجیوں نے ہنگامے شروع کر دیئے اور یہ لوگ عبدالملک کے لئے مصیبت بن گئے۔ ابن زبیرؓ کی شہادت سے حجاز کی طرف سے بے فکری ہو گئی تھی، اسی دوران حجاج کو عبدالملک کا ایک نیا فرمان موصول ہوا، عبدالملک نے دمشق سے حجاج کو لکھا تھا۔

"حجاج! تم نے اب تک اپنی جن غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ان کے پیش نظر میں تمہیں عراق کا والی مقرر کر رہا ہوں، تم فوراً کوفے پہنچو اور کوفے والوں کو ایسا روندو کہ بصرے کے سرکش کمزور پڑ جائیں میں تمہیں نرمی سے بچنے کا حکم دیتا ہوں۔"

حجاج نے اپنی فوج میں سے بارہ شہسواروں کا انتخاب کیا اور نہایت اعلا اور تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر کوفے روانہ ہو گیا۔

سرخ باریک عمامے سے اپنا چہرہ چھپائے اور ترکش اور کمان کو اپنے کاندھے پر ڈالے ہوئے اپنے بارہ شہسواروں کے ساتھ حجاج جب کوفے میں داخل ہوا تو دن اچھی طرح چڑھ آیا تھا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اچانک نازل ہوا تھا اس لئے کوفے والے اس کے اس تقرر سے ناواقف تھے، وہ کوفے کی گزرگاہوں سے جامع مسجد کی طرف بڑھا چلا گیا۔ اس کے ساتھی با آواز بلند چیخ چیخ کر لوگوں سے کہہ رہے تھے "لوگو! مسجد میں جمع ہو جاؤ تاکہ تمہارے سامنے ایک ایسی تقریر کی جائے جس سے تم سب پر ایک لرزہ خیز انکشاف ہو جائے۔

لوگ انہیں خارجی مبلغ سمجھ بیٹھے تھے ذرا سی دیر میں مسجد میں بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا لیکن ان میں بہتوں کے ہاتھوں میں پتھر دبے ہوئے تھے اور انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر یہ کوئی خارجی مبلغ نکلا تو اس پر پتھروں کی بارش کر دی جائے گی، حجاج منبر پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

حجاج نے منبر پر کھڑے ہوتے ہی گرجدار آواز میں ایک شعر پڑھا۔
"لوگو! میں وہ آفتاب ہوں جو ظلمت کے پردے کو تار تار کر دیتا ہے میں عنقریب اپنے منصب اعلا کی بلند ترین گھاٹی سے طلوع ہونے والا ہوں اور جب میں اپنا عمامہ چہرے سے ہٹاؤں گا تو تم سب مجھے اچھی طرح پہچان لو گے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا عمامہ چہرے سے ہٹا دیا۔ لوگ اسے دیکھ کر سہم گئے۔
حجاج نے ان کی کثرت اور شری ارادوں کی پروا کئے بغیر تقریر شروع کی "اے اہلِ عراق اور اہلِ شقاق و نفاق و مراق، مساوی الاخلاق دعداوت و نفاق اور جنون اور برے اخلاق والو) امیرالمومنین نے تمہاری سرکشیوں کے مقابلے میں اپنے ترکش سے تیر نکالے اور انہیں دانتوں سے چبا کر ان کی سختی کا امتحان لیا۔ پھر انہیں ان تیروں میں ایک ایسا تیر مل گیا جو سختی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا اور یہ ہر کہیں پیوست ہو جانے کی صلاحیت رکھتا تھا، وہ سخت تیر میں ہوں، امیرالمومنین نے اس تیر کو تم پر چلا دیا ہے انہوں نے تمہارے لئے میرے گلے میں کوڑا اور تلوار ڈال دی مگر کوڑا کہیں گر گیا اور تلوار رہ گئی۔"

لوگ خوف اور دہشت سے حجاج کی تقریر سن رہے تھے اور اُن کے حوصلے جواب دے چکے تھے، حجاج نے خونخوار نظروں سے مجمع کا جائزہ لیا اور تقریر دوبارہ شروع کر دی "بخدا میں شر کو اس کے ٹھکانوں ہی میں دفن کر دیتا ہوں اور جو جیسا کرتا ہے اس کا ویسا ہی بدلہ دیا جاتا ہے، میں تم میں بہت سے ایسے سر دیکھ رہا ہوں جو پھلوں کی طرح پک چکے ہیں اور انہیں توڑ لینے کا وقت قریب آچکا ہے میں بہت سارے عماموں اور داڑھیوں کو خون سے لالہ زار ہوتے دیکھ رہا ہوں، اے عراق کے لوگو! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھے انجیر کی طرح دبایا نہیں جا سکتا۔ عرصہ دراز سے فتنہ وفساد تمہارا شیوہ ہو گیا ہے اور بغاوت تمہارا مسلک بن گیا ہے لیکن اب تم ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میں تمھیں اس طرح اُدھیڑ کر رکھ دوں گا جس طرح لکڑی سے اس کی چھال اُتاری جاتی ہے۔ میں تمہیں اس طرح کاٹ کر ڈال دوں گا جس طرح درخت کاٹ دیا جاتا ہے اور تمہیں اس طرح پیٹوں گا جیسے اجنبی اونٹ پیٹا جاتا ہے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یا تو تم میرے ہاتھوں انصاف قبول کرو اور فتنہ وفساد اور جھوٹی افواہوں سے باز آجاؤ ورنہ یہ جان لو کہ میرے نزدیک معمولی کاٹ چھانٹ کوئی چیز نہیں میں تلوار سے تمہاری ایسی قطع برید کروں گا کہ تمہاری عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے۔ لوگو! مجھے معلوم ہے کہ تم خارجیوں کے مقابلے میں جانے سے جی چراتے ہو اور اس سلسلے جو مہمات امیر المومنین نے روانہ فرمائی ہیں تم میں اکثر وہاں سے بھاگ آئے ہیں۔ تم سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج سے تین دن بعد میں جسے یہاں دیکھوں گا اس کی گردن مار دوں گا۔"

اسی مجمعے میں نعمان بھی موجود تھا، اور اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہاں سے چپ چاپ فرار ہو جاتا۔ اس نے لوگوں کے درمیان دبک کر چھپنے کی کوشش کی لیکن حجاج کی تیز نظروں نے اسے پہچان لیا۔ اس نے نعمان پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا "او شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے والے! اُٹھ کر کھڑا ہو جا!"

نعمان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کی پنڈلیاں جواب دے رہی تھیں جس سے اس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا۔

حجاج نے اسے حکم دیا "یہاں میرے قریب آجا!"

نعمان لوگوں کو ہٹاتا ہوا آہستہ آہستہ حجاج کی طرف بڑھنے لگا۔

حجاج نے لوگوں کو اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دے

دی اور خود منبر سے نیچے آگیا۔ پھر اپنے بارہ شہسواروں کے ساتھ لے کر والیِ کوفہ کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

لقمان کو اپنے انجام کا علم تھا۔ زندگی سے مایوس ہو جانے کے بعد اس نے حق گوئی اختیار کی۔

حجاج نے اس کی کمر پر کئی کوڑے رسید کئے، بولا "کیا میرے قاصد نے تجھے یہ نہیں بتا دیا تھا کہ میری تلوار سے تجھے کہیں بھی پناہ نہ مل سکے گی اور یہ کہ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ یہ ہر کہیں پہنچ سکتے ہیں!"

لقمان نے جواب دیا "حجاج! میں تم سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا کیونکہ کذب گوئی کے بعد موت مومن کے لئے اچھا انجام نہیں ہے۔ میں تیرے قاصد کے ساتھ دمشق جانے پر تیار ہو گیا تھا لیکن اس کی بدلی ہوئی نیت دیکھ کر میں نے یہ سوچا کہ پہلے تمہارے بدبخت اور بددیانت قاصد سے پیچھا چھڑالوں اس کے بعد کوئی قدم اٹھاؤں چنانچہ میں نے تمہارے نمائندے بشیر کے ذریعے اس کا کام تمام کرا دیا۔ پھر اچانک بشیر کی عدم موجودگی میں شیطان نے مجھے ورغلایا اور میں ہندہ کو لے کر کوفے چلا آیا۔ یہاں میں اس لئے آیا تھا کہ میرے خیال میں یہاں کے لوگ ایسے سرکش تھے جن پر تمہارا قابو مشکل ہی سے چل سکتا!" پھر مایوسی سے گردن جھکا لی اور کہنے لگا "لیکن تمہارے زورِ خطابت اور ڈراوے نے ان سرکشوں کو بھی خوفزدہ کر دیا اور یہ میری بدقسمتی کہ اُس ہجوم میں میں بھی موجود تھا جس سے تم خطاب کر رہے تھے اور تم نے مجھے پہچان لیا!"

حجاج نے کئی کوڑے اور رسید کر دیئے اور پوچھا "اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

لقمان نے درد سے کراہتے ہوئے جواب دیا "میں اپنی بیٹی ہندہ کو عزت و آبرو کے ساتھ تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں!"

حجاج نے سختی سے کہا "عزت آبرو سے حوالے کرنے کا وقت گزر چکا!"

لقمان نے جواب دیا "حجاج! جو شخص زندگی کا خیال دل سے نکال چکا ہو اسے کوئی چیز بھی نہیں ڈرا سکتی!"

حجاج نے پوچھا "تو کیا چاہتا ہے؟"

لقمان نے دلیری سے جواب دیا "وہی جس کا میں ابھی ذکر چکا ہوں!"

حجاج نے خلاف توقع نرمی سے کہا "مجھے تیری صاف گوئی پسند آئی، ورنہ میرے پاس تیرے لئے موت کے سوا کوئی علاج نہ تھا" میں تیری بیٹی ہندہ کو دو لاکھ درہم مہر کے عوض اپنی زوجیت میں لانا چاہتا ہوں اس کی یہ بہت بڑی قیمت ہے جو میں ادا کر سکتا ہوں!"

نعمان اس کی صورت دیکھتا رہا۔ حجاج نے مزید کہا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دو دن کے اندر ہندہ کو میری دلھن بن جانا چاہئے اگر تو نے اس بار چالاکی سے کام لیا اور فرار ہو جانے کی کوشش کی تو اس کے نتائج بہت عبرت ناک نکلیں گے!

نعمان شادی کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اور دوسرے دن ظہر اور عصر کے درمیان ہندہ حجاج سے وابستہ کر دی گئی۔ شادی کے بعد حجاج ہندہ کے پاس فوراً نہ پہنچ سکا، وہ خلافت کے امور میں نصف رات تک الجھا رہا۔ سوگوار اور افسردہ ہندہ دلھن بنی اس کا انتظار کرتی رہی اس دوران اسے وہ ساری باتیں یاد آتی رہیں جو اس نے حجاج سے بچنے کے لئے مختلف مقامات متبرکہ اور بارگاہ ایزدی میں دعاؤں کی شکل میں گزاری تھیں اور اب ان کی بے اثری کا عبرت ناک مرقع بنی بیٹھی تھی۔

نصف شب کے بعد خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور حجاج اندر داخل ہوا۔ کنیزیں ادھر ادھر ہو گئیں۔

حجاج ہندہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہندہ سر جھکائے بیٹھی رہی، حجاج نے کسی کنیز کو آواز دی لیکن جب وہ حاضر ہوئی تو حجاج نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ ہندہ اس کی اس عجیب و غریب حرکت پر حیران ہو رہی تھی۔

حجاج نے یک بیک کرخت لہجے میں ہندہ کو مخاطب کیا "بے وقوف لڑکی! کیا تجھے ابھی تک میری آمد اور موجودگی کا علم نہیں ہوا؟"

ہندہ نے شرمائی آواز میں جواب دیا "ہوا کیوں نہیں، جب آپ کے آتے ہی کنیزیں میرے پاس سے کھسکنے لگی تھیں اسی وقت مجھے آپ کی آمد کا علم ہو گیا تھا!"

حجاج نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارا، غصے میں بولا "پھر بھی تو مجھے نظر انداز کر رہی ہے، تجھے میرے احترام میں کھڑا ہو جانا چاہئے تھا۔ کیا تیرے باپ نے تجھے آداب نشست و برخاست نہیں سکھائے؟"

ہندہ نے پورے اعتماد سے جواب دیا "میرا باپ میری ماں کی

عزت کرتا تھا۔ اسی لئے اس کا یہ خیال تھا کہ تو بھی میری عزت کرے گا اسے یہ کیا معلوم تھا حجاج کی زوجیت کے بجائے ملازمت میں جا رہی ہوں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تیری آمد پیشتر مجھے خود بھی اس کا کوئی علم نہ تھا۔"

حجاج اس کے قریب بیٹھ گیا اور کہنے لگا "تو ذہین اور حاضر جواب بھی ہے، خوب!"

پھر پوچھا "ہندہ! سچ بتا کیا تو واقعی یہ سمجھتی تھی کہ میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں؟!"

ہندہ نے جواب دیا "نہیں میرا ایسا کوئی خیال نہ تھا!"

"تو جھوٹ بولتی ہے!" حجاج ڈانٹنے کے انداز میں بولا "تو اور تیرا باپ دونوں ہی یہی سمجھ بیٹھے تھے، لیکن ذرا سوچ تو سہی میں تجھے کیوں چاہوں گا؟ اس لئے کہ تو خوبصورت ہے یا اس لئے کہ تو ذہین اور حاضر جواب بھی ہے، نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میری نظر میں تیری حیثیت اُس اونٹنی جیسی ہے۔ جس کے عوض میں دوسری اونٹنی پر بھی گزارا کر سکتا ہوں، اگر تو میرے دل میں ہوتی تو میں اُس دل کو اپنے سینے سے نکال باہر کرتا۔ بھلا میں حجاج، یوسف ثقفی کا بیٹا کس طرح کسی کا پابند اور مجبور بن کر رہ سکتا ہے۔ میں نے تجھ سے اس لئے شادی کی ہے کہ اس طرح میں تیری اور تیرے باپ کی انا کو چکنا چور کرنا چاہتا تھا۔ میں نے تجھے دو لاکھ درہم حق مہر کے عوض خریدا ہے، تو میری کنیز ہے، ایک اعلا درجے کی کنیز!"

حجاج سے وہ نفرت تو پہلے ہی کرتی تھی لیکن اب ان باتوں سے اور زیادہ بڑھ گئی وہ اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے لگی، حجاج نے اس کی آنکھوں میں آنسو جو دیکھے تو پسیجے بغیر بولا "تو رو کیوں رہی ہے؟ کیا یہ خوشی کے آنسو ہیں کہ قسمت نے تجھے والیٔ عراق حجاج ابن یوسف کی بیوی بنا دیا ہے یا اس کا کوئی اور سبب ہے؟"

ہندہ نے جواب دیا "یہ آنسو خوشی کے نہیں کرب کے ہیں، یہ رات جس میں ہم دونوں یکجا ہوئے ہیں، بجائے خوش قسمتی کے بدقسمتی کی رات ثابت ہو رہی ہے اور مجھے یہ احساس پریشان کر رہا ہے کہ میں جس شخص کے حوالے کر دی گئی ہوں، اسے انسانی معیار کا کوئی علم نہیں، وہ بے حس، تنگ دل اور ظالم ہے، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، اگر میں اپنی صاف گوئی کے جرم میں قتل کر دی جاؤں!"

حجاج نے ہنستے ہوئے کہا "میں تجھے قتل نہیں کروں گا نہ طلاق دوں گا، لیکن تجھے یہ ضرور جتاتا رہوں گا کہ میرے دل کو ایک لڑکی مسخر نہیں کر سکتی میں پھر یہی کہوں گا کہ دنیا کی ہر شے طالع ہے، میں نے تجھے دو لاکھ درہموں کی

ت سے حاصل کرلیا ہے میں دُنیا کی ہر چیز طاقت سے زیر کرسکتا ہوں!"
ہندہ نے کہا "کیا تو نے دو لاکھ درم مجھے ادا کر دیئے؟"
حجاج نے جواب دیا "یہ قیمت ابھی نہیں فسخِ معاہدہ کے وقت ادا کی جائے گی جس کا ابھی کوئی ارادہ نہیں!"
ہندہ نے بے بسی سے جھنجلا کر کہا "خدا ہماری مشکل آسان کرے!"
حجاج نے ہنس کر آمین کہا اور ہند کا ہاتھ پکڑ لیا۔

خلوت سے نکلتے ہی اس کے آدمیوں نے بتایا کہ کوفے کے بعض لوگ ابھی تک اس کے حکم کی تعمیل نہیں کر رہے ہیں۔ اس نے تکبیریں دلوا کر لوگوں کو اکٹھا کیا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "لوگو! کیا بات ہے؟ کیا تم پر میری گذشتہ دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اے بے وقوف لونڈی جنو اور بیوہ اور لاوارث ماؤں کے بیٹو! کیا تم اپنے عبرتناک انجام سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں؟ میرا سکوت اور تمہاری سرکشی یہ دونوں ایسے غبار ہیں جن کے پردے سے سخت اور تیز آندھی آنے والی ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عنقریب میں تمہیں ایسی سخت سزا دوں گا جو تمہارے لئے عذاب اور آنے والی نسلوں کے لئے عبرت ثابت ہوگی۔ کیا وجہ ہے کہ تم میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ابھی تک خوارج سے جنگ کرنے کوفے سے باہر نہیں نکلے!"
تقریر کے بعد عمیر بن ضابی نامی ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا ہوا اور حجاج سے کہا "خدا امیر کے کاموں کی ہمیشہ اصلاح کرتا رہے، میں اس مہم میں شریک تھا جو کوفے سے باہر خارجیوں سے لڑی جا رہی ہے لیکن میں بیمار اور بوڑھا انسان ہوں" پھر ایک جوان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ میرا بیٹا ہے میں چاہتا ہوں کہ میرے بدلے اسے مہم پر روانہ کر دیا جائے!"
حجاج نے پوچھا "تو کون ہے؟"
عمیر نے جواب دیا "میرا نام عمیر ہے اور میں بنو تمیم سے تعلق رکھتا ہوں!"
حجاج نے درشتگی سے پوچھا "کیا تو نے میری پہلی تقریر نہیں سنی تھی؟"
"سنی تھی!" عمیر نے جواب دیا۔
کسی شخص نے حجاج کے کان میں کہا "حضور! یہ وہی عمیر بن ضابی

ہے جس نے امیر المومنین حضرت عثمان رض کے قتل میں حصہ لیا تھا۔
حجاج نے عمیر سے پوچھا "کیا واقعی تو وہی شخص ہے جس نے حضرت عثمان رض کے مکان پر حملہ کیا تھا؟"
عمیر نے جواب دیا "بے شک میں وہی شخص ہوں!"
حجاج نے پوچھا "تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟"
عمیر نے جواب دیا "عثمان رض نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی، انہوں نے میرے بوڑھے باپ کو قید خانے میں ڈال دیا تھا!"
حجاج نے ایک شعر پڑھا۔
"میں نے ارادہ کیا مگر اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکا، میں اس فعل کو کر گزرنے والا تھا۔ کاش میں عثمان رض کو ایسی حالت میں چھوڑتا کہ ان کی بیویاں ان پر نوحہ کر رہی ہوتیں!"
یہ شعر پڑھ کر حجاج نے پوچھا "کیا یہ تیرا شعر ہے؟"
"ہاں!" ضدی عمیر ضابی نے جواب دیا۔
حجاج نے کہا "پھر کیا وجہ ہے کہ میں تجھ سے حضرت عثمان رض کا بدلہ نہ لوں؟"
عمیر نے ابھی کچھ کہنے کو زبان ہی کھولی تھی کہ حجاج کے حکم سے عمیر کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا اور حجاج کے اشارے پر عمیر ضابی کو قتل کر دیا گیا۔
ہندہ روز اس قسم کے واقعات دیکھتے دیکھتے تنگ آ گئی تھی۔ وہ ہر وقت کڑھتی رہتی کہ قسمت نے اسے کس ظالم سے وابستہ کر دیا ہے۔ حجاج بھی وقتاً فوقتاً اسے شرمندہ یا ذلیل کرتا رہا اس طرح وہ ہندہ سے انتقام لے رہا تھا۔ ہندہ کے آس پاس کنیزوں کا ہجوم رہتا۔ دولت کی کوئی کمی نہ تھی لیکن حجاج کا اہانت آمیز رویہ اسے ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتا۔
وہ اب بھی کوفے کے مقدس مقامات کی زیارت کرتی اور وہاں حجاج سے رہائی کی دعائیں مانگتی رہتی۔ حجاج نے اس کے باپ کو زکات کی وصولیابی اور بیت المال میں داخل کرنے کی خدمت پر لگا دیا تھا۔ اس منصب دار کو مصدق کہتے تھے، حجاج اس سے بہت کم بولتا تھا۔
کوفے کا انتظام کر کے وہ بصرے جانے والا تھا کہ نعمان کو بلایا اور

کہا "بڑے میاں! سنتا ہوں تم اپنے فرائض محنت اور دیانت سے نہیں انجام دے رہے ہو!"

نعمان زرد پڑ گیا۔ پوچھا "یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں اپنے فرائض محنت اور دیانت سے نہیں انجام دے رہا ہوں!"

حجاج ایک دم بگڑ گیا۔ بولا "بے وقوف بوڑھے! یہ تو مجھ سے سوال کر رہا ہے کہ تجھ سے ایسا کس نے کہا۔ مجھ سے کسی نے بھی کہا اس سے تجھے کیا سروکار، سُن میں جب بصرے سے واپس آؤں تو مجھے اپنا خزانہ لبریز نظر آئے۔"

نعمان نے جواب نہ دیا۔

حجاج اندر ہندہ کے پاس پہنچا، کہنے لگا "تیرا باپ میری عزت نہیں کرتا میرے پیچھے وہ معلوم نہیں کیا کر گزرے اس لئے تو اپنے باپ کی ذمہ دار بن، اگر اس سے کسی قسم کی بھول چوک ہوئی تو اس کی ذمے دار تو ٹھہرائی جائے گی!"

ہندہ نے جواب دیا "میں اپنے باپ کی ذمے دار کس طرح بن سکتی ہوں"

"جس طرح میں بنا رہا ہوں اس طرح اور کس طرح؟"

ہندہ نے کہا "میرا باپ بہت ایماندار ہے تمہیں ہرگز یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اس پر غلط قسم کے الزامات لگاؤ۔"

حجاج نے اسے بھی ڈانٹا، بولا "واللہ میں ٹیڑھوں کو تکلے کی طرح سیدھا کر دیتا ہوں، میں بصرے سے واپس آکر باتیں کروں گا!"

وہ بصرے چلا گیا۔

جب بصرے سے واپس آیا تو کئی خوبصورت کنیزیں اس کے ساتھ تھیں، وہ ان پر بہت مہربان تھا اس نے ہندہ کے سامنے ان سے محبت اور لگاوٹ کا سلوک کیا — ہندہ کی حصولیابی میں اسے جو ذرا زحمت پیش آئی تھی اس طرح وہ اس کا انتقام لے رہا تھا۔ حجاج کی ذہنی کیفیت کچھ عجیب ہی تھی۔ جس شے کو اس نے ذرا دشواری سے حاصل کیا تھا۔ اب اسے پاکر اس کی قدر و قیمت بھلا بیٹھا تھا۔ اب وہ ہر ایسے اقدام پر مائل تھا جس سے ہندہ کو ذہنی اذیت پہنچ سکتی تھی لیکن سمجھ دار ہندہ نے ضبط و تحمل کا عظیم الشان مظاہرہ کیا، وہ حجاج کے ہر حملے کو سکون اور

لاپروائی سے جھیل کر بے اثر کر دیتی جس سے حجاج کے جذبۂ انتقام میں اور زیادہ شدّت پیدا ہو جاتی اور وہ ہندہ کو ستانے کے نت نئے طریقے سوچنے لگتا۔

حجاج ہندہ کے سامنے اسے نظر انداز کر کے کسی خاص کنیز میں دلچسپی لیتا اور جب ہندہ اٹھ کر جانے لگتی تو وہ اسے جبراً روک لیتا۔ وہ ہندہ کے بوڑھے باپ سے ایسی مشقت کراتا کہ نعمان کا کمزور جسم اس کا متحمّل نہ ہو سکتا لیکن حجاج ذرا بھی نہ پسیجتا بلکہ الٹے شرمندہ اور ذلیل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے نعمان سے سختی کے ساتھ زکات کا حساب طلب کیا اور یہ دیانت دار انسان اس پر پورا اترا۔ اُس نے نعمان کو کئی بار حساب کتاب کے ساتھ دمشق بھیجا اور اس جان لیوا سفر میں ہر بار بوڑھا نعمان بے حال ہو گیا۔ ہندہ یہ سب صبر و شکر سے برداشت کرتی رہی۔ اس کے دل میں معلوم نہیں کون بیٹھا یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ساری مصیبتیں ہنسی خوشی جھیل لے صبر کبھی رائیگاں نہیں جاتا کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

خارجی سردار شبیب اسے کئی سال سے تنگ کر رہا تھا اور کئی معرکوں میں حجاج کی افواج کو شکست دے چکا تھا اور اس کے نامی گرامی سپہ سالار کام آ چکے تھے، لیکن ایک دن دوپہر کے بعد ایک فوجی دستہ شبیب کی لاش خچر پر لادے ہوئے اس کے محل کے بڑے پھاٹک پر حاضر ہوا۔ حجاج کے لئے یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ ابن زبیر رضؓ کی شہادت کے بعد اہمیت اور مسرت کے اعتبار سے کوئی دوسری خبر اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

اس نے ہندہ نعمان اور دوسرے بہت سارے آدمیوں کو اس لاش کے گرد کھڑا کر دیا۔ لاش سے بدبو آنے لگی تھی، اس نے نعمان کو حکم دیا، ”آگے بڑھ اور شبیب کا پیٹ چاک کر!“

نعمان کو تامل ہوا۔ حجاج نے سختی سے دوبارہ حکم دیا، ”حکم کی تعمیل کر ورنہ میں تیرا پیٹ چاک کر دوں گا“ یہ کہتے ہوئے اس نے خنجر نعمان کی طرف اس طرح پھینکا کہ اگر وہ پھرتی سے ہٹ نہ جائے تو اس کے سینے میں پیوست ہو جاتا۔ نعمان نے خنجر اٹھا لیا اور بجبر و کراہ شبیب کی لاش کے پاس کھڑا ہو گیا۔

حجاج چیخا ”حکم بجا لانے میں عجلت سے کام لے، ورنہ خود مرنے کے لئے تیار ہو جا!“

نعمان مجبوراً ناک سکیڑتا ہوا لاش پر جھکا اور خنجر سے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔
حجاج نے پرمسرت آواز میں کہا "خوب اچھی طرح چیر دے مجھے اس کا دل درکار ہے!"
نعمان نے پسلیوں میں بھی شگاف ڈال دیا۔
حجاج دیوانہ وار آگے بڑھا اور نعمان کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا۔ نعمان خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹا، ہندہ کو خدشہ ہوا کہ حجاج شاید اس کے بوڑھے باپ کو قتل کر دینا چاہتا ہے، دوڑ کر باپ کے درمیان آ گئی لیکن حجاج ان باتوں سے بے خبر اور بے نیاز خنجر لے کر شبیب کی لاش پر جھک گیا اور اس کی پسلیاں چیر چیر کر دل تلاش کرنے لگا اور دل پر نظر پڑتے ہی اسے نوچ کر باہر نکال لیا اور لاش کو پیروں سے روند ڈالا۔ اس کے بھاری پاؤں پسلیوں میں اتر گئے۔
لاش کو خوب اچھی طرح تہ و بالا کرنے کے بعد اس نے دل کو زمین پر دے مارا۔ دل گیند کی طرح اچھلا۔ سپاہیوں کو حکم دیا۔ دل اٹھا کر دوبارہ اس کے حوالے کیا جائے۔ اس نے اس دل کو خنجر سے چاک کر دیا اور اس وقت حجاج کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دل کے اندر سے ایک لٹو جیسی پتھریلی چیز برآمد کی۔
کسی سپاہی نے اس پتھریلی چیز کو دیکھ کر کہا "شبیب کے سینے میں دل کی جگہ یہ پتھر ہی تو تھا جس نے اسے اتنا جری اور شجیع بنا رکھا تھا!"
حجاج نے سپاہی کو حکم دیا "شبیب کے اس مداح کو شبیب کے پاس پہنچا دیا جائے!"
ابھی اس کا جملہ پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ شبیب کے مداح کا سر جسم سے الگ ہو گیا۔
ہندہ نے آنکھیں بند کر لیں، حجاج اس بات پر اس سے وہاں تو نہیں بولا، لیکن اندر پہنچتے ہی ہندہ سے سوال کیا "کیا تو میری خوشیوں کی دشمن ہے یا تجھے میری مسرتوں سے دکھ پہنچتا ہے؟"
ہندہ نے جواب دیا "میری زندگی میں اب خوشی کے لمحات ہیں ہی کہاں تمہاری خوشیوں پر نہ تو مجھے خوشی ہوتی ہے نہ غم"
"تو جھوٹی ہے!" حجاج نے کہا "باہر جب میں نے شبیب کے مداح کی گردن زدنی کا حکم دیا تو تو نے اپنی آنکھیں کیوں بند کر لی تھیں؟"

ہندہ نے کہا "اگر میں تمہاری طرح صاحبِ اختیار ہوتی تو تم سے یہ سوال کرتی کہ اس ظلم اور سفاکی کے موقع پر تم نے اپنی آنکھیں کھُلی کس طرح رکھیں!"

حجاج نے چڑکر کہا "اے کاش تو ذرا احمق ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ تجھے یہ حاضر جوابی کہاں سے ملی؟"

ہندہ نے جواب دیا "میرے اللہ کی طرف سے!"

حجاج نے کہا "پھر لوگ میری سفاکی کی مذمت کیوں کرتے ہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی ہوں اللہ کی طرف سے ہوں!"

ہندہ نے جواب دیا "یہ تو غلط کہتا ہے تجھ میں جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے نہیں شیطان کی طرف سے ہے جو تیری دنیا سنوارنے اور آخرت بگاڑنے میں سرگرم عمل ہے اور تیری آخری سانسوں میں تجھے تنہا چھوڑ کر فرار ہو جائے گا!"

حجاج نے ایک بھرپور طمانچہ اس کے رخسار پر جڑ دیا جس سے ہند کا سر چکرا گیا لیکن وہ روئی نہیں آنکھیں البتہ بھر آئیں۔

حجاج نے شور وغل مچاتے ہوئے کہا "بخدا میں تیرے لئے ایک ایسی سزا کی تلاش میں ہوں جس سے تو زندگی بھر مرقع عبرت بنی رہے!"

ہندہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈبڈبائی آنکھیں زمین میں گڑو کر بیٹھ گئی۔

عبدالملک نے اسے دمشق طلب کیا۔ حجاج جب روانگی کی تیاریاں کر چکا تو اس نے ہندہ اور نعمان کو بھی ساتھ چلنے کا حکم دیا اسے ان دونوں پر اعتبار نہ تھا۔ اس نے دمشق کے لئے دشوار گزار اور پیچیدہ راستہ اختیار کیا' دورانِ سفر ہندہ کو نظر انداز رکھا۔ کھانے پینے کا کوئی خاص خیال نہ کیا۔ کئی جگہ نعمان کو حجاج کے اونٹ کی ساربانی کی خدمت انجام دینی پڑی۔ ہندہ محل سے جھانک کر باپ کی مصیبتوں کو دیکھتی اور سسکیاں بھرنے لگتی۔ اس کی کنیزیں اسے تسلی تک نہ دے سکتی تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ حجاج ان کے اس انسانی عمل سے خوش نہیں ہو گا۔ تند و تیز اور گرم ہوائیں اور ریت کے ذرات نعمان کو جھلسا دیتے۔ اسی عالم میں حجاج بار بار کوئی نہ کوئی چیز نیچے گرا دیتا اور نعمان کو اسے اٹھانے کا حکم دیتا۔ منزل تک پہنچتے پہنچتے بوڑھی ہڈیاں جواب دے گئیں۔ ایک جگہ حجاج کا کوڑا اوپر سے ریت پر گرا اور

حجاج نے اسے اُٹھانے کا حکم دیا۔ بوڑھا نعمان اسے بے دلی سے اٹھانے کے لیے جھکا اور جُھکتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ ریت پر لیٹ گیا۔ حجاج نے گردوپیش چلنے والے ایک خدمت گار کو حکم دیا "اس کام چور کو اُٹھا کر کھڑا کر دو!"

خدمت گار نے اُسے اُٹھانا چاہا لیکن نعمان کھڑے ہونے کے بجائے اس کے بازوؤں میں جھولنے لگا۔ اس کی گردن خدمت گار کے سینے پر ایک طرف لڑھک گئی اور دونوں پیر ریت پر جمنے کے بجائے پھسلتے چلے گئے۔ بالکل اس طرح جیسے کسی مدہوش آدمی کو سنبھالا جا رہا ہو۔

حجاج نے پوچھا "کیا یہ بے ہوش ہو چکا ہے؟"

خدمت گار نے جواب دیا "شاید یہی بات ہے کیونکہ اس کے تمام اعضاء ڈھیلے پڑ گئے ہیں!"

حجاج نے اوپر ہی سے حکم دیا "اس کی ناک پر اپنی ہتھیلی تو رکھنا کیا یہ سانسیں لے رہا ہے؟"

خدمت گار نے تھوڑی دیر تک اپنی ہتھیلی نعمان کے نتھنوں پر ٹھہرائے رکھی پھر مایوسی سے جواب دیا۔

"حضور والا! شاید یہ زندہ نہیں ہے!"

حجاج نے کہا "انا للہ"

خدمت گار نے پوچھا "اس کے لئے اور کوئی حکم؟"

حجاج نے جواب دیا "اس مصیبت کو یہیں رہنے دیا جائے، صحرا کی ریت اسے چھپا لے گی!"

لیکن جب ہندہ کو اس سانحے کا علم ہوا تو وہ چیخ مار کر رو دی اور محمل سے کود پڑنے کی کوشش کی۔ لیکن کنیزوں نے اسے سنبھالے رکھا۔

حجاج نے قافلے کو حکم دیا "سفر جاری رہے!"

ہندہ نے چیخ کر کہا "لیکن میں آگے نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں میرے باوا کے پاس چھوڑ دو!"

حجاج کی آواز پھر گونجی "سفر جاری رہے!"

ہندہ کے محمل میں ایک ہنگامہ بپا تھا اور سفر دشوار ہو رہا تھا کسی کنیز نے بآواز بلند کہا "سردار سے کہو اس کی جنوں خیز یاں ہمارے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہیں!"

حجاج کو جب یہ پیغام ملا، تو وہ ہندہ کے پاس آیا اور غصّے میں پوچھا " تو کیا چاہتی ہے؟"

ہندہ نے جواب دیا " مجھے یہیں باوا جان کے پاس چھوڑ دو۔ میں آگے نہیں جاؤں گی!"

حجاج نے کہا " ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو میں خود بھی جانتا ہوں کہ تو زندگی بھر میرے پاس نہیں رہ سکتی لیکن جدائی کا ابھی وقت نہیں آیا "

" ظالم انسان!" ہندہ چیخ مار کر رونے لگی " خدا کے غضب سے ڈر۔ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ زمین اور آسمان میں مظلوم کی آہ بھر کا فاصلہ ہے!"

حجاج نے غضبناک آواز میں کہا " او دشمنِ خدا تو علیؓ کا نام احترام سے لیتی ہے!!"

" ہاں میں اس مقدس ہستی کا نام احترام ہی سے لوں گی کیونکہ اس نے جو کچھ کہا وہ ابدی اور دائمی صداقت بن گیا!"

حجاج دانت پیستا ہوا بولا " اچھا پھر تو ذرا دم لے، میں تجھے عنقریب ایسی سزا دوں گا، جو تجھے زندگی بھر یاد رہے گی اور لوگ تجھ سے عبرت حاصل کریں گے!"

ہندہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا " امورِ سیاست و شقاوت میں تو کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو لیکن اور معاملات میں تو بڑا احمق ہے کیا تو نہیں جانتا کہ عبرت، لوگ مظلوم سے نہیں ظالم سے حاصل کرتے ہیں اگر تیرے ظلم نے مجھے مُرقعِ عبرت بنا دیا تو دیکھنے والی آنکھیں مجھ سے نہیں تجھ سے عبرت پکڑیں گی اور دلوں میں تجھ پر لعن طعن کریں گی "

حجاج نے تقریباً کسی پاگل کی طرح چیخ کر کہا " گستاخ لڑکی! تیرا عبرتناک انجام تجھ پر سایہ فگن ہو چکا ہے دمشق تیرا دار عقوبت ہے " پھر کنیزوں کو حکم دیا " اسے پکڑ کر رکھو! اسے ابھی مرنے نہیں دیا جائے گا!"

وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا اور قافلے کو حکم " سفر جاری ہے!

قافلہ چل دیا۔ بوڑھے نعمان کی لاش پر سے اونٹوں کی قطاریں گزر گئیں، ہندہ سسکتی رہی، روتی رہی "

دمشق میں وہ جس شاندار محل میں اُتری اس کے خدمت گار اور کنیزیں حجاج کے حکم پر کسی بد ترین خلائق مجرم کی طرح اس کی نگرانی کرنے لگیں۔ حجاج عبدالملک کی خدمت میں موجود رہا۔ وہاں معلوم نہیں کن کن مسائل پر صلاح مشورے ہوتے رہے، بعض معاملات پر حجاج ڈانٹا بھی گیا۔ مثلاً عبداللہ ابن زبیرؓ کی لاش کے سلسلے میں

عبدالملک نے اس سے ترشی سے کہا "بدبخت! تجھے ابن زبیرؓ کی لاش فوراً ہی اس کی ماں کے حوالے کر دینی چاہیئے تھی!"

حجاز نے عاجزانہ جواب دیا "امیر المومنین! کسی خطرناک باغی سے ابن زبیرؓ کی لاش جیسا سلوک کرنا اس لیئے ضروری ہے کہ اس سے دوسرے سرکشوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں میں نے جو کچھ بھی کیا وہ امیر المومنین کی خیر خواہی میں کیا ہے!"

عبدالملک نے کہا "میں تیزی و فاداری اور سیاست کا قائل ہوں لیکن پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ جہاں بات سے کام چلتا ہو وہاں درّہ نہیں اٹھنا چاہیئے اور جہاں درّے سے کام چل سکتا ہو وہاں تلوار نہیں اٹھنی چاہیئے۔

حجاج نے انکسار سے جواب دیا "امیر المومنین جو کچھ فرماتے ہیں میں اس کی تائید کروں گا۔ لیکن یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ سیاست اور حکمرانی میں طاقت اور تشدد سے بڑھ کر کوئی ہتھیار نہیں دنیا کی ہر شے انہی کی تابع ہے اسی ہتھیار سے ابن زبیرؓ کو زیر کیا گیا۔ اور یہی وہ حربہ ہے جس سے مشہور خارجی سردار شبیب زیر ہوا جو اپنی حماقت سے دوسروں سے خود کو امیر المومنین کہوانے لگا اور پھر یہ طاقت اور تشدد ہی تو ہے جن سے بصرے اور کوفے کے سرکشوں اور منافقوں کو قابو میں کیا گیا ہے!"

عبدالملک نے کہا "تو جیسا مناسب سمجھ کرتا رہ مجھے تجھ پر اعتماد ہے!"

ادھر سے فارغ ہو کر حجاج ہندہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت ہندہ نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور اس نے جس رومال سے اپنی کمر کس رکھی تھی اس کا رنگ بھی کالا تھا۔ کالے لباس نے اس کے روشن چہرے کو حد درجہ حسین بنا دیا تھا۔ کالے لباس اور سیاہ بالوں کے درمیان سرخ و سپید چہرہ ایسا لگتا تھا جیسے رات کے اندھیرے سے شفق پھوٹ رہی ہو، حجاج بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

ہندہ نے اس کی آمد کو جیسے محسوس ہی نہ کیا۔ حجاج تھوڑی دیر تک اس کے پاس کھڑا رہا اور اس بات کا امیدوار رہا کہ ہندہ اس کی طرف دیکھ کر ہمکلامی میں پہل کرے لیکن ہندہ نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔

حجاج نے آہستہ سے کہا "ہندہ! یہ تو نے سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

ہندہ نے جواب دیا "اس لیئے کہ دنیا میرے لیئے ماتم کدہ بن چکی ہے اور تمہارے اختیار اور اقتدار نے میرے ارمانوں اور خواہشوں کو ہلاک کر ڈالا ہے!"

"تجھے اپنے بوڑھے باپ کی موت کا غم ہے؟"

"نہیں، اس شخص کی موت کا اتنا غم نہیں ہے۔ تیرے ظلم کا میرا بوڑھا باپ کوئی پہلا شکار تو تھا نہیں۔"

حجاج نے درشت لہجے میں کہا "وہ بد دیانت تھا۔ اس کی موت تو اس کے حق میں ایک نعمت ثابت ہوئی اگر وہ زندہ ہوتا تو معلوم نہیں کیسی عبرت ناک سزا کا مستحق ٹھہرتا اگر وہ زندہ ہوتا تو ——— اس رسوائی اور سزا سے بچانے کے لئے اسے میں خود ہی قتل کر دیتا!" وہ خائن تھا۔"

ہندہ نے غصے میں کہا "اب بابا جان تو اس دنیا میں موجود نہیں جو الزام چاہے لگا تا رہ۔ لیکن یہ مت بھول کہ کل قیامت میں تیرا زور نہیں چلے گا اور تجھے اپنے ظلم کا جواز اور الزام کی صداقت کا ثبوت دینا ہوگا۔"

حجاج نے نرمی سے کہا "میں تجھے قتل کر سکتا ہوں، لیکن ایسا نہیں کروں گا۔ میں چاہتا تھا کہ تجھے پشیمان کروں اور اب تک تجھے جتنی آذیتیں دی گئی ہیں تو ان کے خلاف نالہ و فریاد کرے لیکن تیرا ضبط و تحمل میرے غیظ و غضب میں اضافے کا باعث بن گیا ہے جب تو میری کسی سزا کو خاموشی سے جھیل جاتی ہے تو گویا تو میری عریاں پشت پر ایک زوردار تازیانہ رسید کر دیتی ہے اب یہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے!"

ہندہ نے کہا "تب پھر تو مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتا۔ تاکہ ہم دونوں کا مصیبت سے پیچھا چھوٹے!"

"میں تجھے طلاق دوں گا اور ضرور دوں گا لیکن اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ تو طلاق کے بعد کسی اور سے شادی کرے گی تو یہ تیری سخت بھول ہوگی۔ تو ہمیشہ تنہائی کی لاوارث زندگی گزارے گی اور ہر وہ ہاتھ جو تیری چاہت میں تیری طرف بڑھے گا اسے قلم کر دیا جائے گا جو بھی تیری طرف اٹھیں گے توڑ دیئے جائیں گے اور جس دل میں تو بسے گی اسے شبیب کے دل کی طرح چیر کر پھینک دیا جائے گا۔"

ہندہ نے کہا "طلاق کے بعد تنہائی اور لاوارثی کا عذاب اتنا برا نہیں ہوگا جتنا تیری قربت اور نسبت سے میں اٹھا رہی ہوں۔"

اسی کشمکش میں کچھ دن اور گذر گئے۔ ایک دن دوپہر سے دو گھڑی پہلے ہندہ کو اطلاع دی گئی کہ حجاج کا خادمِ خاص عبداللہ بن طاہر، ہندہ کے لئے حجاج کا کوئی

خاص پیغام لے کر آیا ہے!

ہندہ نے اسے زنانخانے کے قریب کے کمرے میں بلا لیا۔ عبداللہ بن طاہر غمزدہ صورت لئے بیٹھ گیا۔

ہندہ اس کے سامنے چلی گئی۔ پوچھا "ابن طاہر! خیریت تو ہے تم سوگوار کیوں ہو؟"

ابن طاہر نے افسوس سے کہا "باہر اونٹوں پر دو لاکھ درہم لدے ہوئے ہیں یہ آپ کا حقِ مہر ہے جو حجاج نے آپ کی خدمت میں روانہ کیا ہے!"

ہندہ نے خوشی کو چھپاتے ہوئے پوچھا "اور کچھ؟"

ابن طاہر نے جواب دیا "حجاج نے آپ کو طلاق دے دی ہے۔ اور زبانی پیغام دیا ہے کہ آپ کسی اور سے شادی نہیں کریں گی، اگر ایسا کریں گی تو اپنے ہونے والے شوہر کی موت کو دعوت دیں گی!"

ہندہ نے کہا "اور کچھ؟"

اس نے جواب دیا "اور یہ کہ آپ اسی وقت اس محل کو چھوڑ دیں کیونکہ طلاق ہو جانے کے بعد حجاج آپ کو اس محل میں نہیں دیکھنا چاہتا!"

ہندہ نے طنزاً پوچھا "کیا وہ سنگ دل مجھ سے الوداعی ملاقات بھی نہ کرے گا!"

ابن طاہر نے جواب دیا "حجاج کا خیال ہے کہ اس کا دل ناقابلِ تسخیر ہے ایک عورت تو اسے کسی طرح بھی زیر نہیں کر سکتی!"

ہندہ کے لئے دمشق میں کوئی اور ٹھکانا بھی تو نہ تھا۔ ذرا سی دیر کے لئے وہ پریشان ضرور ہو گئی لیکن پھر کچھ سوچتی ہوئی بولی "ابن طاہر! مجھے اس کے درہموں کی کوئی ضرورت نہیں تو نے مجھے میری زندگی کی جو عظیم الشان خوشخبری سنائی ہے یہ دو لاکھ درہم میں تجھے اس کے نذرانے میں پیش کر رہی ہوں، مجھے اس ظالم کی دولت سے پناہ مانگتی ہوں!"

ابن طاہر کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی جھک کر بولا "تب پھر مجھ پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ میں فوراً ہی کسی اور جگہ آپ کے قیام کا بندوبست کر دوں!"

ہندہ نے کہا "یہ دو لاکھ درہموں کا معاوضہ نہیں ہے لیکن میں سرِدست ٹھکانا چاہتی ضرور ہوں اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے!"

ابن طاہر نے آہستہ سے کہا "لیکن میری ایک درخواست ہے!"

"کہو۔ بیان کرو!"

ابن طاہر نے کہا "میرے اس تعاون کا حجاج کو علم نہیں ہونا چاہیے!"
ہندہ نے اسے اطمینان دلایا کہ تو مطمئن رہ!"
ابن طاہر نے اسی دن دمشق کے مشرقی علاقے میں ہندہ کی رہائش کا انتظام کردیا اور ہندہ فوراً ہی اس میں منتقل بھی ہوگئی۔
حجاج کا یہ ایک غیر معمولی اقدام تھا۔ یہ داستان چھپی نہ رہ سکی، حجاج کے ظلم اور ہندہ کے حسن، ضبط اور حاضر جوابی کا چرچا پھیلنے لگا لوگ اس سے رجوع ہونا چاہتے تھے لیکن حجاج کی دہشت انہیں بے بس کردیتی، حجاج کے مخالفین نے نہایت ہوشیاری سے یہ خبر عبدالملک تک پہنچادی۔ اور ہندہ کے حسن وجمال کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ اس نے بے ساختہ پوچھا "کیا وہ بہت زیادہ حسین ہے؟"
مصاحب نے عرض کیا "امیرالمومنین خود ملاحظہ فرماسکتے ہیں، نہ صرف حسین بلکہ بلا کی حاضر جواب اور ذہین بھی، اتنی ذہین کہ اس کی دوسری کوئی مثال بھی نہ ملے گی!"
عبدالملک نے اپنی کنیزوں کے ذریعے ہندہ کے بارے میں ساری معلومات جمع کرلیں اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندہ ایک دُرِ نایاب ہے جسے نااہل اور قدرناشناس حجاج نے اپنی بدمذاقی سے کھودیا۔ عبدالملک نے ہندہ کو ایک خط لکھوایا۔ اس کے حاجب نے کہا۔
"ہندہ! امیرالمومنین نے تیرے حسن وجمال اور ذہانت کا شہرہ سن کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ تو ان کے حرم کو اپنی ضیاپاشیوں سے منور کرے!"
ہندہ نے نہایت دانائی سے جواب لکھا۔
"امیرالمومنین کے لیے اس کنیز کی جان تک حاضر ہے لیکن کنیز یہ چاہتی ہے، کہ امیرالمومنین جو کچھ چاہتے ہیں، اس کا خود ہی اظہار فرمادیں، یہ کنیز معلوم نہیں کیوں، یہ ناپسند کرتی ہے کہ میرے اور امیرالمومنین کے مابین حاجب جیسی کوئی تیسری شخصیت بھی حائل رہے۔
اس بار عبدالملک نے خود خط لکھا۔
میں تیری شرط پوری کررہا ہوں۔ میں چاہوں تو جبر سے بھی کام لے سکتا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں جگہ جگہ عدل اور انصاف کا حکم دیتا ہے، ایک حکمران کی حیثیت سے جبر اور ظلم سے تجھے نہیں اپنا سکتا!"

ہندہ نے جواب دیا۔

" امیر المومنین نے اپنے موقر نامے میں جس شرط کا ذکر فرمایا ہے وہ شرط نہیں درخواست تھی کنیز، تو امیر المومنین سے اپنی وابستگی کو سرمایۂ فخر و انبساط سمجھے گی لیکن جیسا کہ خود امیر المومنین کو بھی علم ہوگا کہ یہ کنیز مردم گزیدہ ہے اور آدمیوں سے اسے بہت ڈر لگتا ہے کنیز کا پہلا تجربہ اتنا تلخ اور سوہان روح تھا کہ اب بھی جب اس دور کو یاد کر لیتی ہوں تو میری بھوک پیاس اڑ جاتی ہے اور میں اپنا سکھ چین تک کھو بیٹھتی ہوں، ان حالات میں اب کسی دوسرے تجربے کی کنیز خود میں ہمت نہیں پاتی۔ ورنہ یوں تو امیر المومنین کو اپنی رعایا پر پورا اختیار حاصل ہے، یہ کنیز چند لمحوں میں داخل حرم ہو سکتی ہے!"

عبدالملک دل ہی دل میں ہندہ کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس نے لکھا۔

" تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو، میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ معمولی سی بات بھی ضرور معلوم ہوگی کہ دنیا کا ہر شخص حجاج نہیں ہے، اس نے اب تک جو بھی انتہائی تشدد اور ظلم کا قدم اٹھایا ہے اس میں خلافت کی فلاح و بہبود کا منشا ضرور کار فرما رہا ہوگا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نے بعض کو اپنے بغض و عناد کا نشانہ بھی بنایا ہوگا اور اسے اس کی سزا بھی ملنی چاہیئے لیکن خلافت اس کے اس نوع کے جرائم کی طرف سے اس لئے چشم پوشی اختیار کرتی ہے کہ استحکام خلافت میں حجاج کا زبردست ہاتھ ہے، حرمِ خلافت تیری پیشوائی کے لئے کھلا ہے، جب بھی چاہے آسکتی ہے۔"

اس خط و کتابت سے ہندہ کا چلوؤں خون بڑھ رہا تھا وہ حجاج کی گرفت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکلی جا رہی تھی۔ ہندہ نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔ اس نے عبدالملک کو لکھا۔

" امیر المومنین چونکہ اس کنیز پر بے حد مہربان ہیں اس لئے درخواست کرے گی کہ جب میں امیر المومنین کے حبالۂ عقد میں آجاؤں اور میرا محل کھڑا ہو تو اس کی ساربانی کی خدمت حجاج ابن یوسف پا پیادہ انجام دے۔ میں نے اپنے اللہ سے یہ منت مان رکھی ہے اور امیر المومنین کی وساطت سے اپنی یہ منت پوری کرنا چاہتی ہوں!"

عبدالملک نے ہندہ کے اس آخری خط کی پشت پر حجاج کے نام حکم لکھ دیا:۔

"منجانب عبدالملک بن مروان امیرالمومنین خلافتِ اسلامیہ و بنوامیہ
بنام حجاج بن یوسف ثقفی، عامل عراقین!
تجھے اس تحریر کے ذریعے حکم دیا جاتا ہے کہ امیرالمومنین کی ہونے والی حرم ہندہ بنت نعمان کے اونٹ کی ساربانی پر تجھے متعین کیا گیا ہے اس روز تیرا یہ فرض ہے کہ تو ساربانی کا فریضہ پیادہ پا ادا کرے۔"

حجاج نے جب یہ فرمان پڑھا تو سناٹے میں آگیا اور اس نے عبدالملک کو مطلع کر دیا کہ فرمانِ عالی سے غلام مطلع ہوا حسب الحکم فرمان کی تعمیل ہوگی!"

جب ہندہ کو یہ معلوم ہوا کہ عبدالملک نے اس کی درخواست قبول کرلی ہے اور حجاج کو اس کے محل کی پیادہ پا ساربانی کی خدمت کا حکم صادر فرما دیا گیا ہے تو بے اختیار سجدے میں گر گئی۔

اس لاوارث لڑکی کے لئے قصرِ خلافت سے کنیزوں اور خدمت گاروں کا ایک پرا نازل ہوگیا اور اس نے اسے دلھن بنا دیا۔ جب شادی کی مروجہ رسوم ادا کی جا چکیں تو محمل بردار اونٹ دروازے پر کھڑا کر دیا گیا۔ پیادہ پا حجاج ابن یوسف کے ہاتھ میں اس کی مہار تھی۔

خدام نے شور مچایا "ملکہ عالیہ تشریف لا رہی ہیں اونٹ بٹھایا جائے!"

حجاج نے اونٹ بٹھا دیا۔

ہندہ کنیزوں کی مدد سے محمل کے اندر چلی گئی دو کنیزیں اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد جب اونٹ قصرِ خلافت کی طرف روانہ ہوا تو ہندہ ماضی میں چلی گئی اور حجاج کے مظالم یاد کر کے مغموم ہوگئی لیکن انہی لمحات میں کسی نے اس کے کان میں کہا "اس وقت تیری حیثیت اُس مچھر جیسی ہے جس نے نمرود جیسے حکمران کو اس کے اپنے ہی خدام سے جوتے کھلوا دیئے تھے"۔

ہندہ ہنسنے لگی، پھر ذرا اونچی آواز میں اپنی کنیزوں سے کہنے لگی "تم جانتی ہو، میں کہاں جا رہی ہوں؟"

کنیزیں اس کے مہمل سوال پر اس کا منہ تکنے لگیں۔

ہندہ نے خود ہی جواب دیا "میں وہاں جا رہی ہوں جہاں ظالموں

کی تلواریں میرا پیچھا نہیں کر سکتیں اور لمبے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔"
حجاج ہندہ کا طنز محسوس کر رہا تھا لیکن صبر و شکر کے سوا کوئی چارا نہ تھا۔

ہندہ نے سونے کے چند سکّے (دینار) نیچے گرا دیئے اور حجاج کو آواز دی "او ساربان! میرے چند درہم (چاندی کے سکّے) نیچے گر گئے ہیں۔ ذرا اٹھا تو دینا۔"

حجاج نے اونٹ کھڑا کر دیا اور پیچھے واپس آ گیا۔ وہاں سے دینار اُٹھا لایا۔ پھر محمل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا "ملکۂ عالیہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے گرنے والے سکّے درہم نہیں دینار ہیں!"

ہندہ نے دینار لے لئے اور اپنی کنیز سے کہنے لگی "میرا خدا بھی کتنا کارساز ہے کہ گرے تو تھے چاندی کے سکے لیکن بن گئے سونے کے سکّے۔ جب وہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اسی طرح ہوتا ہے!"

ہندہ نے اسے بار بار سکّے اٹھانے کی زحمت دی، حجاج جھکتے جھکتے دہرا ہو ہو گیا لیکن ملکۂ عالیہ کی بجا آوری خدمت میں کوتاہی یا سستی کسی طرح بھی نہ دکھا سکتا تھا جب بھی حکم ملتا جھکتا اور گرنے والی چیز اٹھا کر ملکہ عالیہ کے حوالے کر دیتا۔

ہندہ نے ہنستے ہوئے اپنی کنیزوں سے کہا "اے کنیزو! کیا تمہیں ایک دانا و بینا فلسفی کا یہ نظریہ معلوم ہے۔"

کنیزوں نے بیک زبان پوچھا "کون سا نظریہ؟"

ہندہ نے جواب دیا "یہ کہ دنیا کی ہر شے طاقت کی تابع ہے!"

"بے شک، بے شک!" کنیزوں نے پڑھے پڑھائے اور رٹے رٹائے لوگوں کی طرح جواب دیا۔

حجاج کے لئے یہ سب بالکل ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا اسے اس موقع پر بصرے کا وہ ستّر سالہ بوڑھا یاد آیا جس نے مرتے وقت ہندہ کو حجاج سے غائبانہ متعارف کرایا تھا اور مرنے سے پہلے مدہوشی میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ "وہ ایک ایسا فتنہ ہے جو تیرے سارے کس بل نکال دے گی!"

حجاج کو چکر سا آ گیا۔ خود بخود لبول اُٹھائے اولوڑھے! تو کہاں ہے کیا تیری روح میرے آس پاس موجود ہے کیا تو ولی تھا۔ دیکھ تیرا آقا حجاج کس فتنے کا شکار ہو گیا ہے"۔

ہندہ نے محل سے جھانک کر دیکھا، اپنی کمر کو ایک کپڑے سے کسے، منہ پر عمامہ لپیٹے پیروں پر گرد کی تہہ جمائے اونٹ کی مہار تھامے حجاج بن یوسف معصوم صورت کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے ساربانی کی خدمات ہی انجام دیتا چلا آیا ہے اور اس سے کبھی ایک چڑیا تک مارنے کا ظلم سرزد نہیں ہوا۔

بھورے رنگ، میانہ قد اور دراز ریش عبدالملک نے اکیس سال دو ماہ دس دن حکومت کر کے باسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا اور اس کی جگہ چپٹی ناک، گندم گول، دراز قد اور چیچک منہ داغ بتیس سالہ ولید بر سر اقتدار آیا۔ عبدالملک نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے ولید کو حجاج کے لئے بطور خاص وصیت کی تھی کہ اس کا خاص احترام کیا جائے اور تند خو اور گرم مزاج بیٹا باپ کی وصیت پر پوری طرح کاربند رہا۔

حجاج اپنے آباد کردہ شہر واسط میں مقیم تھا اور عراق کی گورنری پر فائز ہوئے بیس سال گزر چکے تھے کہ اسے پیٹ کی بیماری کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس کے پیٹ میں کیڑے پڑ گئے تھے جو اسے شب و روز تنگ کرتے اور حجاج جیسا شقی القلب اور قوت برداشت کا انسان بھی اس کی تکلیف سے چیختا چلاتا رہتا اور بالآخر وہ اسی مرض اور اذیت سے چل بسا۔ جب وہ مرا ہے تو متفق الرائے اعداد و شمار کے مطابق، میدانِ جنگ کے سوا حالت امن اور آبادیوں میں وہ ایک لاکھ پچیس ہزار انسانوں کے قتل کا مرتکب ہو چکا تھا اور واسط کے سیاسی قید خانے میں پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں حجاج کے ظلم و شقاوت سے، سردی گرمی سے غیر محفوظ، بدترین غذا اور بدبودار پانی پر سسک سسک کر جی رہے تھے۔

اس کے انتقال پر ہندہ اس کی لاش پر پہنچی۔ اس وقت وہ کفن میں لپٹا پڑا تھا۔ ہندہ نے اس ظالم اور بھیانک انسان کے مکروہ چہرے کو آخری بار دیکھا اور برجستہ چند شعروں میں اپنے واردات

قلبی کا اظہار کیا۔
"او کفن میں لپٹے ہوئے مجبور اور لاچار انسان! میں تجھے یہ بتلانے آئی ہوں کہ تیرے مرنے سے میری اور دُنیا والوں کی آنکھوں نے ٹھنڈک پائی۔ تو راندۂ درگاہ عزازیل (شیطان) کا بہترین ساتھی تھا لیکن تو کتنا بدنصیب ہے کہ جب تُو مرا تو تیرے بہترین ساتھی عزازیل نے بھی تجھے تنہا چھوڑ دیا۔"

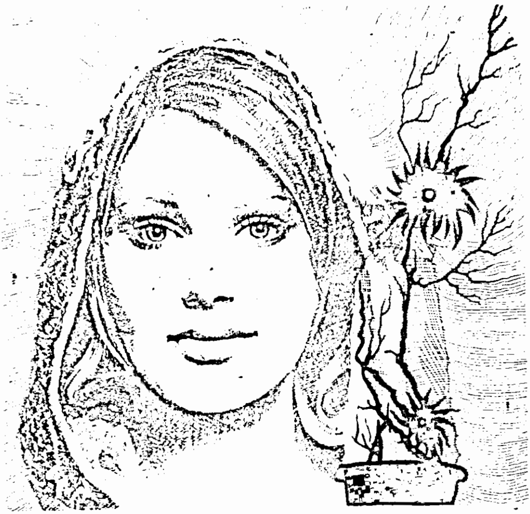

چاند
کا
خدا

مہدی عباسی کے عہد کی داستانِ فتنہ و فساد

اس نے الوہیت کا دعوے کیا اور اپنے آس پاس سادہ لوح معتقدین کا ایک شہر آباد کر دیا۔ پھر اس شہر کے لیے اس نے چاند تخلیق کیا، جو ہر روز شام کو طلوع ہو کر صبح غروب ہو جاتا

دلچسپ اور حیرت انگیز تاریخی داستان، کیف آور حسن و عشق کے ساتھ۔

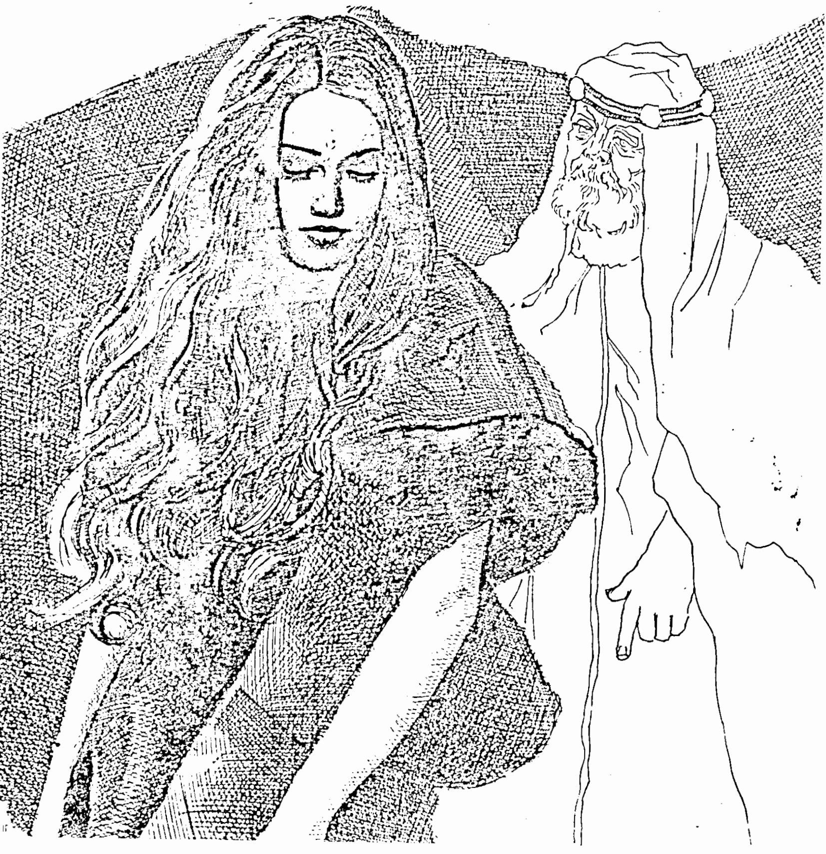

چاند کا خدا

وہ کوہستانی سلسلہ جو کابل، بلخ، مرو اور نیشاپور تک شرقاً غرباً پھیلا ہوا تھا، درمیان میں بحیرۂ خزر کے آجانے سے جنوب میں خم کھا کر دررے، ہوتا ہوا آذربائیجان میں داخل ہو گیا تھا اور یہاں وہ ایک بار پھر جنوب میں بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ بحیرۂ خزر کے جنوب مشرق اور نیشاپور سے ذرا اوپر شمال میں بوگر نامی ایک قصبہ آباد تھا۔ اس کی کل آبادی بمشکل دس بارہ ہزار تھی۔ یوں تو اس قصبے میں مختلف عقاید و مذاہب کے لوگ آباد تھے لیکن ان میں دو مذہبوں کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ ایک تو وہ جو مسلمان کہلاتے تھے اور محمدؐ کو خدا کا بندہ اور آخری نبی مانتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ و ایمان تھا کہ اگر رسول اللہؐ کے بعد کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ ان مسلمانوں کے مقابل یہاں جو دوسرا مذہب اپنا دائرۂ اثر بڑھا رہا تھا وہ سفید جامیان کے لوگ تھے۔ پہلے یہ لوگ بھی مسلمان تھے لیکن بعد میں انہوں نے مرو کے جھوٹے مدعی نبوت و الوہیت ہاشم کا دین اختیار کر لیا جو تاریخوں میں مقنع کے نام سے مشہور ہوا۔ سفید جامیان کا عقیدہ تھا کہ اللہ نے پہلی بار آدم کی شکل میں ظہور کیا۔ اس کے بعد وہ نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ میں حلول ہو کر ظاہر ہوتا رہا۔ ان کے بعد خدا عرب میں حضرت محمدؐ کی شکل میں نمودار ہوا اور آخر میں وہ ابومسلم خراسانی کے جسم میں حلول کر گیا اور ابومسلم خراسانی کے بعد خدا نے مرو کے عجیب و غریب باشندے ہاشم کی شکل میں ظہور کیا ہے۔ یہ ہاشم پہلے ابومسلم خراسانی کی فوج کا ایک جرنیل تھا اور بغداد کی خلافت عباسیہ سے تنخواہ پاتا تھا۔ اس نے ابومسلم کی زندگی میں اتنا بڑا دعویٰ کرنے کی ہمت نہ کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تند خو اور غیر معمولی انا کا حامل ابومسلم اس کے اس دعوے کو کبھی بھی نہ مانتا۔ مگر جب عباسی خلیفہ جعفر منصور نے ابومسلم کو قتل کرا دیا تو ہاشم مرو واپس چلا آیا اور یہاں اس نے پہلی بار یہ اعلان کر دیا کہ خدا اس میں حلول کر چکا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ خلافتِ عباسیہ اور مسلمانوں سے ابومسلم کے خون کا بدلہ لیا جائے اور مقنع (ہاشم)

کے دین کو چاروں طرف پھیلا دیا جائے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس مذہب نے دریائے سیحون و جیحون کے دو آبے کو لپیٹ میں لے لیا اور مرو سے سمرقند و کش تک ان کے مراکز قائم ہو گئے۔ بحیرۂ خزر کا مشرقی ساحلی شہر بوگر بھی ان کے زیر اثر آنے لگا۔ یہاں کے مسلمانوں نے مزاحمت کی اور دونوں کی کشمکش و مزاحمت نے جنگ و جدل کی صورت اختیار کر لی۔ مسلمان کہتے تھے کہ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں، ایک کائنات میں دو خدا اور ایک ہی وقت میں رات اور دن یکجا نہیں رہ سکتے، اسی طرح بوگر میں بیک وقت مسلمان اور سفید جامیان کس طرح اپنا تسلط اور اثر و اقتدار قائم رکھ سکتے ہیں۔

لیکن مقنع کے پیرو سفید جامیان یہ کہتے تھے کہ ان کے پیغمبر مقنع کے ظہور کے بعد خدا نے اسلام کو منسوخ کر دیا ہے اور جب خدا خود ہی مقنع کی شکل میں ظاہر ہو کر اسلام کو باطل قرار دے رہا ہے تو اس کے بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے بعد بھی منسوخ شدہ دین پر قائم رہ کر اپنی دنیا خراب کریں۔ وہ آخرت کا نام یوں نہیں لیتے تھے کہ ان کے دین میں آخرت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

جب نئی تحریکیں چلتی ہیں اور لوگوں میں نئے عقاید داخل ہوتے ہیں تو معاشرے میں گھر گھر ایک ہلچل مچ جاتی ہے۔ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ نئے عقاید اختیار کر کے ہنگاموں کا آغاز کر دیتے ہیں۔ بوگر کا سب سے با اثر اور ذی اقتدار خاندان بھی اس لپیٹ میں آ گیا۔ اس خاندان کا سربراہ نصر یہ کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی جعفر اسلام چھوڑ کر نئے دین میں داخل ہو جائے۔ ایک ہی ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والے دو بیٹے عقائد کی دو مختلف شاہراہوں پر گامزن ہو چکے تھے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی مخالفت کی، خاندان کے دوسرے لوگ بھی مداخلت سے باز نہ رہ سکے اور ان میں سے زیادہ تر لوگ تو نصر کی طرف ہو گئے اور کچھ نے جعفر کا ساتھ دیا۔ اس گروہ بندی میں ایک بات صاف نظر آتی تھی کہ نصر کا جن لوگوں نے ساتھ دیا وہ سارے وہی لوگ تھے جنہیں اسلام اور اسلام کے بانی سے غیر معمولی اُنس تھا اور جو جعفر کے طرفدار ہو گئے تھے ان میں خاندان کے وہ لوگ تھے جن کے ساتھ اہل خاندان نے زیادتیاں کی تھیں اور جو مسلسل معاشی ناانصافیوں کا شکار ہوتے رہے تھے۔ یہ لوگ خود کو خاندان سے کچھ الگ تھلگ سا محسوس کرتے رہے تھے اور جب انہیں ایسا موقع میسر آ گیا کہ وہ علی الاعلان نمایاں طور پر خود کو متموّل اور خوش حال خاندان سے الگ کر لیں تو انہوں نے مقنع کا دین اختیار کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس اختلاف کا سب سے بُرا اثر نصر کے بیٹے لیث اور جعفر کی بیٹی بنوقہ پر پڑا۔ بنوقہ ایران کے ایک نام بانو کا ماوراء النہری تلفظ تھا۔ عقائدی

دیواروں نے دونوں گھروں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔ باپ نے بیٹے پر پابندی عاید کر دی کہ اب وہ بنوقہ سے نہیں ملے گا۔ دوسری طرف بنوقہ کے باپ نے بیٹی کو چھوٹ دے دی کہ اگر کسی طرح وہ لیث کو اپنی محبت سے قابو میں لاسکتی ہے تو ضرور لائے کیونکہ اس طرح وہ سفید جامیان میں ایک شخص کے اضافے کا ثواب حاصل کرے گی۔

بنوقہ گھر میں بیٹھی لیث کی اچانک آمد کی منتظر رہتی۔ وہ اچھے لباس پہن کر بالوں کو شانوں پر بکھیر دیتی۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے بارہا اپنی جاذبیت اور دلکشی کو خود اپنی نظروں سے دیکھا اور مسکراتی ہوئی شرمسار ہوگئی۔ گویا اس کا فرارانہ انداز میں اسے لیث نے دیکھ لیا ہو۔ یہ روش کئی ماہ جاری رہی لیکن لیث نہیں آیا۔ پھر خبر دینے والوں نے یہ اطلاع دی کہ لیث پر باپ کا دباؤ ہے۔ اور عام حالات میں اس کا بنوقہ تک آنا ناممکن ہے۔ پھر یہ بھی خبر ملی کہ لیث بہت اداس ہے اور اکثر و بیشتر وہ بحیرۂ خزر کے ساحل پر گم صم اداس اداس پھرتا رہتا ہے۔ بنوقہ کے لیے یہ ایک بہترین خبر تھی۔ اس نے کاشغر کی راہ سے آیا ہوا چین کا ریشمی لباس پہنا اور جسم نما کرتے کو کمر کے گرد قیمتی ریشمی رومال سے کس کر باندھ لیا جس سے کرتے کا بالائی حصہ جسم سے چپک گیا اور اوپر کے نشیب و فراز قیامت کی طرح ہو گئے۔ عام رواج سے کچھ زیادہ کھلا گلا کوہ بیتوں میں دودھ کی نہر کی طرح دمکنے لگا۔ لمبی زلفوں کو رومال میں چھپا لیا۔ چہرے پر چینی غازہ ملا اور لباس کو بھینی بھینی خوشبو سے معطر کیا۔ ماں نے یہ تیاریاں جو دیکھیں تو دریافت کیا۔ "بنوقہ یہ تیاریاں کس کے لیے ؟"

بنوقہ نے جواب دیا۔ "اس شخص کے لیے جو ابھی تک گمراہ ہے لیکن اس کی گمراہی مستقل نہیں ہے۔"

ماں نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور پوچھا۔ "کیا وہ یہاں آنے والا ہے ؟"

"نہیں۔" بنوقہ نے آئینے میں سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا پر نظریں ڈالیں اور مدہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کرتی ہوئی بولی۔ "وہ یہاں نہیں آئے گا بلکہ میں خود اس کے پاس جاؤں گی۔"

ماں نے اس سے اختلاف کیا، بولیں۔ "جب وہ خود نہیں آتا تو تُو وہاں کیوں جائے گی ؟"

بنوقہ نے جواب دیا۔ "جب خدا خود مقنع میں حلول کر کے انسانوں میں آسکتا ہے تو لیث کے پاس میرا پہنچ جانا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر آنکھیں کھول کے مسکرا کر ماں کو دیکھا اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کے ۔ ے گئی اور محبت اور خوشامد کے ملے جلے انداز میں کہا۔ "ہاں! لیث کے پاس میں اپنے لیے نہیں جا رہی ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ جس سے میں محبت کرتی ہوں وہ گمراہ رہے۔"

ماں نے پوچھا۔ ''لیکن وہ تجھے ملے گا کہاں؟''
بنوقہ نے جواب دیا۔ ''بحیرۂ خزر کے ساحل پر۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ آجکل وہ اداس اداس سمندر کے ساحل پر پھیرتا رہتا ہے۔''
ماں نے لیث پر لعنت بھیجی۔ ''آدمی کی بہادری دو جگہ دیکھی جاتی ہے، میدانِ جنگ میں یا بساطِ محبت پر۔ بساطِ محبت میں تو وہ بزدل نکلا، میدانِ جنگ کا پتہ نہیں۔''
بنوقہ جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی، بولی۔ ''ماں وہ ایسا نہیں ہے۔ اسے آبائی مذہب اور والدین کی محبت نے روک رکھا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اسے بہادر بنا لوں گی اور لیث میرے لیے سب کچھ چھوڑ دے گا۔''
ماں نے مجبوری سے کہا۔ ''جیسی تیری مرضی لیکن تو تنہا نہیں جائے گی۔ خداوندِ مقنع کے چند مبلغ آئے ہوئے ہیں تو ان میں سے ایک کو اپنے ہمراہ لے جا سکتی ہے۔''
بنوقہ نے جواب دیا۔ ''لیکن ایک شرط پر!''
''یعنی؟''
''یعنی یہ کہ وہ مبلغ مجھے لیث سے بات کرنے کا موقع ضرور دے گا۔ وہ مجھ سے ذرا دور رہے گا، اور جب تک میں خود اسے اپنے پاس نہ بلاؤں وہ نہیں آئے گا۔''
ماں نے ہنستے ہوئے پیار سے کہا۔ ''بنوقہ! کیا تو مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہے؟''
بنوقہ ماں کی بات نہیں سمجھی۔ وہ کچھ کہے بغیر کہیں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب واپس آئیں تو ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان ان کے ساتھ تھا۔ اس کی بھری بھری سیاہ داڑھی، گول سرخ و سفید چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ قد میانہ، صحت بہت اچھی، چہرے پر شوخی اور سنجیدگی کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ ماں نے بنوقہ سے اس کا تعارف کرایا۔ ''بنوقہ! اس سے ملو۔ اس کا نام زہیر ہے۔ خداوند مقنع نے بوکرہ میں اپنے دین کی تلقین و اشاعت کے لیے جن لوگوں کو بھیجا ہے ان میں زہیر سب سے کم عمر مبلغ ہے لیکن علم اور گفتگو میں یہ اپنے عمر رسیدہ ساتھیوں پر فوقیت رکھتا ہے۔''
بنوقہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ زہیر کا تعارف اتنے ذوق و شوق سے کیوں کرا رہی ہیں۔
ماں نے زہیر سے کہا۔ ''یہ میری بیٹی بنوقہ ہے۔ یہ اپنے چچا کے بزدل بیٹے لیث کو پسند کرتی ہے۔ اگر یہ میری رائے لیتی تو میں اسے کچھ اور مشورہ دیتی۔'' پھر زہیر اور بنوقہ کو یکے بعد دیگرے دیکھ کر مسکرائی، کہنے لگی۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر یہ ایک بے دین کو خداوند مقنع کے دین میں لے آئے لیکن اگر اپنے ارادے میں یہ ناکام رہی تو پھر میں وہی کروں گی جس کا میں نے اپنے

دل میں ارادہ کر لیا ہے۔"

بنوقہ ماں کی باتیں کچھ سمجھی کچھ نہیں سمجھی۔ حالانکہ ماں کا ارادہ یہ تھا کہ اگر بنوقہ زبیر کو ساتھ لے کر لیث کے پاس جائے گی تو اس کا جو نتیجہ بھی نکلے گا وہ فیصلہ کن ہوگا۔ انسانی نفسیات کے پیش نظر لیث بنوقہ کے ساتھ زبیر کو دیکھ کر ایک رقابت محسوس کرے گا اور بنوقہ کو اپنانے یا نہ اپنانے کا جو فیصلہ تذبذب کا شکار ہو سکتا تھا اس طرح فی الفور ہو جائے گا۔ یا تو لیث بنوقہ کے حق میں فوراً فیصلہ کر کے خداوند مقنع کا مذہب اختیار کر لے گا یا پھر فوراً پیچھے ہٹ کر بنوقہ کو زبیر کے لیے چھوڑ دے گا۔ اسے زبیر پسند تھا لیکن لیث اگر اس کے دین میں شامل ہو جائے تو پھر زبیر کے مقابلے میں لیث قابل ترجیح تھا۔

راستے بھر زبیر اور بنوقہ باتیں کرتے رہے۔ زبیر نے خداوند مقنع کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن اسے خداوند کا قرب ضرور حاصل رہا تھا۔ بنوقہ کو خدا کے بارے میں چند متضاد باتیں معلوم ہوئیں۔ زبیر کی باتوں سے مقنع بیک وقت پیغمبر بھی تھا اور خدا بھی، جس نے انسان میں حلول ہو کر مادی جسم اختیار کیا لیکن اپنے چہرے پر سنہری نقاب ڈال کے اپنے چہرے کی ضیاپاشیوں سے انسانوں کو اس لیے محفوظ رکھا کہ وہ اس کی تاب نہیں لا سکتے۔ زبیر نے بتایا کہ خداوند مقنع کا قول ہے کہ جب موسیٰ اس کے جلوؤں کی تاب نہ لا سکے تو عام انسانوں میں اتنا ظرف اور حوصلہ کہاں کہ وہ اس کے جلووں کی تابش اور چہرۂ منور کی سوزش و چمک کی تاب لا سکیں۔

اور اسی مختصر سے سفر میں اسے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بنوقہ اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ عنقریب کیش چلی جائے گی جہاں خداوند مقنع نے مستقل سکونت اختیار کر رکھی ہے۔ بنوقہ نے سوچا "اے کاش! لیث بھی اس کے دین میں آ کر اس کی ہم سفری اختیار کرے۔"

ساحل پر بہت سے لوگ اِدھر اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔ ان سینکڑوں انسانوں میں لیث کو پہچان لینا بنوقہ کے لیے دشوار بات نہ تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کے لیث کو تلاش کیا۔ وہ ایک مختصر سی پہاڑی چٹان کے سائے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر لیث کا گھوڑا بار بار دم ہلا کے اور پیر کو زور زور سے زمین پر پٹک کے شریر مکھیوں کو اڑا رہا تھا۔ بنوقہ نے زبیر سے درخواست کی۔ "زبیر! میں جس سے ملنے آئی ہوں وہ سامنے پہاڑی چٹان کے سائے میں بیٹھا ہے۔ کیا تم مجھے اس سے بات چیت کا موقع دو گے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

زبیر اسے چھوڑ کے ساحل کے جنوبی حصے میں چلا گیا۔

بنوقہ آہستہ آہستہ چوروں کی طرح قدم اٹھاتی بالکل اس کے عقب میں پہنچ گئی۔ اس

نے دیکھا، لیث کے سامنے ریت پر بہت سارے کیکڑے متحرک پڑے ہیں اور لیث انہیں نہایت انہماک سے دیکھ رہا ہے۔ سمندر کی پرشور موجیں تیزی سے ان کے قریب آتیں اور جھاگ اڑاتی واپس چلی جاتیں۔ بنوقہ اس کے پیچھے دیر تک کھڑی رہی۔ وہ لیث کی ایک بات پر بہت حیران تھی۔ سمندری موجیں جب بھی کیکڑوں کی طرف آتیں لیث کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو جاتی، ایسا لگتا جیسے دم بخود ہو کے اس نے اپنی سانس روک لی ہو، بالکل اس تماشائی کی طرح جو کسی متجسس منظر پر بے چین ہو کے نتیجے کے انتظار میں اپنی سانس روک لیا کرتا ہے لیکن جب یہ موجیں واپس چلی جاتیں تو لیث مایوس ہو کے زور زور سے سانسیں لینے لگتا۔ لیث کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کے پیچھے بنوقہ کھڑی ہے۔

بنوقہ نے اس کی محویت کو ختم کرنے کے لیے آہستہ سے اس کے بائیں شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لیث نے چونک کے پیچھے دیکھا اور بنوقہ کو خلافِ امید کھڑا دیکھ کے حیران رہ گیا۔ بے چینی سے اُٹھ کے کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”بنوقہ! خدا کی قسم! میرا دل یہ کہتا تھا کہ تم میرے پاس ضرور آؤ گی۔“

بنوقہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”اور میرا دل یہ کہتا تھا کہ میرے پاس ایک بار بھی نہیں آؤ گے۔“

لیث نے افسوس سے کہا۔ ”تم لوگوں نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ میں وہاں نہیں آسکتا۔ تم سب نے اپنے آبائی دین کو ترک کر کے کفر و الحاد کو اختیار کیا۔ اس کفر و الحاد کی دیوار کو گرا دینا کم از کم میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

بنوقہ نے جواب دیا۔ ”کیا دو مختلف عقیدوں کے لوگ آپس میں میل جول نہیں رکھتے۔ کیا مسلمانوں اور عیسائیوں میں راہ و رسم نہیں ملتی؟ اس شہر میں آتش پرست بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ کیا ان دونوں میں میل ملاقات نہیں پائی جاتی؟“

لیث لاجواب ہو گیا۔ بنوقہ نے افسوس مگر پرجوش لہجے میں کہا ”میری ماں کہتی ہے کہ تم ایک بزدل انسان ہو اس لیے میں تمہیں اپنے دل سے نکال دوں۔ ماں نے میرے لئے ایک دوسرے نوجوان کا انتخاب کرلیا ہے اور وہ جوان اس وقت بھی میرے ساتھ ہے۔ میری ماں کا حکم تھا کہ میں تم سے ملاقات کے دوران اسے بھی اپنے قریب رکھوں لیکن میں نے ان کا کہنا نہیں مانا اور اس نوجوان کو تمہارے پاس آنے سے منع کر دیا اور ایک تم ہو کہ ساحل سمندر پر بیٹھے موجیں گن رہے ہو اور مجھ سے زیادہ ان کیکڑوں میں دلچسپی لے رہے ہو۔“

یہ کہتے کہتے بنوقہ کا دل بھر آیا۔ اس نے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ابھی دوران سمندر کی تیز موجیں اتنی بڑھ آئیں کہ ان دونوں کے پیروں کو چھو کر واپس چلی گئیں۔ ساحل کے

سارے کیکڑے موجوں کے ساتھ واپس سمندر میں چلے گئے تھے۔ لیث اس منظر سے بہت لطف اندوز ہوا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے فرطِ خوشی میں بنو قہ کے ہاتھ پکڑ لئے' بولا "اب مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ میں بڑی دیر سے بیٹھا اسی شگون کا منتظر تھا!"

بنو قہ نے حیرت سے پوچھا "شگون، کیا مطلب ہے؟"

لیث نے جواب دیا "تمہیں شائد معلوم نہیں کہ ان کیکڑوں میں ایک خاصیت پائی جاتی ہے۔ جب سرکش لہریں انھیں دور ساحل پر پھینک جاتی ہیں تو یہ کیکڑے ساحل پر پڑے پڑے ان پھینک جانے والی موجوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ وہ دوبارہ آئیں اور انھیں ساتھ لیجائیں " پھر وہ ہنسنے لگا' بولا' حالانکہ ان کیکڑوں کو یہ تو معلوم ہی ہونا چاہیئے کہ وہ جس سمندر میں واپس جانا چاہتے ہیں وہ ان سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے۔"

بنو قہ نے ترشی سے کہا "مجھے ان فضول باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں میرے اپنے ہی مسائل اتنے زیادہ ہیں کہ میں ان سے منہ موڑ کے کیکڑوں یا سمندری امواج پر غور نہیں کر سکتی۔"

لیث نے بنو قہ کو سر سے پیر تک دیکھا، بنو قہ نے سر کا رومال کھولکر ہاتھ میں لے لیا اور آزاد لمبی لمبی سیاہ زلفوں نے ہوا میں لہرانا شروع کر دیا۔ لیث کو اس بنو قہ میں غیر معمولی دلکشی محسوس ہوئی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے چٹان کے سایے میں ذرا دور لئے چلا گیا اور وہاں ایک پتھر پر بیٹھ کر بنو قہ کو بھی اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

بنو قہ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا، بولی "اس وقت میں معلوم کرنے آئی ہوں کہ تم نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

لیث نے نرمی سے کہا "یہی میں خود بھی تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے میرے معاملے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

بنو قہ نے کہا "میرا فیصلہ صاف ہے، میں تمہیں نہیں چھوڑنا چاہتی اور ساتھ ہی اپنے والدین کو بھی نہیں چھوڑ سکتی۔"

لیث نے مایوسی سے کہا "اپنے اس فیصلے کی روشنی میں کیا تم یہ پسند کرو گی کہ میں اپنے والدین کو چھوڑ دوں حالانکہ میں خود بھی تمہیں چھوڑنا پسند نہ کروں گا۔"

بنو قہ نے کہا "تب پھر تم اپنے والدین کو اس پر مجبور کیوں نہیں کرتے کہ وہ خداوند تقنیع کے دین میں آجائیں اور خداوند کے منسوخ کئے ہوئے دین کو ترک کر دیں۔"

لیث نے سختی سے جواب دیا "میں ان سے ایسی بات کہنے کی جرأت تک نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ کے بعد جو شخص نبوت یا الوہیت کا دعوے کرے وہ جھوٹا ہے کذاب ہے۔"

بنو قہ نے تلملا کر کہا "میں یہی باتیں ان کے بارے میں نہیں کہہ سکتی جن کا تم احترام کرتے ہو

لیکن تمہیں بھی اپنے ماشاءاللہ کلمات خداوند مقنع کے لئے نہیں ادا کرنا چاہئیں۔"

معلوم نہیں لیث نے اس کی باتیں سنیں بھی یا نہیں کیونکہ وہ اس وقت اپنی ٹھوڑی سینے پر رکھے کچھ سوچ رہا تھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملانے لگی تھیں۔

بنوقہ نے افسردگی سے کہا: "اگر تم نے بزدلی دکھائی تو میں زہبیر سے وابستہ کر دی جاؤں گی۔ اور یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خداوند مقنع کی سرزمین کش چلی جاؤں گی۔"

لیث نے اسے نمناک آنکھوں سے دیکھا اور بے اختیار اس کی زلفیں ہاتھ میں لے کر نتھنوں سے لگالیں انہیں سونگھتا ہوا بولا: "ان سے محروم ہو جانے کا میں اپنے دل میں خیال تک نہیں لا سکتا۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ میں کسی جھوٹے مدعی نبوت و الوہیت پر ایمان لا کے تمہیں اپنالوں!"

بنوقہ نے اس کے ہاتھ سے اپنی زلفیں چھڑالیں، غصے سے بولی: "تمہاری فکر صاف نہیں ہے الجھی ہوئی ہے میری ماں کا قول ہے کہ آدمی کی بہادری یا تو میدان جنگ میں ظاہر ہوتی ہے یا پھر بساطِ محبت میں اور بساطِ محبت میں تم بزدل ثابت ہوئے ہو۔"

ہو سکتا ہے!" لیث نے نرمی سے کہا "ایسی بہادری کس کام کی جس میں ایک انسان اپنا سب کچھ گنوا کے نام نہاد بہادری کا تمغہ حاصل کرے۔"

بنوقہ نے پوچھا "تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تم میری خاطر بھی خداوند مقنع کا دین نہیں اختیار کرو گے؟"

لیث نے آہستہ سے جواب دیا: "میری دعا ہے کہ تم اپنی خواہش بدل دو۔ تم میری آرزو تو ضرور کرو لیکن اس آرزو میں یہ دوسری خواہش نہ شامل کرو تو اچھا ہے!"

اس کے بعد بنوقہ نے کوئی بات نہ کی، سکوت اختیار کیا اور اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔ وہ روتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔ لیث نے کئی بار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن بنوقہ نے ہر بار اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بنوقہ کی ایک ایک ادا اس کے دل میں تیر کی طرح آ تری چلی رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں نے تو کچھ زیادہ ہی غضب کر دیا۔ بنوقہ نے کئی بار اپنی اشک آلود نظریں اوپر اٹھائیں اور بے بسی سے لیث کو دیکھا اس کا یہ حربہ کچھ زیادہ موثر ثابت ہوا۔ بڑی بڑی نیزے جیسی پلکیں اپنی نوکوں پر آنسوؤں کے شبنمی قطرات لئے جب لیث کے سامنے اٹھتیں تو ان کی حدت سے اس کے عقائد اور ایمان میں موم کی طرح پگھلن شروع ہو جاتی۔

آخر اس نے بنوقہ کا ہاتھ پوری قوت سے پکڑلیا۔ بولا "بنوقہ مجھے فوری فیصلے پر مجبور نہ کرو۔ مجھے سوچنے کا موقع دو، مجھے کچھ وقت دو۔" بنوقہ کی جان میں جان آئی، حسرت سے چہرہ اٹھا کے پوچھا "کتنا موقع، کتنا وقت؟"

لیث نے جواب دیا: "بس دو دن کا، پرسوں تک کا!"
بنوقہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں شوخ مسکراہٹ سے پیس کر لیں، بولی "لیکن میں پرسوں جو فیصلہ سنانا چاہتی ہوں اسی کے لئے دو دن دے سکتی ہوں، بس اور کچھ نہیں۔"
بہرحال مجھے سوچنے کا موقع دو۔"
لیث کے نرم اور مفاہمانہ رویہ سے بنوقہ کا دل ٹھہرنے لگا۔ اُس نے گرم جوشی سے لیث کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر کے ہتھیلی کی پشت کو ہونٹوں سے لگا لیا بولی "خداوند مقنع کے نام پر کامیابی کے لئے۔"
بنوقہ کا یہ حیلہ لیث کو پسند نہیں آیا لیکن اس نے اس ناقص العقل لڑکی کا دل بھی نہیں توڑنا چاہا۔
بنوقہ نے آنکھیں کھول دیں اور مسکراتے ہوئے پوچھا "تم کیکڑوں سے تنگوں کس طرح لے رہے تھے؟"
لیث کو بھی ہنسی آگئی، بولا "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اگر سمندری موجیں کیکڑوں کو دوبارہ سمندر میں واپس لے گئیں تو حالات اور واقعات کی امواج تمہیں بھی کبھی نہ کبھی میری گود میں لا ڈالیں گی، چنانچہ عین اس وقت جب تم میرے پاس پہنچیں سمندری موجیں کیکڑوں کو بھی اپنے ساتھ واپس لے گئیں۔"
بنوقہ کھکھلا کے ہنس دی "کاہل کہیں کے، کیکڑا اپنا کوئی اچھی بات تو نہیں، تمہیں تو حالات اور وقت کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش کرنی چاہیئے نہ کہ خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔"
اسی وقت ان دونوں کے قریب زہیر آگیا۔ لیث نے اس مردانہ وجاہت کے حسین پیکر کو رشک و حسد سے دیکھا، بنوقہ گھبرا کر ذرا دور ہٹ گئی اور دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ لیث خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں واقعی یہ حسین پیکر بنوقہ کو خود پر مائل نہ کر لے۔
زہیر نے نہایت فراخ دلی سے کہا "لیث میں نے تمہارا ذکر تو بہت سنا تھا لیکن خوش قسمتی سے آج ملاقات ہو گئی۔"
لیث نے ناگواری سے جواب دیا "لیکن میں نے تمہارا ذکر پہلی بار تھوڑی دیر پہلے بنوقہ سے سنا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر میں سچ بولوں تو تم ناراض نہ ہو گے، میں تم سے مل کے ذرا بھی خوش نہیں ہوا۔"
زہیر کھسیا گیا بولا "یہ کوئی بات نہیں، سچ کی مخالفت کون کر سکتا ہے اور مجھے تمہارے اس سچ بولنے پر بھی خوشی ہوئی۔"
بنوقہ نے وحشت زدہ انداز میں لیث کو شانے سے پکڑ لیا اور ایک طرف لیجاتے ہوئے زہیر سے بولی "زہیر! تم برا نہ ماننا۔ میں ان سے چند باتیں کر کے ابھی آتی ہوں۔ اس کے بعد واپس چلیں گے۔"
زہیر نے اسی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا بولا "کوئی بات نہیں۔"
بنوقہ لیث کو ایک طرف لے جا کے اسے برا بھلا کہنے لگی "کیا تم ذرا بھی عقل نہیں رکھتے؟ کیا میں

نے تمہیں پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ میری ماں کو یہ نوجوان پسند ہے اور پھر یہ کہ زہیر غیر معمولی طور پر سمجھ دار اور پڑھا لکھا ہے۔ اسے خداوند مقنع کے مبلغ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم نے اس سے جیسی جلی کٹی باتیں کیں ہیں ان کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا؟" پھر آبدیدہ ہو کر کہنے لگی "میں معاملے کو جتنا سلجھانے اور بنانے کی کوشش کر رہی ہوں تم رشک و حسد کے زیر اثر اسے اتنا ہی بگاڑتے پر تلے ہوئے ہو۔ لیث! میں تمہیں خداوند مقنع کا واسطہ دوں گی کہ ذرا ضبط و تحمل سے کام لو، ذرا مصلحت اندیش بنو۔"

بنوقہ کے منہ سے زہیر کی تعریفیں سن کر لیث ایک بار پھر رشک و حسد کی آگ میں جلنے بھننے لگا۔ بولا

بنوقہ! تم اس نوجوان کی جتنی تعریفیں کرنا چاہو شوق سے کرو لیکن میں اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں اور اگر میں اس سے نفرت کروں گا تو اس کا برملا اظہار بھی کروں گا۔"

"تب پھر میری قسمت ہی خراب ہے!" بنوقہ نے مایوسی سے کہا "کم از کم میری ماں تو زہیر کی اہانت برداشت نہیں کریگی۔"

لیث اس کی صورت دیکھتا رہا، زہیر ایک بار پھر ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ذرا دور رک کے بولا "لیث میرے دوست! میں نہیں جانتا تم دونوں کون سی راز کی باتیں کر رہے ہو اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کس الجھن اور کس فکر نے تم دونوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود میں تم دونوں کو یہ یقین ہر وقت دلانے کو تیار رہوں کہ میں تم دونوں کے درمیان وجہ کشمکش بننا نہیں چاہتا۔ تم دونوں کو ایک دوسرے کو اپنانے کا بہترین موقع حاصل ہے، ہمت سے کام لے کر اس موقع سے فائدہ اٹھالو لیکن اگر تم اس میں ناکام رہتے ہو تو پھر میں تم سے درخواست کروں گا کہ بنوقہ اور میرے درمیان حائل ہونے کی کوشش نہ کرنا۔"

اس صاف گوئی نے دونوں ہی کو حیران کر دیا۔ بنوقہ نے جواب دیا "زہیر! یہ لیث اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتے اس لئے میری تم سے درخواست ہے کہ ایسی باتوں سے اجتناب کرو۔" پھر لیث کو معنی خیز نظروں سے گھورتی ہوئی بولی "ویسے لیث نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ دو دن بعد وہ ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع کر دیں گے اور یہ فیصلہ وہی ہوگا جس کے ہم سب خواہشمند ہیں۔"

زہیر نے خوشی سے کہا "خداوند مقنع لیث کے ارادوں کو تقویت بخشے۔ یہ ایک اچھی خبر ہے۔"

لیث چپ رہا، کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ ان دونوں کو صاف صاف بتا دے کہ ان کا قیاس غلط ہے وہ سفید جامیاں میں شامل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

جدا ہونے سے پہلے بنوقہ نے لیث سے پوچھا "دو دن بعد آپ اپنے فیصلے سے مجھے کیسے مطلع کریں گے؟"

لیث نے کہا "میں خود تمہارے گھر آجاؤں گا، تم میرا انتظار کرنا۔"

بنوقہ نے بچھڑنے سے پہلے لیث کو بے بسی اور التجا آمیز نظروں سے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "دیکھو لیث مجھے مایوس نہ کرنا۔"

دو دن بعد عشا سے ذرا پہلے لیث لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا، بنوقہ کے گھر پہنچ گیا
اس وقت گھر میں بنوقہ اور اس کی ماں کے علاوہ اس کا باپ اور زہیر بھی موجود تھا۔ بنوقہ کا باپ جعفر بہت خوش تھا کہ اس کی بیٹی خداوند مقنع کے پیروؤں میں ایک کا اضافہ کر رہی ہے۔ اندر بیٹھک میں کھردری اور ادھڑی اور کچی پتھریلی دیواروں پر شمع کی روشنی لرز لرز کے پڑ رہی تھی۔ بنوقہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس امید و بیم کی حالت میں باہری دروازہ کھلا اور لیث اندر داخل ہو گیا۔ وہ نہایت وقار اور اعتماد سے قدم اٹھاتا ہوا بیٹھک میں پہنچ گیا۔ حاضرین نے خوش آمدید کہی۔ لیث کا فیصلہ سننے کے لئے سبھی بے چین تھے جعفر سے نہیں رہا گیا آخر پوچھ ہی لیا "لیث! تم یہاں کس ارادے سے آئے ہو؟"

لیث نے نہایت اعتماد سے جواب دیا "میرے ارادے سے یہاں کا ہر فرد واقف ہے"۔

بنوقہ نے سوال کیا "پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

لیث نے زہیر کو خشمگیں نظروں سے دیکھا "ہمارے خاندانی معاملات میں اس غیر خاندانی شخص کو رازدار کیوں بنا لیا گیا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ اسے یہاں سے اٹھا دیا جائے اور ہم سب آپس میں مل بیٹھ کے کوئی فیصلہ کر لیں؟"

ماں نے دخل اندازی کی بولیں "اسے تم ہمارے خاندان ہی کا ایک فرد سمجھو کیا مذہب و ملت کی بنیاد پر خاندان نہیں بنتے؟"

"بنتے ہیں" لیث نے کہا "لیکن یہ میرا ہم مذہب بھی تو نہیں پھر میں اسے اپنے خاندان کا ایک فرد کس طرح تسلیم کر لوں"۔

ماں نے سختی سے کہا "تمہارا ہم مذہب نہ سہی ہمارا ہم مذہب تو ہے"۔

بنوقہ نے غم و غصے سے لیث کو دیکھا "لیث! تم خواہ مخواہ بات کیوں بڑھا رہے ہو، تم نے جو فیصلہ کیا ہے، ہم سب کے سامنے اس کا اعلان کر دو!"

لیث کو بھی غصہ آ گیا بولا "بنوقہ! مجھے پرسوں ہی یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ تم کچھ کچھ اس حسین اور وجیہہ نوجوان پر مائل ہو چکی ہو"۔

بنوقہ نے بات پوری نہیں ہونے دی، غصے میں کھڑی ہو گئی، چیخ کر بولی "مجھ پر بہتان طرازی نہ کرو لیث۔ تم حاسد شکی انسان اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو"۔

بنوقہ کے باپ نے بیٹی کو بٹھانے کی کوشش کی بولا "بنوقہ، تم بیٹھ جاؤ۔ میں لیث سے خود بات کرتا ہوں"۔

لیکن بنوقہ نہیں بیٹھی۔ زہیر خود بخود کھڑا ہو گیا، بولا "دوستو، اگر میری موجودگی سے معاملے میں رخنہ

پیدا ہوتا ہے تو میں تو رہی باہر چلا جاتا ہوں۔"

ماں نے اسے روکنا چاہا، بولیں "زہیر! تم باہر کیوں جاتے ہو؟ لیث کو جو فیصلہ سنانا ہے وہ تمہارے سامنے بھی سنا سکتا ہے۔"

لیکن زہیر نہیں رکا وہ باہر چلا گیا۔ اس واقعے نے ماحول کو کسی حد تک کر دیا اور لوگوں کے چہروں سے افسوس اور ملال جھلکنے لگا۔

بنوقہ کے باپ نے کہا "ہاں، اب سناؤ اپنا فیصلہ۔"

بنوقہ نے صدمہ اور غصّہ سے اور ماں نے ناگواری سے گردن جھکا لی تھی۔ لیث نے باری باری ہر ایک کی طرف دیکھا، اس کے بعد بنوقہ کے باپ سے پوچھا "کیا آپ نے واقعی یہ ارادہ کر لیا ہے کہ ترکِ سکونت کر کے کش میں جا بسیں۔"

"ہاں، ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے اور اس پر بہت جلد عمل درآمد بھی ہو جائے گا۔"

لیث نے پوچھا "اگر بنوقہ مجھ سے منسوب کر دی گئی تو یہ کہاں رہے گی اور میں کہاں رہوں گا؟"

بنوقہ کے باپ نے جواب دیا "شادی کے بعد ماں باپ کا اپنی بیٹی پر اختیار تو نہیں ہوتا، شوہر جہاں چاہے اپنی بیوی کو رکھے لیکن بنوقہ اور تمہارا معاملہ ذرا اس سے مختلف ہے۔ جب تم خداوند مقنع کے دین میں داخل ہو جاؤ گے تو تمہارے لئے یہ زمین تنگ اور محدود ہو جائے گی۔ اس وقت تمہارے لئے یہ ضروری ہو جائے گا کہ تم خداوند مقنع کے قریب پہنچ جاؤ۔ شادی کے بعد میں تمہیں اپنے ساتھ کش لے جاؤں گا۔"

"اگر میں وہاں نہ جانا چاہوں تو؟"

"تب پھر یہ کہ تم یہیں رہو گے لیکن یہ یاد ضرور رکھنا کہ یہاں کے لوگ اور خلافتِ عباسیہ کی افواج تمہارا عرصۂ حیات تنگ کر دیں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔" لیث نے اعتماد سے کہا۔

بنوقہ نے چڑ کے کہا "تم اپنا فیصلہ تو سناتے نہیں اور فضول کی باتیں بنا و چیرے کئے جا رہے ہو۔"

لیث نے خشک لہجے میں اچانک بنوقہ سے سوال کیا "بنوقہ اگر تم میری جگہ ہوتیں اور یہ فیصلہ تمہیں کرنا پڑتا تو تم کیا فیصلہ کرتیں؟"

بنوقہ نے بدستور بگڑے ہوئے لہجے میں کہا "میں نہیں جانتی کیونکہ میں بنوقہ ہوں لیث نہیں ہوں اور جب تک میں لیث نہ بن جاؤں لیث کے اندازِ فکر اور فیصلے کی بابت کیا کہہ سکتی ہوں؟"

ماں نے مایوس ہو کے کہا "یہ فیصلہ سنائے یا نہ سنائے لیکن میں اس کے فیصلے سے واقف ہو چکی ہوں۔ اب ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ اسے یہاں سے رخصت کریں اور زہیر کو بلا کے اس کی جگہ بٹھا دیں۔"

بنوقہ کو اب بھی یہی امید تھی کہ لیث اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں کرے گا۔ اس نے ماں کو ڈانٹ دیا، بولی "تم میرے معاملے میں معلوم نہیں کیوں جلد بازی اور حسد سے کام لیتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ

لیث میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ لیث مجھے اداس نہیں دیکھ سکتا۔ لیث یہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ میری آنکھیں اشک آلود ہوں۔" پھر اُس نے وفورِ غم میں لیث کو دونوں شانوں سے پکڑ کر ہلا دیا۔ جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔" تم اپنا فیصلہ فوراً ہی کیوں نہیں سنا دیتے، تم چپ کیوں ہو، آخر تم تاخیر سے کام کیوں لے رہے ہو؟"

بنوقہ کا باپ بھی مایوس ہو چکا تھا، آہستہ سے اٹھا اور بنوقہ کو زبردستی الگ کر دیا، بولا:" اس عمر میں دیوانگی کا دورہ پڑتا ہی رہتا ہے۔" پھر لیث سے کہا:" بھتیجے! اب تم مزید تاخیر نہ کرو۔"

لیث نے جواب دیا:" اگر آپ لوگ یہ پسند کریں کہ میں اپنا دین ترک کئے بغیر بنوقہ کو اپنا لوں تو میں حاضر ہوں ورنہ مجبور ہوں۔"

بنوقہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے لیث کو دیکھا اور بے ہوش ہو کے گر گئی۔ ماں فوراً ہی اٹھ کے اندر چلی گئی۔ جاتے جاتے کہہ گئیں:" کیا میں نے لیث کا یہ فیصلہ پہلے نہیں سمجھ لیا تھا۔"

باپ نے بنوقہ کو اٹھا کے تخت پر لٹا دیا اور لیث کو حکم دیا:" اب تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ، میں نے تمہارا فیصلہ سن لیا ہے اور تمہارا یہ فیصلہ ہم میں سے کسی کو بھی منظور نہیں حتیٰ کہ بنوقہ تک کو منظور نہیں۔"

لیث نے اپنا یہ فیصلہ سنا تو دیا تھا لیکن بنوقہ کو کھو دینے پر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ وہ مزید کوئی بات کئے بغیر گھر سے نکلا اور اپنے گھر چلا گیا۔

ماں نے منصوبے کے مطابق لیث کے کنارہ کش ہوتے ہی زبیر کو الجھا دیا۔ زبیر کی دلچسپ باتیں اور علمی شخصیت بنوقہ کو متاثر کرنے لگیں۔ اس کا غم غلط ہونے لگا، وہ دونوں خوب قہقہے لگا کے ہنستے۔

زبیر دن بھر تو ادھر ادھر تبلیغ میں لگا رہتا اور شام ہوتے ہی وہ بنوقہ کو لے کر ساحل پر پہنچ جاتا وہاں لیث بھی موجود ہوتا۔ لیث کے لئے یہ صورت حال بڑی کربناک ہوتی کہ اس کی بنوقہ زبیر سے محبت کر رہی تھی۔ خود بنوقہ بھی ابتدائی چند دن گھبرائی گھبرائی رہی اور بحیرہ خزر کے کنارے جانے پر آمادہ نہ ہوئی لیکن زبیر کے دباؤ اور اصرار نے اس سے یہ کام بھی کرا لیا۔ زبیر جس نے پہلے لیث کے سامنے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا اب بے حس ہو گیا تھا اور اس کے انداز یہ بتاتے تھے کہ لیث کو ستانے اور ذہنی دکھ پہنچانے میں اُسے ایک خاص ذہنی لذت ملتی ہے۔ دوسری طرف لیث بری طرح رقابت کی آگ میں سُلگ رہا تھا۔ اسے ان نئے دین والوں پر سخت غصہ آتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ انھیں نیست و نابود کر کے رکھ دیتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ پوری آبادی اس نئے دین میں داخل ہوتی جا رہی تھی اور مسلمان آقلیت میں ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے کسی سے یہ افواہ بھی سنی تھی کہ بغداد کی خلافتِ عباسیہ نے خراسان اور اس کے قرب و جوار کے حکام کو حکم بھیج دیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مقنع کے شر اور فساد سے مسلمانوں کو نجات دلائی جائے۔ اب لیث نہایت صبر و تحمل سے اس لشکر کا منتظر تھا جو مقنع کے مرکزوں کو تباہ کر کے مسلمانوں کو اس عذاب سے نجات دلائے گا۔

دھوپ میں بلا کی تیزی تھی، لیث ظہر کی نماز پڑھ کے جیسے ہی مسجد سے نکلا سامنے سے زبیر اور بنوقہ کو آتے دیکھا۔ زبیر اسے مسجد سے نکلتا دیکھ کے مسکرایا۔ یہ بات لیث کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور زبیر کا گریبان پکڑ لیا، بولا "تم ہنس کیوں رہے تھے؟"

زبیر نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی، بولا "میرا گریبان تو چھوڑ دو۔ میں تمہاری بات کا جواب دوں گا۔"

لیث نے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو بنوقہ ان کے درمیان آگئی۔ لیث کو ڈانٹتے ہوئے بولی "تم زبیر کو نہیں مار سکتے اگر مارو گے تو میں تمہیں ماروں گی۔"

لیث کے ہاتھ خود بخود جھک گئے۔ اس نے شاکی نظروں سے بنوقہ کو دیکھا اور زبیر سے ہٹ کے ذرا دور کھڑا ہو گیا۔

زبیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا ہم دونوں اب جا سکتے ہیں؟"

لیث نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ ایک طرف جانے لگا۔ زبیر نے اسے روک لیا اور کہا۔ "تم اپنے سوال کا جواب لئے بغیر جا رہے ہو خوب، بہر حال میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ تمہیں دیکھ کے مسکرایا کیوں تھا؟"

لیث رک کے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

زبیر نے کہا "خداوند مقنع نے نزول فرما کے انسانوں کو عبادت اور دوسرے مذہبی ارکان سے نجات دلادی ہے۔ میں تم لوگوں کی سیدھا سادہ لوحی پر حیران ہوں کہ اب بھی پرانی لکیر پیٹے جا رہے ہو۔"

لیث نے بنوقہ سے شکایت کی "بنوقہ! تم زبیر کو اشتعال انگیز باتوں سے روکو ورنہ یہاں ایک ایسا فساد برپا ہوگا کہ لوگوں کو ڈھونڈے سے نجات نہ ملے گی۔"

زبیر نے جواب دیا "تمہارا خیال صحیح ہے لیث، لیکن یہاں جنہیں جائے پناہ نہ ملے گی وہ ہم نہیں تم لوگ ہو گے۔ خداوند مقنع ہمارے ساتھ ہے اور وہ تمہیں نیست و نابود کر دے گا۔"

بنوقہ نے خوشامد سے کہا "زبیر! میری خاطر بات نہ بڑھاؤ۔"

زبیر نے بنوقہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، محبت سے کہا "بنوقہ! اگر تم کہتی ہو کہ میں بات نہ بڑھاؤں تو میں مجبور ہوں ورنہ اب ہم لوگ اتنے طاقتور ہو چکے ہیں کہ ٹکے کا جواب پتھر سے دیں۔"

لیث خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ زبیر بنوقہ کو لے کے اوجھل ہو گیا۔

اس دن لیث کی حالت بہت بگڑ گئی وہ خود پر نفرین کرنے لگا کہ اتنی اچھی لڑکی سے اس نے اتنی جلدی دستبرداری کیوں اختیار کی۔ اس دن بنوقہ کی محبت اس کے دل میں قیامت خیز طوفان کی طرح اٹھی اور ساری رات اس کے وجود کو ہلکان و پریشان کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ کچھ بھی ہو، کسی بھی طرح بنوقہ کو زبیر سے ضرور حاصل کرنا ہے۔ دل کے کسی گوشے میں شیطان بھی دبکا بیٹھا آہستہ آہستہ اسے ورغلا رہا تھا کہ خداوند مقنع کا پیرو بن کے بنوقہ کو حاصل کرے لیکن وہ اس شیطان پر لاحول پڑھ لیتا۔

کئی دن بعد معلوم نہیں کس طرح چھپتی چھپاتی بنوقہ ساحل پر تنہا پہنچ گئی۔ وہ اس وقت بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر لیث کو تلاش کرتی رہی لیکن وہ نہیں ملا۔ وہ شکستہ دل سے بھاری بھاری قدم اٹھاتی واپس آرہی تھی کہ راستے میں لیث مل گیا۔ وہ بنوقہ کو سرسری نظر سے دیکھ کے آگے بڑھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ آس پاس کہیں نہ کہیں زہیر ضرور موجود ہوگا۔ لیث کی بے نیازی اور بے رخی سے بنوقہ کے دل پر آرے سے چل رہے تھے۔ وہ لیث کی طرف بڑھتی ہوئی بولی "میں تمہارے پاس آئی ہوں لیث!"

لیث نے لاپروائی سے پوچھا "زہیر! کہاں ہے؟"

بنوقہ نے جواب دیا "وہ گھر پر ہے۔"

لیث نے سرد مہری سے سوال کیا "کیا تم دونوں ابھی تک ایک دوسرے سے منسوب نہیں ہوئے ہو؟"

بنوقہ نے جواب دیا "ابھی نہیں۔" پھر وہ ذرا اکڑ کے بولی "کیوں، تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

لیث نے کہا "بے کار وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟"

بنوقہ نے بھرائی آواز اور پرجوش لہجے میں کہا "اگر تم یہ چاہتے ہو تو یہ بھی ہو جائے گا لیکن اس وقت میں چوروں کی طرح چھپ کے تم سے مشورہ لینے نہیں آئی۔"

لیث نے طنز سے کہا "بنوقہ! تمہیں کسی ایک کا ہی ہو کر رہ جانا چاہیئے۔ اس طرح خواہ مخواہ بھٹکنے سے کچھ بھی نہ ملے گا۔"

"بہت بہتر!" بنوقہ روہانسی ہو گئی "تم لوگوں کو طنز و استہزا کے نشتر چبھونے کے سوا آتا ہی کیا ہے اس وقت میں تم سے کچھ ایسی باتیں کرنے آئی ہوں جن کا تعلق ہم دونوں کی ذات سے تھا لیکن اگر تم مجھ سے اتنے ہی بھر چکے ہو تو میں پھر تم سے کوئی بات نہ کروں گی۔"

لالچ اور محبت نے ایک بار پھر زور کیا اور لیث نرم گیا "مجھ سے باتیں کرو گی۔ کس قسم کی، کیسی باتیں؟"

بنوقہ واپس جانے لگی، بولی "لیث! اگر تمہارا دل میرے لیے صحرا بن چکا ہے تو میں اس میں بلاوجہ اپنی محبت کا بیج بونے کی کوشش کیوں کروں؟"

لیث نے نرمی سے کہا "بنوقہ! میں ایک غمزدہ انسان ہوں، ایسا لگتا ہے کہ میں نے تمہیں کھو کے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ کیا تم نے اس سے پہلے بھی کبھی مجھے اتنا بیزار دیکھا تھا؟"

بنوقہ نے کرتے کے دامن سے آنسو خشک کیے، بولی "یہاں سے مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں میں تمہارے ساتھ بیٹھ کے دو گھڑی چند باتیں کر سکوں۔"

لیث اسے ساتھ لے کے بحیرہ خزر کے شمال میں چلا گیا۔ جہاں لوگ بہت کم جاتے تھے۔ اور یہ جگہ بہت ساری اونچی نیچی پہاڑیوں میں ڈھکی ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑوں کو تو ایک بڑی پہاڑی کے نیچے بھاری پتھروں سے باندھ دیا اور خود بنوقہ کے ساتھ ایک کھوہ میں چلا گیا۔

یہاں بنوقہ نے لیث کے زانو پر سر رکھ دیا اور بلک بلک کے رونے لگی۔ لیث حیران تھا کہ بنوقہ اب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیث نے اس کی پیشانی چوم لی اور کہنے لگا " بنوقہ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا تم زہیر سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

" نہیں، میں اس سے محبت نہیں کرتی ہوں" بنوقہ نے کہا " وہ ایک علمی اور دلچسپ نوجوان ہے اس کی باتیں بڑی اچھی لگتی ہیں لیکن جہاں تک محبت کا سوال ہے میں اسے پسند نہیں کرتی۔"

لیث نے زانو سے اٹھا کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور پوچھا " کیا تم مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہو؟"

بنوقہ نے محبت کی چمک دمک سے بھرپور آنکھیں لیث کی آنکھوں میں ڈال دیں اور مسکرا کے دونوں آنکھیں بند کر لیں یہ لیث کی بات کا بہترین جواب تھا۔ دونوں کچھ دیر اسی طرح سرشار و بیخود وہاں بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آخر میں بنوقہ نے اس سے درخواست کی " لیث! تم مجھے اپنا لو"

لیث نے جواب دیا " میں تمہیں اپنانے کو ہر وقت تیار ہوں لیکن تم جس روز اپنے والدین اور مقنع کے دین کو چھوڑ کے میرے پاس چلی آؤ"

بنوقہ نے سرد مہری سے کہا " تم خداوند مقنع کی نبوت و الوہیت کے قائل کیوں نہیں ہو جاتے میں بہت جلد اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ خداوند کی بارگاہ کیش چلی جاؤں گی۔ اگر اس سفر میں تم بھی ہمارا ساتھ دو تو میں راستے میں نخشب نامی جگہ پر خداوند مقنع کی الوہیت کا ایک شاندار مشاہدہ کرا سکتی ہوں۔"

لیث نے حیرت سے پوچھا " وہ کس طرح؟"

بنوقہ نے کہا " خداوند مقنع نے اپنی مخلوق کو الوہیت کا کمال دکھانے کی خاطر نخشب کی فضا میں ایک نیا چاند طلوع کر دیا ہے۔ اگر تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو مجھے یقین ہے کہ تم اس پر ایمان لائے بغیر نہیں رہو گے۔"

لیث نے بے دلی سے کہا " شاید"

بنوقہ اس سے علیحدہ ہو گئی، بولی " کیا تم میرے ساتھ سفر میں شریک رہو گے؟"

" نہیں" لیث نے کہا " ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

لیث کی نظریں اچانک بنوقہ کی دونوں پنڈلیوں پر پڑ گئیں وہاں کالے کالے گھنیرے بال صاف نظر آ رہے تھے۔ لیث کو یہ بال اچھے نہیں لگے لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ بنوقہ واپسی کیلئے تیار ہو چکی تھی بولی " میں پریشان ہوں کہ یہاں میں نے کافی وقت خرچ کر دیا ہے اب گھر جا کے کیا کہوں گی؟"

لیث کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے وہ خاموش رہا۔

دونوں راستے میں ایک جگہ سے جدا ہونے لگے تو بنوقہ نے خوش اخلاقی سے کہا " اب تم ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دو گے۔"

لیث نے جواب دیا "کوشش کروں گا"۔
"پھر وہی اکھڑی اکھڑی باتیں"! بنوقہ گرم ہو گئی "شادی کے بغیر بھی میرا تم پر کچھ حق ہے اور میں اس حق کے ذریعے بالآخر اس پر مجبور کر دوں گی کہ میرے ساتھ خداوند مقنع کی بارگاہ میں چلے چلو"۔
لیث نے نرمی سے کہا "میں تمہارے ساتھ ایک شرط پر چل سکتا ہوں وہ یہ کہ تم لوگ مجھے کبھی اس پر مجبور نہ کرو گے کہ میں اپنا مذہب چھوڑ دوں۔ تم اپنے مذہب پر قائم رہو اور میں اپنے مذہب پر قائم رہوں اس عہد و معاہدے کے بعد اپنا دین چھوڑے بغیر بھی ہم دونوں شیر و شکر ہو سکتے ہیں"۔
بنوقہ نے آہستہ سے جواب دیا "لیث! میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں لیکن اب یہ معاملہ میرے اختیار کا نہیں"۔
"پھر کس کے اختیار میں ہے یہ مسئلہ؟"
بنوقہ نے جواب دیا "والدین کے، میرے سارے فیصلے وہی دونوں کر سکتے ہیں۔ میں اپنے والدین کو اس پر ضرور آمادہ کر سکتی ہوں کہ وہ ایک خاص مدت تک تمہیں خداوند مقنع کا دین اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں۔ اس عرصہ میں، تم میرے ساتھ رہو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم اس وقت جو فیصلہ کرو گے وہ میرے حق میں ہو گا"۔
لیث کا دل ڈانواڈول ہونے لگا، بولا "بنوقہ! تم میرا انتظار کرنا میں آؤں گا ضرور لیکن تم اس بات کا خیال رکھنا کہ میں زہیر کو برداشت نہیں کر سکتا"۔
بنوقہ سوچ میں پڑ گئی بولی "یہ بڑی مشکل بات ہے، ابھی تک تم مجھ پر کوئی باقاعدہ حق قائم نہیں کر سکے ہو اور جب تک میں تمہاری واقف نہ ہو جاؤں زہیر کو میری ہمکلامی یا ہم نشینی سے کس طرح باز رکھا جا سکتا ہے"!
اسی لمحے جنوب مشرق سے گرد اڑتی دکھائی دی اور کہیں دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بھی آنے لگیں، بنوقہ نے گھبرا کے کہا "میرا خیال ہے میرے گھر والے میری تلاش میں ادھر آ رہے ہیں"۔
لیث نے مشرق کے چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر تم مناسب سمجھو تو تھوڑی دیر کے لئے کہیں ان کے پیچھے روپوش ہو جاؤ اور میں یہاں سے آہستہ آہستہ چل کے ان آنے والوں کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کروں گا"!
بنوقہ پھرتی سے ایک پہاڑی کھو کے پیچھے روپوش ہو گئی اور کچھ دیر بعد آنے والے لوگ بھی لیث کے سر پر پہنچ گئے۔ زہیر ان میں سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے بنوقہ کا باپ جعفر تھا۔ جعفر کے پیچھے جو شخص تھا اسے لیث پہچانتا نہ تھا۔ زہیر لیث کے قریب پہنچ کے گھوڑے سے پھاند پڑا اور ایک دشمن کی طرح گھورتا ہوا اس کے قریب کھڑا ہو گیا، اور سخت لہجے میں پوچھا "وہ کہاں ہے؟"
لیث نے حقارت سے جواب دیا "وہ کون۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

زہیر نے غصے سے کہا "زیادہ بننے کی کوشش مت کرو اور سیدھی طرح اس کا پتہ بتا دو۔"
بنوقہ کا باپ بھی گھوڑے سے نیچے آ گیا، کسی اجنبی کی طرح لیث کو مخاطب کیا "اجنبی نوجوان! تم سے جو پوچھا جا رہا ہے اس کا صحیح جواب دو اور فضول باتوں میں مت الجھاؤ۔"
لیث کو اپنے چچا کے اس اندازِ تخاطب پر بڑا افسوس ہوا مگر پھر سنبھل گیا اور اپنے چچا ہی کی طرح بیگانہ روش اختیار کی۔ بولا "او اجنبی بوڑھے، میں نہیں جانتا کہ تو کس کی بات کر رہا ہے۔"
اتنے میں اس کا تیسرا ساتھی چلایا "تم لوگ فضول کے سوال و جواب میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ ادھر آؤ میرے پاس، میں تمہیں دوسرے گھوڑے کے ٹاپوں کے نشانات بھی دکھاتا ہوں۔ ادھر آؤ، دیکھ رہے ہو یہ نشانات۔ اب ان پر چل کر تم خود ہی بنوقہ تک پہنچ سکتے ہو۔"
زہیر اور جعفر دونوں اس تیسرے شخص کے پاس پہنچ گئے اور جھک کے ان نشانات کو دیکھنے لگے۔ لیث کو یقین ہو گیا تھا کہ اب بنوقہ کی موجودگی چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس نے سوچا بنوقہ سے سوال و جواب کا سلسلہ چلے گا اور پتہ نہیں کہ اس کی اپنی موجودگی بنوقہ کے حق میں کتنی مضر ثابت ہو۔ اس نے چپ چاپ اپنے گھوڑے کا رخ موڑ دیا اور ان آڑے ترچھے راستوں پر اپنا گھوڑا بھگانے لگا جن سے گزر کے وہ کافی دیر پہلے یہاں پہنچا تھا۔
لیث کو جاتے دیکھ کر زہیر مڑا اور پھر دوسرے ہی لمحے خود بھی گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ بنوقہ کے باپ سے کہا "تم ان نشانات کی مدد سے بنوقہ تک پہنچنے کی کوشش کرو، میں اس ذلیل نوجوان کا پیچھا کرتا ہوں، یہ یوں نہیں بچ سکتا۔"
اس کے بعد اس نے ایڑ لگا دی اور زہیر کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

لیث کو اچانک محسوس ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ شاید بنوقہ داؤ پیچ کر کے بچ بچا کے اس کے پیچھے آ رہی ہے۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور رک کے پیچھے دیکھنے لگا۔ زہیر پہلے تو ایک دھوئیں کے ہیولے کی شکل میں دکھائی دیا۔ کیونکہ اٹھتے ہوئے گرد و غبار میں وہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ گرد و غبار آہستہ آہستہ کم ہوتا رہا اور جیسے جیسے زہیر اس سے قریب ہونے لگا، گرد و غبار کی دھندلاہٹ بھی کم ہوتی گئی یہاں تک کہ جب وہ بالکل لیث کے سر پر پہنچ گیا تو ایک دم لگام کھینچ کے گھوڑے کو روک لیا۔ گھوڑا الف ہو گیا، زہیر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور گھوڑے کے نیچے گر گیا۔ لیث نے گھوڑے سے کود کے زہیر کو اٹھنے میں سہارا دیا لیکن زخمی زہیر نے تحقیر آمیز انداز میں لیث کو جھڑک دیا "تم مجھ سے دور رہو ذلیل نوجوان، میں تمہارا احسان نہیں لینا چاہتا۔"
لیث خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا، بولا "بے دین انسان! میں تمہیں سہارا دے کے تم پر احسان نہیں کرتا بلکہ یہ ایک انسانی فریضہ تھا جو میں انجام دے رہا تھا۔"

"کچھ بھی ہو" زبیر نے اُسی سے حقارت سے کہا "میں تم سے ہر طرح دُور رہنا چاہتا ہوں"
یہ کہتے کہتے زبیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا "ابھی میں مرا نہیں ہوں پھر کسی کا احسان کیوں مول لوں"
لیث نے کوئی جواب نہ دیا اور گھوڑے پر بیٹھ کے وہاں سے چلے جانا چاہا لیکن زبیر نے گرج کے کہا "تم ابھی یہاں سے نہیں جا سکتے!"
"وہ کیوں؟" لیث نے بے مروّتی سے پوچھا۔
"وہ یوں کہ ہمیں جب تک بتوقہ نہیں مل جاتی ہم تمہیں یہاں سے دو قدم بھی نہ جانے دیں گے"
یہ انا اور ضد کی بات تھی۔ لیث نے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور غصے میں کہا "کون ہے جو مجھے روکنے کی کوشش کرے گا۔ میں جا رہا ہوں اور جس میں بھی مجھے روکنے کی ہمت ہو میرے مقابل آئے"
زبیر تلوار لے کے لیث پر جھپٹا۔ لیث بھی دبنے والا نہیں تھا۔ اس نے بھی تلوار نکال لی اور دونوں کا مقابلہ ہونے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے حملے سے بچنے چھپنے لگے۔ معلوم نہیں کس طرح کافی دیر بعد لیث کی تلوار زبیر کے بازو میں اتر گئی۔ وہ چیخ مار کے ڈھیر ہو گیا۔ لیث اس کے قریب جانے لگا۔ زبیر نے کراہتے ہوئے چیخ کر کہا "تم یہاں مت آؤ بلکہ میں خود چل کے تمہارے پاس چلا آؤں گا۔ تم واپس جاؤ"
لیث نے اسے شرمندہ کرنے کی غرض سے کہا "میں چاہوں تو تمہیں قتل کر دوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا حالانکہ تم میری جگہ ہوتے تو مجھے ہرگز معاف نہ کرتے"
زبیر بمشکل اٹھ کے کھڑا ہو گیا "میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں او کم ظرف نوجوان"
لیث نے پھر چھیڑا "اس وقت گر کے چوٹ کھا جانے کی وجہ سے تمہارا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم پہلے اپنا دماغی توازن درست کر لو۔ اس کے بعد مجھ سے مقابلہ کرو، میں پاگلوں سے لڑنا اپنی بے عزتی سمجھتا ہوں"
زبیر بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور لیث پر حملہ کر دیا۔ لیث نے اسے اپنی تلوار پر روک لیا اور پھر جوابی حملہ کیا۔ اور زبیر کو زخمی کر دیا۔ زبیر نے بے چینی سے کہا "تم مجھے قتل کر دو میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا۔ میں رعایت نہیں چاہتا۔ تم مروّت سے کام مت لو"
لیث نے واپسی کے ارادے سے گھوڑے کا رخ موڑا اور کہنے لگا "میں جا رہا ہوں اور اب مجھے کوئی بھی نہیں روک سکے گا"
زبیر پھر چیخا "افسوس کہ میں تمہارا پیچھا نہیں کر سکتا لیکن اسے تم قرض سمجھو جسے میں بہت جلد اتار دوں گا"
لیث چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جعفر اور اس کے ساتھی کو بتوقہ مل گئی۔ باپ بیٹی سے سرراہ سوال و جواب کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے بتوقہ کو دیکھا اور کہا "تیری یہ حرکت مجھے پسند نہیں آئی لیکن خداوند مقنع کے ایک پرجوش مبلغ نے تجھے پسند کر لیا ہے اس لئے میں تجھے کوئی سزا بھی نہیں دے سکتا"

بنوقہ کو جب وہاں لیث نظر نہیں آیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا، اس نے گردوپیش نظریں ڈالیں اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ کہیں لیث کو مار تو نہیں دیا گیا لیکن وہاں لیث کا نام و نشان تک نہ نظر آیا۔ باپ نے اس تجسس کو محسوس کر لیا بولا: "تم کسے تلاش کر رہی ہو؟ لیث کو؟ لیث بھاگ گیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ زبیر اسے زندہ و سلامت واپس نہیں جانے دے گا۔ وہ اس کے تعاقب میں گیا ہے اور اس کے ہاتھوں لیث کی موت یقینی ہے۔"

بنوقہ بولی تو کچھ نہیں البتہ دل ہی دل میں لیث کی سلامتی کی دعا ضرور مانگنے لگی۔

تینوں کو واپسی میں زبیر ایک جگہ زخمی پڑا دکھائی دیا۔ جعفر اور اس کے ساتھی نے گھوڑے سے کود کے اس کی خیریت پوچھی۔ زبیر نے ساری روداد سنا دی اور آخر میں کہا: "اگر میں زخمی نہ ہو گیا ہوتا تو وہ بچ کے نہیں جا سکتا تھا!" پھر بنوقہ کو حیرت کی نظروں سے دیکھ کے جعفر سے سوال کیا: "یہ کہاں ملیں؟"

جعفر نے نفرت سے کہا: "میں تمہاری وجہ سے مجبور ہو گیا ہوں ورنہ اس سرکش اور مغرور لڑکی کو اس نامعقول حرکت پر وہ سزا دیتا کہ یہ زندگی بھر یاد کرتی۔"

زبیر نے کہا: "مجھے میرے گھوڑے پر سوار کرا دو، میں زیادہ زخمی نہیں ہوں۔"

جعفر نے اپنے ساتھی کی مدد سے زبیر کو گھوڑے پر بٹھا دیا اور زخمی حصوں کو پگڑی کے چند ٹکڑے پھاڑ کے کس کے باندھ دیا۔ زبیر گھوڑے کی پشت پر ہی مشرق کی طرف منہ کر کے سجدے میں گر گیا، بولا: "خداوند امقنع! کیا تو اپنے مخلص بندوں کو بے دین مسلمانوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھاتے نہیں دیکھ رہا، مجھ ناتواں کو اتنی طاقت عطا فرما کہ میں انھیں عبرتناک سبق دے سکوں۔"

زبیر کی دیکھا دیکھی اس کے دونوں ساتھی بھی سجدے میں گر گئے اور آمین آمین کہنے لگے۔ بنوقہ بدستور گھوڑے پر تنی بیٹھی رہی۔ زبیر اپنے گھوڑے کو ذرا موڑ کے بنوقہ کے قریب پہنچ گیا اور نرمی کے لہجے میں کہا: "بنوقہ! میں نے کبھی تمہیں کسی بات پہ مجبور تو نہیں کیا؟"

بنوقہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

زبیر نے مزید کہا: "تم نے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔"

بنوقہ کے باپ نے غصے میں کہا: "تم چپ رہو، میں تمہارا احترام کرتا ہوں، اگر تم بنوقہ سے خوش نہیں ہو تو یہ میرا فیصلہ ہے کہ میں اس کے اس تکلیف دہ رویے کی سزا ضرور دوں گا۔"

زبیر نے ہنس کے کہا: "نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ بنوقہ کو یہی سب کچھ کرنا چاہیے تھا۔ بنوقہ انسان ہے، نوجوان ہے، اس کے سینے میں احساس اور محبت سے لبریز دل موجود ہے۔ یہ لیث سے محبت کرتی رہی ہے اس لیے لیث کی محبت کو بنوقہ کے دل سے کھرچ دینا ناممکن ہے۔" پھر بنوقہ سے پوچھا: "لیث تم سے کیا کہہ رہا تھا؟"

بنوقہ کی آنکھیں بھر آئیں، بولی: "میں میٹھی میٹھی باتیں کر کے اسے خداوند مقنع کے دین میں لے آنا

بچا ہتی تھی۔"

زبیر نے خوش ہو کے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے پھر لیث نے کیا کہا؟"

بنوقہ نے جواب دیا "بس وہ کچھ کچھ راضی ہوا تھا کہ آپ لوگ آ گئے اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے بھی آپ لوگ واقف ہیں۔"

زبیر نے کہا "خیر جو کچھ ہوا ہم اسے بھلا دیں گے۔" پھر بنوقہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا "بنوقہ! میرے دل میں تمہارے لئے جو عزت ہے وہ کسی طرح کم نہ ہو گی۔ تم بھی مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی لغزش نہیں ہو گی۔"

بنوقہ نے کھرے انداز میں کہا "میں یہ وعدہ نہیں کر سکتی ہاں کوشش ضرور کروں گی۔"

زبیر اس جواب سے خوش نہیں ہوا پھر بھی اپنے احساسات کو چھپا گیا۔

زبیر کا نہایت توجہ سے علاج کیا گیا۔ جب وہ ٹھیک ہو گیا تو اس نے بنوقہ سے کہا "بنوقہ! اگر تم پر کسی کا قرض واجب الادا ہو تو تمہارا فرض کیا ہو گا؟"

بنوقہ نے معصومیت سے جواب دیا "قرض کی ادائی۔"

زبیر کے چہرے پر تازگی آ گئی، بولا "لیث نے زخمی کر دینے کی صورت میں مجھے جو قرض دیا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس کو بے باق کر دوں۔"

بنوقہ خاموش رہی، زبیر نے پھر سوال کیا "تمہارا کیا خیال ہے، اسے سزا دوں یا معاف کر دوں؟"

بنوقہ نے پژمردگی سے کہا "جو چاہو کرو، میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

زبیر نے نہایت محبت سے اس کی پیشانی چوم لی، سرشار لہجے میں بولا "تم واحد ایک ایسی ذات ہو جو ہمیشہ کو میرے انتقام سے بچا سکتی ہے ورنہ میں اپنے انتقام کی آگ میں لیث کے پورے خاندان کو جلا سکتا ہوں۔"

بنوقہ چپ ہو رہی لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتی تھی کہ لیث پر حملہ ہو گا کس طرح اور کس طرف سے؟

زبیر نے ایک کاغذ مٹھی میں داب رکھا تھا، اسے بنوقہ کی طرف بڑھا دیا، بولا "اسے تم خود پڑھ لو اور ذرا سی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے اپنے تصور کی آنکھ سے لیث کے انجام پر غور کرو۔"

بنوقہ نے خط پڑھنا شروع کر دیا، اس میں لکھا تھا۔

"خدائے رحیم و کریم مقنع کے نام سے۔ میں ہاشم بن حکیم، تمام خداؤں کا خدا، اپنے عاجز بندے زبیر کو حکم دے رہا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمانوں پر ایک کاری ضرب لگائی جائے، تم خدائے واحد مقنع کی حمد کرو، وہ خدائے واحد جو مختلف شکلوں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا ہے، کچھ عرصہ پہلے ابو مسلم

کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اب وہ مقنع میں حلول کر چکا ہے۔ تم لوگوں کو، گمراہ انسانوں کو میرے در پر سجدے میں جھکا دو، انھیں بتا دو کہ مقنع خدا ہے، واحد ہے۔ میں ہر جگہ موجود ہوں، میں ہر جگہ حاضر و ناظر ہوں، میری ہی شان ہے، میرے سوا کوئی خدا نہیں، زہیر کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب وقت آ چکا ہے کہ گمراہوں کو سفید جامیاں میں شامل کر لیا جائے۔ تیری مدد کے لئے کچھ اور لوگ بھی آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کو تباہ و برباد ان کی عبادت گاہوں اور مسجدوں کو مسمار و ویران کر دو، یہی میری رضا ہے، اسی میں میری خوشنودی ہے۔"

خط پڑھ چکنے کے بعد بنوقہ نے وہ خط زہیر کی طرف بڑھا دیا اور اندر کا دکھ چھپا کے پوچھا

"پھر اب کیا اقدام ہوگا تم لوگوں کا؟"

زہیر نے پوچھا "پہلے یہ بتاؤ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟"

بنوقہ نے جھوٹ بول دیا "بہت اچھے، بہت وجیہہ، بہت دلچسپ!"

اس جھوٹی تعریف نے زہیر کو گویا نہال کر دیا، بولا "میں پرسوں صبح اس مسجد پر حملہ کر دوں گا جہاں جمشید اور اس کا باپ نماز پڑھتے ہیں، بس وہیں حملہ کر کے انہیں ہلاک اور مسجد کو مسمار کر دیا جائے گا۔"

بنوقہ چپ رہی لیکن وہ یہ خبر کسی نہ کسی طرح لیث کے کانوں تک ضرور پہنچا دینا چاہتی تھی۔

اس کے بعد بنوقہ کو گھر سے نکلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اسکی زبردست نگرانی کی جا رہی تھی دوسرے دن شام کو یہ گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی۔ خاندان اور مقنع کے دوسرے پیرو وہاں سے چلے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ضروری سامان باندھا جا چکا تھا۔ باربرداری کے جانور تیار کھڑے تھے، عورتیں، بچے اور بوڑھے اس طرح آمادہ سفر کھڑے تھے گویا بگل بجے گا اور یہ سفر کے لئے حرکت میں آ جائیں گے، ماں ضرورت سے زیادہ مشغول تھیں اور باپ کسی پراسرار مہم میں الجھا ہوا تھا، غالباً زہیر بھی باپ کے ساتھ ہی تھا۔ بنوقہ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت کو ضائع نہیں جانے دیگی اور دوسرے دن علی الصباح پیش آنے والے خطرات سے لیث کو آگاہ کر دے گی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے اس کام میں مزاحمت کا پورا پورا امکان ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ موقع پر ہی پکڑ لی جائے۔ بڑے غور و فکر کے بعد اس نے بڑے بیر سے فیصلہ یہ کیا کہ اگر وہ کسی طرح لیث تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو وہ خود کو لیث اور اس کے باپ کی پناہ میں دے دی گی۔ وہ گھر سے نکلتے ہی تیزی سے لیث کی طرف روانہ ہو گئی۔ رات کی تاریکی نے اسے چھپا رکھا تھا۔ پھر بھی کسی کسی لمحے وہ ذرا سی آہٹ پر ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ اسے کئی بار ایسے لگا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے لیکن اندھیرے میں ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے میں بھی جب کوئی اسے ایسا نظر نہ آیا۔ تو وہ اسے اپنا واہمہ قرار دے کر مطمئن ہو گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ اس مسجد کے پاس پہنچی، جہاں سے لیث کے گھر کا فاصلہ مشکل سو ڈیڑھ سو قدم رہا ہو گا تو اس نے مسجد کے سامنے ایک ہنگامہ برپا دیکھا۔ مسجد کی دیواروں پر مشعلیں جل رہی تھیں اور ان کی روشنی میں لوگ آپس میں سایوں کی طرح برسر پیکار تھے

وہ ٹھٹک کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ہتھیاروں کی مہیب آوازوں میں زخمیوں کی چیخ و پکار نے ماحول کو بھیانک بنا دیا تھا۔ بنوقہ کے لئے یہ گھڑی بھی خطرناک تھی کیونکہ اب اس کا پیچھے جانا بھی خطرناک تھا۔ اور آگے لیث کے گھر تک پہنچنا بھی دشوار۔ وہ ابھی اسی گومگو میں تھی کہ ایک شخص تیزی سے بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا اور اس نے بنوقہ پر حملہ کرنا چاہا لیکن بنوقہ نے چیخ کے کہا "میں عورت ہوں، ایک لڑکی! کسی عورت یا لڑکی پر ہاتھ اٹھا دینا بہادری اور جوانمردی کے منافی ہے۔"

حملہ آور کا اٹھا ہوا ہاتھ پیچھے آگیا، وہ بنوقہ کے قریب چلا گیا "بنوقہ تم یہاں کیا لینے آئی ہو، خیریت تو ہے!"

یہ زہیر کی آواز تھی، بنوقہ پریشان ہو گئی لیکن آواز سے پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا، بولی "یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ کن لوگوں میں جنگ ہو رہی ہے؟"

زہیر نے کھنچے کھنچے لہجے میں جواب دیا "میں نے خداوند مقنع کی مرضی پوری کر دی، نماز عشاء کے دوران مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر کے مشیت خداوند مقنع پوری کر دی گئی ہے!" پھر ذرا افسوس سے پوچھا "لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت تم یہاں کیا لینے آئی تھیں؟"

بنوقہ کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہ تھا اور نہ ہی وہ اس سوال کا کوئی جواب سوچ کے چلی تھی۔ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھتے ہوئے زہیر نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت یہاں کیوں آئی تھیں، افسوس کہ تم نے ایک بار پھر میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔"

بنوقہ نے مستقل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ مسجد کے سامنے شور و غل اور چیخ و پکار بدستور جاری تھی۔ آسیبی سایوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ زہیر نے بنوقہ سے کہا "یہاں زیادہ دیر تک کھڑے رہنا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے کیونکہ جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔"

بنوقہ کسی معمول کی طرح اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ زہیر نے جب محسوس کیا کہ بنوقہ ساکت و صامت کھڑی کچھ سوچ رہی ہے تو اس نے طنز سے کہا "بنوقہ! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے کیونکہ جس کے پاس تم جا رہی تھیں اس کا گھر سے مسجد تک پتہ نہیں۔ میرے آدمی اس کی تلاش میں دور دور تک پھیل چکے ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لیث کا باپ، ماں اور اس کے کنبے کے دوسرے لوگ قتل کئے جا چکے ہیں لیکن لیث بچ کے نکل گیا، پھر گویا خود سے کہا لیکن بچ کے جائے گا کہاں، میرے آدمی اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

بنوقہ فرط غم سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ زہیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچ کے لے جاتے ہوئے کہا "بنوقہ! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے، یہاں سے فوراً بھاگ چلو ورنہ اگر پھنس گئیں تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔"

زہیر بمشکل اسے لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ گھر پر بھی عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ بنوقہ کا

باپ نخروں میں الجھا ہوا پیچ میلا رہا تھا۔ ان دونوں کے پہنچتے ہی اس نے پوچھا "یہ کہاں تھی؟"
زبیر نے بے چینی سے کہا "یہ وقت فضول قسم کے سوال وجواب کا نہیں ہے۔ ہمیں فوراً ہی چل پڑنا چاہیئے۔"

بنوتہ کے باپ نے سوال کیا "اور ان لوگوں کا کیا ہوگا جو مسلمانوں سے جنگ کر رہے ہیں؟"
زبیر نے جواب دیا "انھیں حکم دے دیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنا کام ختم یا مختصر کر کے ہم سے راہ میں آملیں۔"

قرنا پھونکا گیا اور اس آواز کے ساتھ ہی خداوند مقنع کے پرستاروں کا قافلہ مرد کی طرف روانہ ہوگیا ان کی آخری منزل کش تھی لیکن مرو سے نخشب اور نخشب سے کش پہنچنا تھا۔ مرغزاروں اور سرسبز و شاداب علاقوں سے گزر کر کوہستانی سلسلے سے ہوتے ہوئے اس پہاڑی قلعے میں داخل ہوتا تھا جہاں ان کا خداوند مقنع تقریباً چودہ سال سے مقیم تھا۔

کئی دن اور کئی راتیں سورج کی تمازت اور تاروں کے جھلمل جیسے سائبان کے نیچے سفر کرتے ہوئے یہ لوگ نخشب میں داخل ہو گئے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا اور گرم علاقوں کے پرند جھنڈوں کی شکل میں سرد علاقوں کی طرف محو پرواز تھے، اونچے نیچے درختوں پر مختلف النوع علاقائی پرندے زمزمہ سنجی کر رہے تھے۔ ان میں کوئلوں کی کائیں کائیں، کوئل کی کوکو اور طوطی کی ٹیں ٹیں بھی شامل تھی، سرسبز و شاداب درختوں کی ہری بھری شاخیں ہوا میں ہل ہل کے اپنی مستی و سرشاری کا اظہار کر رہی تھیں۔ مویشیوں کے گلے ریوڑوں کی شکل میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ان کے رکھوالے درختوں سے ٹیک لگائے ہجر و فراق کے گیت گا رہے تھے۔ ان کی پرسوز آوازیں پہاڑی چٹانوں سے ٹکرا کے دور دور تک پھیلتی جا رہی تھیں۔ قافلے کے وہ اہل فراق، جنہیں مجبوراً یہ سفر اختیار کرنا پڑا تھا اور جن کے محبوب بہت پیچھے وطن میں رہ گئے تھے، ہجر و فراق کے پرسوز گیتوں سے دلوں میں ایک کسک ایک چوٹ محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہفتے کے لئے نخشب میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اب وہ خداوند مقنع کی سرزمین میں داخل ہو گئے تھے یہاں کے لوگ ان کے ہم عقیدہ اور ہم خیال تھے۔ انھوں نے ان تارکانِ وطن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں کے بوڑھوں نے ان آوارگانِ وطن کو یہ کہہ کے تسلی دی کہ بلیوں اور ان کے ماننے والوں کو ان کے وطن میں نہیں مانا جاتا پھر خداوند مقنع کے پرستاروں کی آبائی سرزمین ان کی کس طرح دلجوئی کر سکتی تھی؟
رات کو جب آسمان پر دو چاند ایک ساتھ طلوع ہوئے تو ان تارکانِ وطن کے دل کی کدورتیں دھل گئیں اور ان کی تھکان میں پچاس فیصد کمی آ گئی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک چاند تو انتہائی بلندی میں آسمان پر چڑھا ہوا نظر آ رہا تھا لیکن دوسرا

چاند نخشب کی سرزمین پر کوئی چند فرلانگ بلندی پر تھا۔ اس چاند کو بوقہ نے بھی نہایت دلچسپی سے دیکھا اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ بوقہ کے ماں باپ اس چاند کو عقیدت و محبت سے دیکھ رہے تھے، اسے خداوند مقنع نے نخشب اور کش والوں کے لئے طلوع کیا تھا

ان دنوں زہیر کچھ زیادہ فکرمند رہتا تھا، وہ معلوم نہیں کن الجھنوں میں مبتلا تھا۔ بوقہ اس سے جنگ کی بابت جاننا چاہتی تھی جس میں لیث کے سوا اس کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ خداوند مقنع کے وہ پرستار جنھیں وہ مسجد کے سامنے دیتا پھڑتا چھوڑ آئی تھی اور وہ افراد جو لیث کی تلاش میں ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ ان کا کیا حشر ہوا؟ ان کی کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ لیکن وہ یہ باتیں کس سے پوچھتی؟ زہیر کا فکرمند چہرہ اسے خوفزدہ کئے رہتا۔ زہیر نے اس سے بات چیت بھی بند کر دی تھی شاید وہ بوقہ سے ناراض تھا۔ بوقہ کے والد کی نظر میں لیث کے بعد بوقہ کے لئے زہیر سے بہتر رشتے کا ملنا مشکل ہے۔ یہ دونوں بھی ان کی باہمی کشمکش کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے کئی بار بوقہ کو ہدایت کی کہ وہ زہیر کو ناراض نہ کرے اور اگر زہیر اس کی کسی بات سے ناراض بھی ہو گیا ہے تو اسے منانے کی کوشش کرے۔ خود بوقہ بھی دو دل ہو رہی تھی۔ خداوند مقنع کے پرستاروں میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور جب سے نخشب اور کش کی فضا میں مقنع کی طرف سے ایک چاند طلوع کر دیا گیا تھا۔ اس کے ماننے والوں میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا تھا۔ ان کے خداوند کا اتنا غیر معمولی کارنامہ تھا کہ اس عہد کے انسانوں کے خیال میں یہ کام خدا ہی انجام دے سکتا تھا۔ بوقہ بھی اس سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ لیث کا خیال خواب ہوتا جا رہا تھا۔ ایک ایسا خواب جو رات کے پچھلے پہر چند ثانیوں میں دیکھا گیا ہو اور صبح ہوتے ہوتے اس کی جزئیات حافظے سے نکلتی جا رہی ہوں۔

معلوم نہیں کس طرح زہیر کی اداسی کم ہو گئی اور وہ ہشاش بشاش دکھائی دینے لگا۔ وہ بوقہ کے پاس آیا اور اس نے باہر چلنے کی دعوت دی۔ بوقہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ چپ چاپ ساتھ چل پڑی۔ رات کا وقت، دو چاندوں کی نرم نرم خوشگوار اور کیف و محبت میں ڈوبی ہوئی چاندنی۔ یہ دونوں چلتے چلتے ایک مرغزار میں اناروں کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ان کے اوپر درختوں کی جھریوں میں سے چاندنی چھن چھن کے آ رہی تھی۔ زہیر نے بوقہ کو خود سے دور بٹھایا۔ بوقہ کو حیرت تھی کہ زہیر اس خوشگوار مزاجی کیفیت میں بھی اس سے دور کیوں بیٹھ رہا ہے۔ بوقہ چپ تھی اور چاہتی تھی کہ زہیر خود ہی گفتگو کا آغاز کرے۔

زہیر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔ کہیں قریب ہی کوئی بڑا سا پرندہ پھڑپھڑا کے اڑا اور ایک درخت سے اڑ کر دوسرے درخت میں گم ہو گیا۔ بوقہ ڈر سی گئی اور سرک کے زہیر کے قریب جا بیٹھی۔ زہیر اور پیچھے ہٹ گیا۔ بوقہ اس کی اس حرکت پر حیران سی رہ گئی

زبیر نے کہا: "بنوقہ! تم کچھ خیال نہ کرنا، میں ان دنوں تم سے کچھ دور دور رہا ہوں۔ میں نے ایسا کیوں کیا، یہ بڑے کرب اور ایک طویل الجھن کے ردعمل کی داستان ہے۔"

بنوقہ کچھ بولنے کے بجائے اس کی باتیں سننا چاہتی تھی کیونکہ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ زبیر سے کس قسم کی باتیں کرے۔

زبیر نے کہا: "تم بھی چپ چپ رہیں، کیوں؟ شاید اسی لئے کہ تم لیث کو بھلا نہ سکیں۔" پھر کسی سوچ میں ڈوب کر آہستہ سے کہا: "یہ تمہاری محبت ہی تو تھی جس نے لیث کو بچا لیا ورنہ اس دن میں اس سے اپنا حساب کتاب کر چکا ہوتا، شاید تم نے اسے میرے منصوبے سے کسی طرح پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔"

بنوقہ نے کہا: "میں نے ایسا نہیں کیا، یہ تمہارا خیال ہے۔"

زبیر نے پوچھا: "اچھا اگر میں اسے اپنا خیال یا گمان ہی مان لوں تو تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ تم اس رات وہاں کیا لینے گئی تھیں؟"

بنوقہ نے سچ بولنے ہی میں عافیت محسوس کی، بولی: "میں جھوٹ نہیں بولوں گی، میں تمہارے منصوبے سے لیث کو مطلع تو ضرور کرنا چاہتی تھی لیکن میں اس سے مل نہیں سکی تھی۔ ابھی میں مسجد کے سامنے ہی پہنچی تھی کہ سامنے مشعلوں کی روشنی میں جنگ ہوتے دیکھی۔ اس کے بعد تم مل گئے اور میں تمہارے ساتھ واپس آ گئی۔"

زبیر اس کی باتیں غور سے سنتا رہا، پھر پوچھا: "لیکن تم نے ایسا کیوں کرنا چاہا تھا؟"

بنوقہ نے جواب دیا: "لیث میرے چچا کا بیٹا ہے اور میں اس رشتہ کی محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکی ہوں۔"

زبیر نے بیزاری سے کہا: "یہ غلط ہے۔ تم اس سے محبت کرتی ہو اور اس محبت میں تم اسے ہمارے منصوبے سے مطلع کر دینا چاہتی تھیں۔"

بنوقہ نے کہا: "لیکن تم نے مجھے یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں پر نماز فجر کے بعد حملہ کیا جائے گا حالانکہ حملہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد کیا گیا۔"

زبیر نے ہنس کر کہا: "میں نے تمہیں اپنے منصوبے کا وقت اس لئے غلط بتایا تھا کہ میں جانتا تھا لیث کو اس سے مطلع کر دو گی اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں غلط رائے نہیں قائم کی تھی۔"

بنوقہ چپ ہو رہی۔ زبیر نے کہا: "بنوقہ!" اس کے بعد اس نے مقنع کے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "کیا ایسا چاند خداوند مقنع کے علاوہ کوئی بھی طلوع کر سکتا ہے؟ یہ بین علامت اس بات کا ثبوت ہے کہ خداوند مقنع سچا ہے۔"

بنوقہ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ زہیر نے چڑ کے دریافت کیا "کیا بات ہے؟ کیا
کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟"

بنوقہ نے جواب دیا "میں ناراض نہیں ہوں لیکن اس بات پر حیران ضرور ہوں کہ تم مجھ سے
کیوں ہو؟ تم مجھ سے دور بیٹھ کے اپنی بیزاری کا اظہار کر رہے ہو؟"

زہیر نے یک بیک پھر سنجیدگی اختیار کی، بولا: "ہاں، اس کا بھی ایک سبب ہے، مجھے اس انکشاف نے بڑا دکھ پہنچایا کہ تم بدستور لیث سے محبت کیے جا رہی ہو۔ میں اس سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوں میں نے تصور میں لیث کی پوری شخصیت کا اپنی ذات سے موازنہ کیا تو میں اس سے برتر نکلا۔ وہ ایک عام انسان ہے اور مجھے خداوند مقنع کے تقرب اور مبلغ کا شرف بھی حاصل ہے لیکن اس بڑائی اور اس عظمت کے باوجود جب تم نے لیث ہی کو اہمیت دی تو مجھے اس کا دکھ ہونا ہی چاہیئے تھا۔ میں نے کئی دن خاموش رہ کے اور تم سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس الجھن کا حل دریافت کرنا چاہا۔ میں یہ سوچتا رہا کہ مجھے تمہارے سلسلے میں کیسی روش اختیار کرنی چاہیئے۔ میں نے یہ چند دن تفکرات کے اندھیروں میں گزارے ہیں۔ میں نے الجھنوں کی پرپیچ راہوں میں سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی اور آخر اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ تم میرے لیے نہیں ہو، مجھے اپنے دل سے تمہارا خیال نکال دینا چاہیئے۔"

بنوقہ توجہ سے اس کی باتیں سنتی رہی اور زہیر کی آخری باتوں نے اسے چونکا دیا۔ حیرت سے پوچھا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی" "تم کیا کہنے چاہتے ہو؟"

زہیر نے جواب دیا "میرا مطلب بالکل صاف ہے، جب میں تمہارے دل میں جگہ نہیں بنا سکا تو میں نے باعزت پسپائی اختیار کر لی۔ بنوقہ! تم خوش ہو جاؤ کہ میں نے اپنی توقعات توڑ لی ہیں۔"

بنوقہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ زہیر آخر کہنا کیا چاہتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے کیا اس کا مطلب وہی ہے جو لفظوں میں پایا جاتا ہے؟ کیا ان کا مفہوم وہی ہے جو کانوں کی راہ سے دل و دماغ میں اترتا جا رہا ہے؟

زہیر نے ہنستے ہوئے کہا "بنوقہ اب فکر نہ کرو، میں تم سے مایوس ہو چکا ہوں، میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔ میں ایسی جرات بھی نہیں کر سکتا کہ تم سے محبت کا اظہار بھی کروں۔ تم مطمئن رہو، تم ایک امانت ہو اور یہ امانت اس کے حق دار کو نہایت عزت و تکریم سے پہنچا دی جائے گی۔"

بنوقہ نے رقت سے کہا "زہیر! میں جو کچھ سن رہی ہوں، اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

زہیر نے کہا "ایسی بات نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بولتا اور اس سرزمین میں جہاں خداوند مقنع موجود ہو میں جھوٹ بولنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

بنوقہ نے جوش میں اس کے کاندھے پر سر رکھ دینا چاہا لیکن زہیر پیچھے سرک گیا، بولا "اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بنوقہ۔"

بنوقہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلوگیر آواز میں بولی ”زہیر میں تمہارا شکریہ کس زبان سے ادا
ں عظیم نوجوان ہو، فرشتے بھی تم سے بڑھ کے نہیں ہوں گے!“
زہیر نے جواب دیا ”جب سے میں نے تمہیں اپنے دل سے نکالا ہے۔ مجھے ایسا سکون
کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔“
بنوقہ پوچھنا چاہتی تھی کہ زہیر نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عملدرآمد کس طرح ہو گا۔ لیث کہاں
بث نے اگر خداوند مقنع کا دین قبول نہ کیا تو یہ مسئلہ کس طرح حل کیا جائے گا؟ یہ ساری باتیں
یں لیکن پوچھنے کی ہمت نہ پڑی تھی۔
بنوقہ کے لئے زہیر کا یہ انداز معمہ بن گیا تھا کہ اس نے بنوقہ کا خیال تو اپنے دل سے نکال دیا تھا
رام بہت زیادہ کرنے لگا تھا۔ یہ لوگ ایک ہفتہ نخشب میں رہ کر کش روانہ ہو گئے، جہاں خداوند
پہاڑی کے ایک مضبوط قلعے میں سکونت پذیر تھا۔ یہاں ان کو ماوراءالنہر اور ترکستان کے کئی
ملے جو انہی لوگوں کی طرح خداوند کی بارگاہ میں جا رہے تھے۔ وہ اونچی نیچی پہاڑیوں سے
ے کش کے شمالی حصے میں داخل ہو گئے۔ یہاں سام نامی پہاڑی سلسلے کے ایک دشوار
ں وہ قلعہ دکھائی دے رہا تھا، جس میں ان سب کا مطلوب و مقصود فروکش تھا۔ ان لوگوں
مقابل پہاڑیوں پر قیام کیا اور خداوند مقنع کی طرف سے فرمان طلبی کا انتظار کرنے لگے۔
طرف منہ کر کے عبادت کرتے۔ بنوقہ کا باپ مقنع کی بارگاہ میں پہنچنے کے لئے بے چین تھا۔
کی بیوی کا بھی یہی حال تھا لیکن بنوقہ ایک ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح تھی جس کی موجیں تہہ میں ہوں
زہیر لئے سے خوب گھما تا پھراتا رہا۔ بنوقہ کا زہد شکن شباب زہیر کو آلودگی پر اکساتا لیکن اس نے بنوقہ
تھا اس پر سختی سے کاربند تھا۔ بنوقہ کو زہیر کی ہر بات کا اعتبار تھا لیکن ایک بات اس کی سمجھ
ں۔ وہ سوچتی کہ آخر تار عنکبوت جیسے ماحول میں لیث کس طرح داخل ہو سکے گا اور زہیر
ح لیث کے حوالے کر دے گا؟ وہ اس پر جتنا سوچتی سر میں درد ہونے لگتا۔
صبح نے رات کی آغوش سے نکل کے دنیا اور اہل دنیا کو اپنا منور اور صبیح چہرہ دکھایا اور
سا الحانی سے صبح کو خوش آمدید کہنا شروع کر دیا۔ پہاڑی گلے بان اپنے ریوڑوں کے ساتھ
یں چلے گئے۔ زہیر نے بنوقہ سے کہا ”بنوقہ! چلو میں تمہیں دور سے اس قلعے کی زیارت
ں خداوند مقنع تیرہ چودہ سال سے فروکش ہے اور جہاں دن رات فرشتوں کا نزول ہوتا رہتا
پوری زمین کا وہ حصہ جس پر خداوند بنفس نفیس موجود ہے۔ اس لائق ہے کہ ہم صبح و شام
ت کریں اور اس کی خاک کو چہرہ پر مل کر دل و جان سے دعائیں مانگیں۔
بنوقہ نے کہا ”میں سوچ سوچ کے پریشان ہو رہی ہوں کہ خداوند کے روبرو میں جاؤں
ہ؟“

زہیر نے تسلی دیتے ہوئے کہا "بنوقہ تم فکر مت کرو، میں تمہارے پاس موجود رہوں گا اور تمہاری ڈھارس بندھاتا رہوں گا۔"

بنوقہ نے جھجکتے جھجکتے سوال کیا "زہیر! میں کئی دن سے تم سے چند باتیں معلوم کرنا چاہتی ہوں کیا تم ان کے صحیح صحیح جواب دو گے؟"

زہیر نے جواب دیا "مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ تم جو چاہو پوچھو، میں ان کے وہی جوابات دونگا جنکی صداقت پر مجھے یقین ہے۔"

بنوقہ نے پہاڑی کے پیچھے سے سر نکالتے ہوئے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم نے خدا کا دیدار کیا ہے؟"

زہیر نے جواب دیا "نہیں، میں نے آج تک خدا کا دیدار نہیں کیا کیونکہ خداوند مقنع نے ہمارے اعراف پر ہمیشہ یہی کہا ہے کہ جب موسیٰ جیسی پیغمبر ہمارے دیدار کی تاب نہ لا سکا، تو تم عاجز انسان کس طرح میرا دیدار کر سکو گے؟"

بنوقہ نے دلچسپی سے پوچھا "اگر میں تمہارے نام نہاد خدا کا دیدار کر لوں تو؟"

زہیر نے جواب دیا "مجھے تمہاری اس بات کا کس طرح یقین آ سکتا ہے؟"

بنوقہ نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا "میں تم سے جو کچھ پوچھنا چاہتی ہوں وہ سوال تو اب کروں گی۔" پھر ذرا سکوت اختیار کیا اور کچھ دیر بعد پوچھا "کیا تم واقعی اپنے دل سے میرا خیال نکال چکے ہو؟"

"بالکل بالکل۔" زہیر نے جلدی جلدی کہا "میں اس بات کے لئے قسم کھانے کو تیار ہوں لیکن تمہیں قسم کھانے بغیر ہی میری اس بات پر یقین کر لینا چاہیئے۔"

بنوقہ نے پھر پوچھا "اور یہ بات درست ہے کہ تم امانت کے معاملے میں دیانت دار واقع ہوئے ہو اور جلد ہی تم مجھے اصل حقدار کے حوالے کر دو گے۔"

"ہاں، یہ بھی درست ہے۔" زہیر نے جواب دیا "میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ میرے دل میں تم احترام بن کے رہ رہی ہو۔ اور یہ احترام اور عزت بڑھتی تو رہے گی لیکن کم نہ ہو گی۔"

بنوقہ نے پھر سوال کیا "اور لیث؟ میرا مطلب ہے لیث، وہ جو میرے چچا کا بیٹا ہے، یعنی کہ۔" وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی، زبان اور الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

زہیر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی، دور قلعے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "اسے سجدہ کرو، اس میں خداوند مقنع ہے۔ خداوند مقنع جو اس وقت بھی ہم دونوں کے پاس موجود ہماری باتیں سن رہا ہو گا، ہماری ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہو گا۔"

یہ کہتے کہتے زہیر سجدے میں گر گیا لیکن بنوقہ بدستور کھڑی رہی۔ زہیر نے سجدے سے سر اٹھا کے بنوقہ کو کھڑے دیکھا تو بھنا گیا، بولا "بنوقہ! گستاخی اور بے ادبی سے باز آؤ اور فوراً سجدے

ں کر جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا تمہیں مغضوب قرار دے دے۔"

بنوقہ پھر بھی کھڑی رہی، بولی: "پہلے میں خدا کا دیدار کروں گی اس کے بعد اپنی عقیدت و احترام اس پر نچھاور کر دوں گی۔"

"موٹے کی طرح ضد نہ کرو۔ اگر خدا نے چہرے سے نقاب الٹ دی تو یقین کرو تم خاک ہو جاؤ گی، جل کے راکھ ہو جاؤ گی۔"

بنوقہ نے جواب دیا "میں مرنے سے نہیں ڈرتی، میں خداوند مقنع کا دیدار کر کے رہوں گی۔"

زہیر فکرمند ہو گیا۔ سورج کی شعاعیں پہاڑی کی چوٹی سے ٹکرا کر خیرگی سی پیدا کر رہی تھیں۔ زہیر نے سورج کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں چندھیا گئیں۔ بنوقہ سے کہا "بنوقہ! کیا تمہاری آنکھوں میں اتنی تاب موجود ہے کہ تم سورج سے آنکھ ملا سکو۔"

بنوقہ نے جواب دیا "نہیں، میں سورج سے آنکھیں نہیں لڑا سکتی۔"

زہیر کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، بولا "پھر تم خداوند مقنع سے کس طرح آنکھ ملا سکتی ہو! یہ سورج تو اسی در کا ایک ادنیٰ خادم ہے۔"

بنوقہ نے کہا "میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں، مجھے تو تم بچی سمجھ لو جو چاند کی ضد کر رہی ہے۔ تم اپنے خداوند سے کہو کہ میں اس کے دیدار کی طالب ہوں۔ اُسے دیکھنے پر مصر ہوں۔"

زہیر نے مردہ سی آواز میں کہا "اچھا مجھے وقت دو، میں خداوند مقنع تک تمہاری خواہش پہنچا دوں گا۔" پھر کچھ سکوت اختیار کیا، ذرا دیر بعد بولا "اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں خداوند کے روبرو پہنچا دیا جائے اور اپنی اس خواہش کا اظہار تم خود خداوند مقنع سے کر سکو۔"

بنوقہ نے خوش ہو کے کہا "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے!"

اس کے بعد بنوقہ کا یہ قاعدہ ہو گیا کہ اُسے جب بھی موقع ملتا زہیر کو اس پر مجبور کرتی رہتی کہ اُسے خداوند مقنع کے روبرو پہنچا دیا جائے اور زہیر ہر بار یہی کہتا کہ کوئی وقت مقرر کئے بغیر بات کسی وقت بھی اچانک خداوند کے روبرو پہنچا دیا جائے گا۔ خداوند سے ملنے اور اس کا دیدار حاصل کرنے میں اس کی یہ خواہش کارفرما تھی کہ وہ خداوند مقنع سے اس کے سخت دل پرستاروں کی شکایت کرے۔ خدا کا جو تصور اسلام نے پیش کیا تھا اس میں خدا منصف، ارحم الراحمین، شفیق اور مہربان تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خداوند مقنع میں بھی یہی اوصاف موجود ہوں گے اور خدا کے اوصاف اس کے حق میں مفید اور کارآمد ثابت ہوں گے۔

بنوقہ نے کئی بار زہیر سے لیث کی بابت بھی چند سوالات کرنا چاہے لیکن اس ڈر سے باز رہی کہ کہیں زہیر لیث کے ذکر سے چڑ نہ جائے۔ حالانکہ زہیر نے اس سے یہ وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ بنوقہ اس کے حقدار کے حوالے کر دی جائے گی۔

شام کی شفق پھول رہی تھی۔ زہیر کافی دیر غائب رہنے کے بعد جب ان میں واپس پہنچا تو

وہ بہت خوش تھا۔ اس نے بوقہ اور اس کے والدین کو یہ خوشخبری سنائی کہ "آج کے میرے دن ان سب کو خدا نے قلعہ میں طلب کر لیا ہے۔"

اس خوشخبری نے خداوند کی بارگاہ میں حاضری دینے والے امیدواروں میں خوشی کی لہر دوڑا دی خیموں میں موم کی شمعیں اور زیتون کی مشعلیں روشن تھیں، اندر کی گھٹی گھٹی فضا سے اکتا کر زہیر باہر نکل آیا اور اس کے ساتھ بوقہ اور اس کے والدین بھی باہر آ گئے۔ قبیلے کے دوسرے شرکا بھی اس کے آس پاس جمع ہو گئے۔ یہاں پچاسیوں آدمیوں کی موجودگی میں بوقہ کے باپ نے یہ اعلان کیا کہ "بوقہ کو زہیر کے حوالے کر دینے کا جو فیصلہ بحر خزر کے ساحلی قصبے بوگر میں کیا گیا تھا اس پر خداوند مقنع کی بارگاہ میں حاضری سے پہلے ہی عمل درآمد کر دیا جائے گا۔"

لوگوں نے جوش مسرت سے تالیاں بجائیں اور چند نوجوانوں نے کھڑے ہو کے خوشی سے ناچنا شروع کر دیا۔ بوڑھوں نے مبارکبادیں دیں اور دونوں کی کامیاب اور پرمسرت زندگی کے لیے خداوند مقنع کے قلعے کی طرف منہ کر کے دعائیں دیں۔ لیکن اس اعلان سے بوقہ کو بڑا دکھ پہنچا۔ اس نے آگ کے الاؤ کی روشنی میں زہیر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو خوشی کے تاثرات تھے اور نہ رنج اور افسوس کے۔ اس کا خیال تھا کہ زہیر کھڑے ہو کے علی الاعلان اس رشتے کے خلاف ضرور کچھ کہے گا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ بوقہ کو اس بات پر قلق ہو رہا تھا کہ اگر اس موقع پر خاموش رہا گیا تو شاید یہ رشتہ پکا ہو جائے گا۔ اس نے زہیر کو ایک بار پھر متجسس نگاہوں سے گھورا، لیکن وہ بدستور خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ آگ کے الاؤ کے قریب بیٹھی ہوئی بوقہ کھڑی ہو گئی اور آگ کی لرزتی لو میں لرزتا سایہ زہیر کے منہ پر پڑنے لگا۔ اس نے اپنے باپ سے کہا "افسوس کہ ابھی ابھی آپ نے میرے اور زہیر کے جس رشتے کی بات کی ہے وہ اب نہیں ہو سکتا۔"

بوقہ کے باپ کو اپنی بیٹی کے اس جرأت مندانہ اقدام کی توقع نہ تھی۔ غصے میں بوقہ کو شانے سے پکڑ کے بٹھا دینا چاہا، غراتے ہوئے کہا "یہ رشتہ میں نے کیا ہے، میری موجودگی میں تو اس سے کس طرح انکار کر سکتی ہے؟"

زہیر نے باپ بیٹی کو الجھتے دیکھ کر مداخلت کی اور کچھ سوچتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ بوقہ کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے محترم بزرگ! بوقہ صحیح کہہ رہی ہے۔" اس کے بعد اس نے بوقہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بوقہ! تم غلطی پر ہو۔ اس رشتے کی تنسیخ کا اعلان تمہاری طرف سے نہیں میری طرف سے ہونا چاہیے تھا۔"

جن لوگوں نے ان دونوں کے رشتے کے اعلان پر خوشی کا اظہار کیا تھا وہ حیرت سے زہیر کی صورت دیکھنے لگے۔ بوقہ کے باپ کا وہ ہاتھ جو بوقہ کے شانے پر رکھا تھا آہستہ آہستہ پھسل کے لڑھک گیا۔ بوقہ کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔

زہیر نے یوقنہ کے باپ اور حاضرینِ محفل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "یوقنہ نے جو کچھ کہا وہ وہی ہے جو اس سلسلے میں، میں خود کہتا۔ اس وقت میں کہیں اور تھا ورنہ میں خود تردید کر دیتا۔"

یوقنہ کے باپ نے تعجب سے پوچھا: "لیکن تمہیں یہ رشتہ منظور کیوں نہیں؟"

زہیر نے جواب دیا: "کسی انسانی دل سے محبت کے گہرے نقوش کو کھرچ کے مٹا دینا اگر ممکن ہوتا تو میں یوقنہ کے دل سے ان نقوش کو ضرور صاف کر دیتا لیکن یہ کام کسی انسان کے بس کا نہیں ہے جو خدا کسی کے دل میں محبت کی شمع جلاتا ہے وہی اسے بجھا بھی سکتا ہے اور اس کی جگہ دوسری جلا بھی سکتا ہے۔ میں یوقنہ کو خداوند مقنع کے روبرو پیش کر کے اس سے استدعا کروں گا۔ وہ یوقنہ کے دل کو انسانی محبت کی آلودگی سے پاک کر دے۔"

یوقنہ نے اسے ٹوک دیا، بلند آواز میں بولی: "لیکن تم نے مجھ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ جب تم نے مجھ سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا تو کیا مجھے اس کا سبب نہیں بتایا تھا کہ میرے دل میں لیث کی محبت موجود ہے اور تم اس سلسلے میں میری طرف سے بالکل مایوس ہو کے دستبرداری کے اعلان پر مجبور ہو گئے ہو؟"

زہیر نے اثبات میں گردن ہلا دی، کہنے لگا: "میں جھوٹ نہیں بول سکتا، یوقنہ صحیح کہہ رہی ہے۔"

یوقنہ نے مزید کہا: "اور کیا تم نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اپنے صحیح حق دار کے حوالے کر دی جاؤں گی۔"

زہیر نے پھر تائید کی، بولا: "ہاں، میں نے یہ بھی کہا تھا۔"

یوقنہ نے موقع غنیمت دیکھ کے جرأت مندی سے کہا: "اور میں اسی دن سے اس بات کا انتظار کر رہی ہوں کہ تم مجھے کب لیث کے حوالے کرو گے؟ وہ لیث جس کا مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا اور اگر وہ زندہ ہے تو کہاں ہے؟" یہ کہتے کہتے اس کی آواز میں کپکپاہٹ آگئی۔

زہیر نے کہا: "لیکن یوقنہ میں نے تم سے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں تمہیں لیث کے حوالے کر دوں گا۔ کیا تم نے میرے جملے کے لفظ حق دار پر غور کیا؟ تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میں لیث کو تمہارا حق دار نہیں مانتا۔ لیث بے دین ہے، خداوند مقنع کا دشمن، ایک کافر تمہارا حق دار کس طرح ٹھہر سکتا ہے۔"

یوقنہ کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی اسے چکر آنے لگا۔ محفل کے سارے لوگ ناچنے لگے۔ آگ کے شعلے تاریکی میں تبدیل ہونے لگے۔ اس نے لڑکھڑائی آواز میں دریافت کیا: "پھر تمہارے لفظ "حقدار" سے کون سا شخص مقصود ہے؟"

زہیر نے لاپروائی سے جواب دیا: "تمہیں یہ بات تین دن بعد معلوم ہو جائے گی، میں ابھی کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"

بوزتہ چکرا کے گر گئی۔ بوزتہ کے باپ نے اُسے اپنے ہاتھوں پر روک لینے کی کوشش کی، لیکن روک نہ سکا۔ وہ زبیر سے ذرا دور ایک پتھر پر ڈھیر ہو گئی۔ جس سے اس کے سر میں زخم آیا اور خون یہ بس بس کے بالائی لباس کو تر کرنے لگا۔

قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ دور دراز کے طالبانِ دید کو قلعے میں داخل ہونے کی اجازت بھی مل گئی۔ ان سب کو قلعے کے اُس حصّے سے دور رکھا گیا۔ جہاں خداوند مقنع خود مقیم تھا۔ سرسبز شاداب وادی میں بھاری بھاری پتھروں کے کابک بنا دیے گئے تھے۔ یہ مشتاقانِ دیدارِ الٰہی کابکوں میں ٹھہرا دیے گئے۔ ان کابکوں کے آگے ہزاروں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ ان کھڈوں کے اس پار پھر پہاڑی سلسلہ تھا اور اس سلسلے کے بعد پھر کھڈ۔ اس طرح ایک فرلانگ کے بعد وہ خوبصورت حصّہ تھا جہاں خداوند مقنع کے خوبصورت محلات تھے۔ ان سرخ اور نیلے پتھر کی عمارتوں کو بڑے بڑے درختوں نے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا اور ان محلات کی جو دیواریں نظر بھی آتی تھیں ان پر عشق پیچاں کی کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جن کے سُرخ سرخ پھول دیواروں میں آگ سی لگا رہے تھے۔
زبیر نے بوزتہ کے باپ کو بتایا "ان ہزاروں آدمیوں میں آپ لوگ وہ خوش قسمت انسان ہیں جنھیں خداوند مقنع نے اپنی قربت سے نوازنے کا شرف بخشا ہے۔ آپ لوگ یہاں نہیں ٹھہریں گے بلکہ آگے چلیں گے اور خداوند کے مخصوص محلات میں سے کسی ایک میں اقامت کا فخر حاصل کریں گے۔"
بوزتہ کا باپ خداوند کے محل کی طرف منہ کر کے سجدے میں گر گیا اور رو رو کے اپنی عاجزی کا اعلان کرنے لگا۔
پہاڑی خچروں پر ان کا سامان لدا ہوا تھا۔ افسر وہ اور سوگوار بوزتہ بھی ایک خچر پر سوار جھٹکوں سے آگے پیچھے ہوتی ہوئی مقنع کے محلات کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اُسے یہ سرسبز شاداب علاقہ پسند بہت آیا لیکن یہاں کے پُرلطف مناظر سے وہ حظ نہیں حاصل کر سکی۔ اُسے بار بار یہی احساس ستا رہا کہ زبیر نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور معلوم نہیں کیسے اس کا "حق دار" قرار دے دیا گیا ہے۔
یہ لوگ پہاڑی راستوں کے نشیب و فراز طے کرتے ہوئے خداوند مقنع کے زیرِ سایہ پہنچ گئے۔ انگوروں کی بیلوں نے انھیں خوش آمدید کہی اور دوسرے پہاڑی درختوں نے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلنا شروع کر دیا۔ اس سفر میں انھوں نے کئی گھنٹے صرف کئے تھے۔ انھیں ایک نیلی عمارت میں ٹھہرایا گیا، جس کے اوپر ایک خوبصورت سائبہ بنا ہوا تھا۔ بوزتہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے جیتے جی کسی مقبرے میں اتار دیا گیا ہو۔ اس محل میں انھیں خداوند مقنع کے خدمت گاروں کا ایک پرا دکھائی دیا۔ انھوں نے نو واردان کو سفید جامیاں میں شامل ہو جانے پر تیار کیا دیں دیں اور یقین دلایا کہ انھیں خداوند مقنع کے قرب میں ایسا سکون میسر آئے گا کہ وطن کو بھی بھلا دیا جائے گا۔"
تقریباً تین، ساڑھے تین گھنٹے بعد خداوند مقنع کی طرف سے ایک خوبصورت فرستادہ آیا اور

یا کر خداوند ان کی آمد سے بہت خوش ہے اور وطن کے چھوٹ جانے کا غم غلط کر دیا جائے
بوقہ کو یہاں عجیب سی بو محسوس ہوتی رہی۔ تیزاب، الکحل کی بو، ان دونوں کے علاوہ ایسی بو بھی
ہاں پائی جاتی تھی، جس کے بارے میں وہ کوئی معلومات نہ رکھتی تھی۔ اس نے زہیر سے پوچھا۔
"یہاں یہ بدبو کیسی پائی جاتی ہے؟"

زہیر نے جواب دیا۔ "خداوند مقنع چیزوں کے خواص کا بڑا گہرا علم رکھتے ہیں۔ ان کی تجربہ گاہ میں معلوم نہیں کیا کیا رکھا ہوا ہے۔ اس میں تیزاب، پارے اور الکحل سے تو میں خود بھی واقف ہوں۔"

بوقہ نے پوچھا۔ "خداوند کے محل میں ان چیزوں کا کیا کام؟"

زہیر نے بے بسی سے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں۔ ہاں دوسروں سے یہ سنا ہے کہ خداوند مقنع چیزوں کے خواص سے بڑا کام لیتے ہیں۔"

زہیر کی باتیں بوقہ کی سمجھ سے بالا تھیں۔ اس نے یہاں زہیر کو بہت بُرا بھلا کہا۔ بولی۔ "زہیر اس دن آگ کے سامنے تم جس طرح تم نے میرا دل توڑا تھا، میری خدا سے یہ دعا ہے کہ وہ تمہارا دل بھی اسی طرح توڑ دے!"

زہیر نے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "میرا دل تو تم نے پہلے ہی توڑ رکھا ہے۔"

بوقہ نے برجستہ جواب دیا۔ "میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا!"

زہیر نے کہا۔ "وعدہ تو میں نے بھی کوئی نہیں کیا تھا!"

بوقہ نے تقریباً بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے لیث سے ملواؤ گے اور مجھے لیث کے حوالے کر دو گے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔"

زہیر نے کہا۔ "میں نے لیث سے ملوانے کا اگر تم سے کوئی وعدہ کر رکھا ہے تو میں اس سے تمہیں ضرور ملوا دوں گا لیکن میں نے یہ وعدہ کبھی نہیں کیا کہ تم اس کے حوالے کر دی جاؤ گی۔"

بوقہ میں ذرا ہمت آئی، بولی۔ "اچھا اگر تم دوسری بات سے پھر رہے ہو تو کوئی بات نہیں، لیکن یہ تو کر سکتے ہو کہ مجھے لیث سے کسی طرح ملوا دو!"

زہیر نے کہا۔ "ہاں یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے میں اس سے تمہیں ضرور ملوا دوں گا۔"

کئی دن بعد رات کو زہیر خداوند مقنع کی طرف سے یہ پیغام لایا کہ "بوقہ! تم خوش قسمت ہو کہ خداوند مقنع نے تمہیں یاد فرمایا۔"

بوقہ نے گم صم ہو کے پوچھا۔ "کیا تنہا مجھے طلب کیا ہے؟ کیا میں وہاں اکیلی چلی جاؤں گی؟"

زہیر نے جواب دیا۔ "نہیں تو میں ساتھ چلوں گا۔"

بوقہ، خداوند مقنع کی طلبی سے سہم گئی تھی۔ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "لیکن وہ مجھے تنہا کیوں بلا رہا ہے؟"

"خدا کی باتیں خدا ہی جانے شاید تمہارے حسن کی دوسروں سے تعریفیں سن کر۔"

بنوقہ نے طنزاً کہا "خدا نے میرے حسن کی تعریف دوسروں سے سنی ہے؟ کیا وہ غیب کا علم نہیں رکھتا جو کسی خبر کے سلسلے میں دوسروں کی معلومات کا پابند ہے!"

زبیر نے خدا کی وکالت کی، بولا "خداوند مقنع کو تو ہمارے دلوں تک کا حال معلوم ہے۔ لیکن جب سے اس نے ایک مادی جسم میں ظہور کیا ہے وہ ان تمام امور کا پابند ہو گیا ہے، جو ایک مادی جسم سے وابستہ ہیں۔"

بنوقہ نے تشویش سے پوچھا "کیا خداوند مقنع صرف حسین شکلوں ہی کو اپنے حضور طلب کرتا ہے؟"

زبیر نے جواب دیا "ہاں، کیونکہ وہ خود حسین ہے، اس لئے حسینوں ہی کو پسند کرتا ہے۔"

بنوقہ کے دل میں خداوند مقنع کے خلاف بہت سی باتیں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھیں اس نے پوچھا "کیا خداوند مقنع نے شادی بھی کی ہے؟"

"شادی کی رسم تو انسانوں کے لئے نافذ ہوئی ہے!" زبیر نے جواب دیا "خداوند کی ذات آزاد ہے اور اسے ان بشری رسوم کا کس طرح پابند کیا جا سکتا ہے؟"

لیکن اس کے جواب سے بنوقہ کو تسکین نہیں ہوئی۔ وہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی زبیر کے جواب سے وہ بات صاف نہیں ہوئی تھی اس نے مزید استفسار کیا "کیا خداوند مقنع عورتوں میں دلچسپی لیتا ہے؟"

زبیر نے جواب دیا "بنوقہ! تم یہ مت بھولو کہ خداوند نے انسانی شکل میں ظہور کیا ہے اس لئے وہ تمام خصوصیات اور اوصاف جو ایک آدمی میں پائی جاتی ہیں اس میں بھی پائی جاتی ہیں وہ کھانا کھاتا ہے، غسل کرتا ہے، لباس پہنتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے، باتیں کرتا ہے۔ عورتیں رکھتا ہے اور ان عورتوں سے اسی طرح پیش آتا ہے جس طرح کوئی مرد عورت سے۔ قرآن پاک میں خدا نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ خداوند مقنع بھی انسانی جسم میں آنے کے بعد عورت کو اپنا لباس سمجھتا ہے۔"

بنوقہ کو وحشت سی ہونے لگی۔ اسے خداوند مقنع کے عزائم کا پتہ چل چکا تھا۔ اس نے مقنع کے روبرو تنہا جانے سے انکار کر دیا، بولی "میں وہاں نہیں جاؤں گی! میں خداوند مقنع سے ملنا نہیں چاہتی"

زبیر نے درشتی سے کہا "تمہیں وہاں جانا پڑے گا۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ خداوند کے احکام کو نظر انداز کر دے۔ اس کے حکم پر زبردستی عمل کرایا جاتا ہے!" پھر ذرا نرم لہجہ اختیار کیا "اور بنوقہ! اس کے باوجود کہ میں تم پر جبر نہیں کرنا چاہتا، اس معاملے پر جبر و زبردستی سے کام لینے پر مجبور ہوں۔"

بنوقہ نے اٹل لہجے میں کہا "میں نے بھی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں تمہارے خداوند کے
تنہا نہیں جاؤں گی اور اگر اس سلسلے میں تم یا کسی اور نے جبر سے کام لیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔"
زہیر نے مطمئن لہجے میں کہا "بنوقہ! اس وقت میں ایک بات صاف کردینا چاہتا ہوں۔
میں نے جب تم سے یہ کہا تھا کہ میں تمہاری محبت سے دستبردار ہو رہا ہوں اور تم اپنے صحیح حقدار کے
حوالے کردی جاؤ گی اور اس وقت میرے ذہن میں خداوند مقنع کا ہی خیال تھا۔ کیا یہ تمہارے اور
تمہارے خاندان کے لئے شرف و عزت کی بات نہیں کہ تم خداوند مقنع کی محبوبہ کہلاؤ۔ بنوقہ! میں نے
اپنے دل پر جبر و صبر کا پتھر رکھ کے، خداوند مقنع کی خاطر تم سے دست کشی اختیار کی ہے اور میں
یہ سعادت حاصل کرکے رہوں گا کہ تمہیں خداوند مقنع کی آغوش میں گرا ہوا دیکھوں۔"

بنوقہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور خشمناک نظروں سے زہیر کو گھورا، تلخ و ترش لہجے میں
کہنے لگی "میں تمہیں بڑا انسان سمجھتی تھی لیکن تم نہایت پست انسان نکلے۔ میری بابت تم نے اب تک
جو سوچا ہے۔ اسے اپنے دل سے نکال دو، ورنہ اگر تم نے کسی طرح جبر و زبردستی سے کام لیا
تو تمہیں شرمندگی اور ندامت سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

زہیر نے بھی مضبوط لہجے میں کہا "میں اپنے کسی بھی منصوبے میں ابھی تک تو شرمندگی یا ندامت
سے دوچار ہوا نہیں۔ آگے کا حال خداوند مقنع مجھ سے بہتر جانتا ہوگا۔"

بنوقہ نے اسے جھڑکی دی، زور سے چیختی ہوئی کھڑی ہوگئی "تم بھی دیکھنا، میں بھی دیکھوں
گی، تم جو کچھ دیکھو اس کو مجھے ضرور دکھا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جائے۔"

زہیر نے خلافِ توقع سوال کیا "بنوقہ! تم لیث سے کب ملنا چاہتی ہو؟"

بنوقہ کسی قدر نرم پڑ گئی، بے چینی سے پوچھا "وہ کہاں ہے؟ میں اس سے ضرور
ملوں گی، بار بار ملوں گی، ایک دو بار نہیں صد بار ملوں گی۔ وہ کہاں ہے؟"

زہیر نے جواب دیا "وہ میرے قبضے میں ہے اور اسے کل تک تم سے ملا دیا جائے گا۔"

بنوقہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "دل آزاری بدترین گناہ ہے لیکن میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ
تمہارا خداوند مقنع دوسروں کی دل آزاری سے خوش ہوتا ہے۔"

"بس، بنوقہ! زیادہ حد ادب! میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا، اپنی بکواس بند کرو!" زہیر
کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی۔ بنوقہ چپ بیٹھی رہی اور زہیر اسے تنہا چھوڑ کر پیر پٹکتا باہر نکل گیا۔

بنوقہ کے لئے وہ ساعتیں کتنی کربناک تھیں جو لیث اور اس کی ملاقات کے درمیان حائل تھیں۔
دوسرے دن زہیر حسب وعدہ اس کے پاس پہنچا۔ وہ بہت چپ چاپ تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
"بنوقہ میرے ساتھ آؤ تاکہ لیث سے ملوا دوں!"

بنوقرہ بجز سی اٹھی اور اس کے ساتھ ہو لی ۔ زہیر اُسے اُسی عمارت کے بالائی حصے لے گیا ۔ وہ گول زینوں میں گھومتی ہوئی اوپر پہنچ گئی ۔ چھت سے تقریباً چھ سات فٹ پہلے انہیں ایک چھوٹی سی کوٹھری نظر آئی ، جس میں ایک تالا بھی پڑا ہوا تھا ۔ زہیر نے کہا :" وہ یعنی لیث اس کوٹھری میں بند ہے ۔" پھر اس نے کنجی بنوقرہ کی طرف اچھال دی ، بولا :" اسے تم خود کھولو گی اور اندر بھی تم ہی جاؤ گی کیونکہ یہ معاملہ تمہاری ذات سے تعلق رکھتا ہے !"

لیکن بنوقرہ کو زہیر پر اعتبار نہیں رہا تھا ۔ وہ کوٹھری کو کھول کے اندر تنہا نہیں جانا چاہتی تھی ۔ اُس نے کہا :" کوٹھری کو تم خود کھولو اور لیث کو باہر بلا لو ، میں اندر نہیں جاؤں گی ۔"

زہیر نے طنزیہ کہا :" میں تمہارا مطلب خوب اچھی طرح سمجھ گیا !" پھر اس نے قفل کھول دیا اور اندر جاتا ہوا بولا :" تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں شاید ، نہ کرو اعتبار ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟"

یہ کہتا ہوا وہ کوٹھری کی تاریکی میں گھس گیا لیکن جب تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو اُس کے ساتھ ایک دبلا پتلا بیمار نوجوان بھی تھا ۔ بنوقرہ نے غور سے اس نوجوان کو دیکھا اور اس میں لیث کی شباہت پا کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی لیکن زہیر ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا :" ابھی نہیں ، ابھی تم دونوں ایک دوسرے سے دور دور رہو !"

بنوقرہ اضطراب و غصّہ میں زہیر کو دھکا دینے لگی لیکن مضبوط و توانا زہیر پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ لیث مجبوری اور بے بسی سے بنوقرہ کی شکل دیکھے جا رہا تھا ۔ زہیر نے بنوقرہ سے طیش میں کہا ۔
" بنوقرہ ! اپنے ہوش میں رہو ، دیوانگی سے کام نہ لو ، کیا تم مجھے دھکا دے کر لیث تک پہنچ سکتی ہو ؟"

بنوقرہ نے بدستور غصّے میں کہا :" زہیر ! سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں تمہاری اور اپنی جان ایک کر دوں گی !" یہ کہتی ہوئی وہ ایک پتھر کی طرف بڑھی لیکن زہیر نے اس سے پہلے ہی وہ پتھر اٹھا کے نیچے پھینک دیا ۔ پھر بنوقرہ سے نہایت خشک لہجے میں کہا :" میرا خیال ہے کہ تم یہ نہیں پسند کرو گی کہ میں لیث کو دوبارہ کوٹھری میں بند کر کے واپس چلا جاؤں !"

بنوقرہ نے بے چینی میں جلدی جلدی کہا :" نہیں ! خدا کیلئے ، مجھے اُس سے چند باتیں کر لینے دو !"

زہیر نے ترشی سے کہا :" تو باتیں ذرا دور سے کرو !"

لیث نے نحیف آواز میں بنوقرہ سے کہا :" بنوقرہ ! تم اس نوجوان کی بات مانو !"

بنوقرہ نے غصّے میں کہا :" لیکن ، اگر میں تمہارے جسم سے لگ کر کھڑی ہو کے بات چیت کروں تو اس نوجوان کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے !"

اس بار زہیر نے جواب دیا ، بولا :" میں خواہ مخواہ حسد کا شکار ہو جاؤں گا کیونکہ یہ میں کسی حالت میں بھی نہیں برداشت کر سکتا بنوقرہ اور لیث مل کے ایک ساتھ میرے سامنے کھڑے ہوں !"

لیث نے ناخوشگواری سے کہا :" بنوقرہ ! تم خواہ مخواہ وقت کیوں ضائع کر رہی ہو ؟ اس ضدی

سد نوجوان کی مرضی کے مطابق حالت میں بھی ہم دونوں باتیں کر سکتے ہیں، اس میں الجھنے
رٹنے کی کوئی بات نہیں۔"

ناچار بنوقہ بھی تیار ہو گئی اور چپ چاپ کھڑی ہو کے لیث کی صورت تکنے لگی۔

بنوقہ نے لیث سے پوچھا: "لیث! یہ تم گرفتار کس طرح ہوئے؟"

لیث نے جواب دیا: "دھوکے سے، مجھے اس حاسد نوجوان کے ساتھیوں نے دھوکہ دے کر پکڑ لیا۔"

زہیر نے ہنستے ہوئے کہا: "تم نے چالاکیاں بھی تو بہت دکھائی تھیں۔ سیدھی طرح ہاتھ ہی نہ آتے تھے۔"

بنوقہ نے لیث سے سوال کیا: "یہ تمہاری صحت اچانک کیوں خراب ہو گئی؟"

لیث نے صاف صاف جواب دیا: "اندر دھوپ کا کہیں سے بھی گزر نہیں ہوتا اس پر قید تنہائی۔ آدمی پاگل نہ ہو تو چند دن بعد پاگل ہو جائے۔ اگر اسی طرح مجھے دو ہفتے اور گزارنا پڑے تو میں پھر زندہ نہ نکلوں گا۔"

زہیر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی مجبوری اور بے بسی دیکھ دیکھ کے بہت خوش ہو رہا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچ کے زہیر ان دونوں کے سامنے سے ہٹ گیا، چھت پر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ زور سے بولا: "اچھا، اب تم دونوں آزادی سے دل کی باتیں کر سکتے ہو۔ میں تم دونوں کے درمیان سے ذرا دور ہٹا جاتا ہوں۔"

بنوقہ نے اسے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ لیث بھی دل ہی دل میں اس کی شرافت پر ایمان لے آیا۔ اس کے جاتے ہی بنوقہ نے لیث کے کاندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی، بولی: "یہ ظالم نوجوان مجھ سے کہتا ہے کہ میں مقنع کے حرم میں چلی جاؤں لیکن میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

لیث نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا، بولا: "بنوقہ میں ان بے دینوں کو اتنا طاقتور نہیں سمجھتا تھا، معلوم نہیں بغداد کی عباسی حکومت ان کے لئے کیا کر رہی ہے۔ ان لوگوں نے جو مجھے دکھ پہنچائے ہیں ان سے میرا حوصلہ پست ہو گیا۔"

بنوقہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "اور کمال تو یہ ہے کہ تم گرفتار ہو کے ہمارے ساتھ چلتے رہے لیکن ہمیں اس کا علم تک نہ ہو سکا۔"

لیث نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کیا تم نے مقنع کا دین اختیار کر لیا؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔" بنوقہ نے کہا: "کیوں؟"

لیث نے کہا: "اور آئندہ کیا تم بھی ان بے دینوں میں شامل ہو جاؤ گی؟"

بنو قہ نے جواب دیا "شاید، کبھی نہیں ؟"
لیث کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، کچھ دیر میں پوچھا "کیا میں اس کوٹھری میں مر جاؤں گا ؟"
بنو قہ نے تسلی دی، بولی "میں کوشش کرونگی کہ تم چھوڑ دیے جاؤ"
"وہ کس طرح ؟" لیث نے بے چینی سے پوچھا۔
بنو قہ کچھ سوچ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد خلا میں گھورتی ہوئی بولی "میں کوشش کرونگی اور شاید میں اس میں ناکام نہ رہوں"
اس کے بعد اس نے خود کو لیث کی آغوش میں دے دیا، روتی ہوئی بولی "!اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب تم آزاد ہو کر یہاں سے چلے جاؤ گے تو کبھی مجھے یاد نہ کرو گے۔ کسی لڑکی سے شادی کرکے بنو قہ کو اپنے دل سے نکال پھینکو گے"
"ایسا کبھی بھی نہ ہو گا بنو قہ !" لیث نے کہا "میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمہیں چاہتا ہوں، میں تمہیں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ میں تمہیں کبھی بھی نہ بھولوں گا"
بنو قہ نے سرد آہ بھر کے کہا "سب کہنے کی باتیں ہیں، کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا"
لیث بھی ایک دم جذباتی ہو گیا بولا "تب پھر میں آزادی نہیں چاہتا۔ اگر مجھے آزادی مل بھی گئی تب بھی میں اس کوٹھری سے نہ نکلوں گا"
بنو قہ زبردستی مسکرانے لگی، اس کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال دیا اور سہلاتی ہوئی بولی "میں تم سے مذاق کر رہی تھی ورنہ مجھے تو تمہاری محبت پر اتنا یقین ہے جتنا صبح کی طہارت وصباحت کا"
زہیر واپس آ گیا، مسکراتے ہوئے ہوئے پوچھا "کیا تم دونوں نے کچھ کام کی باتیں کریں ؟"
بنو قہ نے جواب دیا "ہاں، کریں"
زہیر نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن اس وقت میں خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر مخل ہوا ہوں کیونکہ مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ تم دونوں اب اپنی جذباتی گفتگو کے اہم موڑ پر ہو" پھر زور زور سے ہنستا ہوا بولا۔ "اور مجھے بھی ذرا سی تم دونوں کے ترسانے تڑپانے میں مزہ آنے لگا ہے کیونکہ اس سے پہلے تم دونوں مجھے بھی ترسا تڑپا چکے ہو"
ان دونوں نے اس شقی القلب کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ زہیر نے لیث کو حکم دیا "اب تم اندر جاؤ"
لیث نے بنو قہ کو بڑے کرب سے دیکھا۔ بنو قہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اسے اندر جاتا ہوا دیکھ سکتی۔ اس لئے اپنا منہ پھیر لیا اور لیث اندر چلا گیا۔ زہیر نے کوٹھری کو پھر مقفل کر دیا۔
جب وہ دونوں واپس نیچے جا رہے تھے تو زہیر خاموش و فکرمند بنو قہ کی الجھن اور نفسی

کیفیات کا نہایت غور سے مشاہدہ کر رہا تھا آخر اس نے بنوقہ کو ٹٹولنے کی خاطر چھیڑا "کیا تم لیث کو آزادی دلانا پسند کرو گی؟"

بنوقہ نے بے اختیار جواب دیا: "کہہ تو دیا کہ ہاں میں اسے آزاد دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن کس طرح، میں نہیں جانتی"

زہیر نے مزید ہنستے ہوئے کہا "اگر تم چاہتی ہو تو لیث کو آزادی مل سکتی ہے!"

بنوقہ نے بے چینی سے کہا "میں نے کہہ تو دیا کہ میں اسے آزاد دیکھنا چاہتی ہوں" پھر پوچھا "میں اسے کس طرح آزادی دلوا سکتی ہوں؟"

زہیر نے طنز آمیز لہجے میں کہا "ترکیب میں تمہیں بتا دوں گا اس پر عمل کرنا تمہارا کام ہو گا"

بنوقہ کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا، تلملا کے پوچھا "آخر کس طرح؟ تم کچھ بتاتے کیوں نہیں؟"

زہیر نے کہا "یہاں تو بس ایک ہی ہستی ایسی ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے اور وہ ہے خداوند مقنع کی ذات، اگر وہ چاہے تو لیث کو اسی وقت آزادی مل سکتی ہے"

بنوقہ نے خوشامد کی "تب پھر تم میری طرف سے اس کی خوشامد کرلو زہیر! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ تم خداوند مقنع سے لیث کو رہائی دلا دو"

زہیر نے جواب دیا "خداوند مقنع میری بات نہیں مانے گا"

"پھر وہ جس کی بات مان لے گا، اس سے سفارش کرا دو"

زہیر نے کہا "کسی سے بھی کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے اس کام کے لئے تم تنہا کافی ہو۔ تم خود خداوند کے پاس چلی جاؤ اور لیث کی آزادی کا پروانہ لے آؤ"

بنوقہ سناٹے میں آ گئی۔ کچھ دیر تک تو اس کی شاید سمجھ میں ہی نہ آیا کہ زہیر نے بات کیا کہی ہے لیکن جیسے جیسے بات سمجھ میں آتی گئی بنوقہ کو طیش سے جھرجھری سی چڑھ گئی۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ وہ فوراً انکار کر دے اور زہیر سے کہہ دے کہ اگر لیث کو اسی شرط پر آزادی مل سکتی ہے تو وہ ایسی آزادی نہیں چاہتی لیکن پھر معاملے کی نزاکت اور اہمیت کا احساس کر کے خاموش ہو رہی۔

زہیر اس کشمکش اور اس کے نتائج کا خوب اچھی طرح اندازہ کر چکا تھا، بولا "بنوقہ! تم بس ہاں کر دو لیث کل ہی رہا کر دیا جائے گا"

بنوقہ نے سر اٹھا کے زہیر کی دھندلی دھندلی سی شکل دیکھی اور شاید مدہوشی کی کیفیت میں آ ... سے کہا "ہاں میں تیار ہوں میں لیث کی آزادی چاہتی ہوں، ہر طرح، ہر قیمت پر میں لیث کے لئے تمہارے خداوند کے پاس جاؤں گی، اس سے بھی ملوں گی"

یہ کہتے کہتے وہ بے ہوش ہو کے گرنے لگی لیکن زہیر نے اسے اپنے ہاتھوں پہ روک لیا۔

اس دن خداوند مقنع نے اپنے پرستاروں کو خصوصی حکم بھیجا تھا کہ پورے قلعے اور اس متعلقہ محلات کو سجایا جائے۔ اس کام میں منوں تیل خرچ ہوا اور اسی حساب سے روئی بھی کام میں لائی گئی خوشبویات سے محل مہکنے لگا۔ عقیدت مندوں اور پرستاروں نے عید جیسا اہتمام کیا اور نئے نئے کپڑے پہن کر خداوند مقنع کے محل کی طرف منہ کر کے اس کی حمد و ثنا بیان کرنا شروع کر دی زہیر اور چند دوسرے مبلغین آگے آگے تھے اور ان کے پیچھے وہ پرستار تھے جو دور دراز کی مسافت طے کر کے خداوند مقنع کی قربت حاصل کرنے آتے تھے ان میں سے اکثر خداوند کی شبیہ بھی دیکھنا چاہتے تھے اور خداوند مقنع کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ موسیٰؑ کی طرح اپنی ضد پر قائم تھے اور انہیں اپنی زندگیوں کی بھی کوئی پرواہ نہ تھی۔ انہی لوگوں میں بنو قہ کے والدین بھی شامل تھے۔ اس دن بنو قہ کو دلہن بنا دیا گیا تھا۔ وہ ان سب کے جھرمٹ میں کشاں کشاں چلی جا رہی تھی۔ ان کا ہر قدم انہیں مقنع سے قریب کرتا جا رہا تھا جب یہ لوگ اس دروازے کے سامنے پہنچ گئے جس کے دوسری طرف خداوند مقنع ایک مرصع تخت پر اپنا چہرہ سنہری نقاب میں چھپائے بیٹھا تھا تو بارگاہِ خداوندی کے خدام نے باآواز بلند انہیں رک جانے کا حکم دیا۔ وہ بڑا عجیب سماں تھا۔ خدام کی آوازیں جیسے جیسے ان کے کانوں میں پہنچیں تو جس حال میں تھا، اسی طرح کھڑا ہو گیا۔ بعض کا بایاں پیر اٹھ چکا تھا اور بعض کا دایاں، ان کے لٹکے ہوئے پیر اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ بعض نے فرطِ عقیدت میں خود کو قدرے خمیدہ کر لیا تھا، وہ جھکے کے جھکے رہ گئے تھے بعض نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اسی طرح سر پکڑے رہ گئے۔ بعض کا چہرہ اندرونی جذباتی کھنچاؤ سے تمتما کر بناک ہو گیا تھا اور زہیر اور اس کے ساتھی سر جھکائے زمین پر جمے ہوئے اپنے قدموں کو دیکھ رہے تھے۔ بنو قہ تنہا ایک ذات ایسی تھی جس پر اس حکم کا کوئی اثر نہ ہوا تھا اور وہ اپنے آس پاس ان جاندار مجسموں کو حیرت و تعجب سے گردن گھما گھما کر دیکھ رہی تھی۔ سامنے جو دروازہ تھا اس کی محراب کو خوشبودار اور رنگ برنگے پھولوں سے سجا دیا گیا تھا۔ دروازے کے آس پاس کی دیواروں کو پھولوں کے ہاروں سے کچھ اس طرح ڈھانپ دیا گیا تھا کہ دیواریں ان میں چھپ گئی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے پھولدار درختوں کی لمبی چوڑی اور موٹی بیلیں زمین پر دیوار کی طرح کھڑی کر دی گئی ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد دروازے کے دونوں پٹ خود بخود کھل گئے اور عقیدت مندوں کو دیا گیا کہ وہ سجدے میں گر جائیں۔ حکم پاتے ہی سبھی سر بسجود ہو گئے۔ بنو قہ نے یہاں بھی تعمیل نہیں کی لیکن زہیر نے زبردستی اسے گدی سے پکڑ کے سجدے میں گرا دیا۔ وہ زمین پر پیشانی کے بل گر گئی۔ پیشانی زخمی ہو گئی اور اس سے خون جاری ہو گیا۔

کسی مقربِ خاص نے باآواز بلند خداوند مقنع کی طرف سے حکم دیا: "خداوند کی محبوبہ کو دروازے میں داخل ہو کے داہنی جانب کے کمرے میں بٹھا دیا جائے!"

زہیر نے دیوانہ وار بیوقہ کو گھوڑا یا اور اسے اپنے بازوؤں میں لے کے مذکورہ کمرے میں پہنچا کے واپس آگیا۔

خداوند کے خدام نے، اس کے حکم کو ایک بار پھر پرستاروں کے کانوں تک پہنچایا۔ "سجدوں سے اٹھ کر سامنے دیکھا جائے!"

سر بسجود گردنیں اٹھیں اور انھوں نے اپنے سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک بلند قد شخص ایک تخت پر بیٹھا ہوا تھا اس کا چہرہ سنہری نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ خداوند نے اپنے خدام کے ذریعے پرستاروں کو مخاطب کیا۔

"لوگو! ہم خوش ہیں کہ تم نے دور دراز علاقوں سے یہاں تک دشوار گزار راستوں کو اس لئے عبور کیا ہے کہ تم ہمارا قرب چاہتے تھے۔ تم ہمارے دیدار سے شرف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ اس وقت سے ہم تمہارے سامنے ہیں لیکن سامنے ہونے کے باوجود تم ہمارا دیدار نہیں کر سکتے۔ ہماری قربت حاصل ہونے کے باوجود تم ہمیں نہیں دیکھ سکتے!"

بہت سے پرستاروں نے بیک آواز جذباتی لہجے میں کہا۔ "ہم خداوند کے دیدار سے مفتخر ہونا چاہتے ہیں!"

خداوند مقنع نے جواب دیا: "یہ ناممکن ہے!"

پرستاروں نے اصرار کیا: "خدا کے لئے کوئی بات بھی ناممکن نہیں!"

"بے شک ہمارے لئے کوئی بات بھی ناممکن نہیں اور اسی لئے ہم انسانی شکل اختیار کر کے اس وقت تمہارے روبرو موجود ہیں۔"

پرستاروں نے اصرار کیا: "ہم خداوند کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"تم نہیں دیکھ سکتے!" خداوند نے پہلی بار اپنے پرستاروں کو براہ راست مخاطب کیا: "کیونکہ تم سے پہلے ہمارے جندی بندے موسیٰ نے بھی یہی خواہش کی تھی اور بار بار منع کرنے کے باوجود جب وہ باز نہیں آیا تھا تو ہم نے اسے اپنی ایک ہلکی سی جھلک دکھادی تھی۔ اور موسیٰ اس کی تاب نہ لا کے بے ہوش ہو گیا تھا۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو؟"

پرستاروں کی طرف سے ایک ہی اصرار تھا: "ہم خداوند کی ایک جھلک پر اپنی جانیں تک قربان کر دینے کو تیار ہیں۔"

خداوند نے کہا: "میرے نادان بندو! میں تمہیں نظر نہیں آرہا؟"

پرستاروں نے جواب دیا: "صرف جسم، ہم خداوند کا جمال پر تجلی دیکھنا چاہتے ہیں!"

مقنع نے دریافت کیا: "تم ہمیں کس شکل میں دیکھنا چاہتے ہو؟ انسانی شکل میں یا پھر حقیقی شکل میں؟"

پرستاروں نے جواب دیا: "حقیقی شکل ہیں! جہاں تک انسانی شکل کا تعلق ہے وہ تو ہمارے سامنے موجود ہی ہے!"

مقنع نے کہا: "ہم مجسّم نور ہیں، ایک جہاں سوز تجلی۔ اگر ہم اپنے چہرے سے اپنی سنہری نقاب ہٹا دیں تم تم جھلسنے لگو گے۔ اور تمہارے ہوش و حواس جاتے رہیں گے!"

"کچھ بھی ہو!" پرستاروں نے کہا: "ہم خداوند کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔"

خداوند نے جواب دیا: "بہتر ہے، کل دوپہر تم سب سامنے، قریب کی پہاڑی پر جمع ہو جاؤ، کل ہم اپنے چہرے کی نقاب ہٹا دیں گے اور تم سب ہمارے جلوے سے شاد کام ہو سکو گے لیکن ہم ایک بار پھر یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ تم ہمارے جلوے کی تاب نہ لا سکو گے۔"

پرستاروں نے کہا: "ہم سب خداوند کی ایک جھلک پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں۔"

خداوند نے انھیں واپس جانے کا حکم دیا: "تم سب واپس جاؤ۔" پھر اپنے مبلغین کو مخاطب کیا: "اور میرے وہ بندے، جنہیں فرشتگان کی خدمات سونپی گئی ہیں اور وہ جنہیں میں نے اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت پر مامور کیا ہے، رک جائیں ان کے ساتھ ہی ہو کر وہ خوش نصیب والدین بھی رک جائیں جن کی بیٹی بنوقہ کو میں نے اپنی محبوبہ ہونے کا شرف بخشا ہے۔"

پرستاروں کا یہ ہجوم جس طرح آیا تھا واپس چلا گیا لیکن مبلغین اور بنوقہ کے والدین وہیں رک گئے۔ خداوند مقنع نے انھیں اپنے تخت کے قریب آنے کا حکم دیا۔ یہ سب مقنع کے تخت سے تقریباً دس قدم دور جا کے کھڑے ہو گئے۔

خداوند مقنع نے بنوقہ کے والدین کو مستقبل کی نہایت کامیاب و کامران اور خوش و خرم زندگی کی بشارت دی اور زہیر سے کہا: "انھیں میرے محلِ خاص کے برابر کا حصّہ رہائش کے لئے عطا کیا جائے۔"

زہیر نے ان دونوں کو مذکورہ محل میں پہنچا دیا۔ اس نے ان کو خوشخبری سنائی: "بنوقہ کے سرپرستو! تم اس دنیا کے کتنے خوش قسمت انسان ہو کہ خدا نے تمہیں اپنے نسبتی والدین ہونے کا شرف بخشا ہے!"

بنوقہ کے والدین اظہارِ شکر گزاری میں مقنع کے کمرے کی طرف منہ کر کے سجدے میں گر گئے۔

بنوقہ کی قوتِ شامہ نے یک بیک محسوس کیا جیسے خوشبو کا طوفان اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ پھر اپنے کمرے میں اچانک بہت سارے وجود محسوس کئے۔ اس نے نظریں اٹھا کے اپنے آس پاس دیکھا تو دس بارہ عورتیں مؤدب کھڑی دکھائی دیں، بنوقہ کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس

نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تم کون ہو اور مجھے یہاں کتنی دیر رکنا ہے؟"

ان میں سے ایک عورت آگے بڑھی اور ادب سے جواب دیا "ہمیں تمہاری خدمت پر مامور کیا گیا ہے اور تم اس وقت خداوند مقنع کی محبوبہ ہونے کا شرف حاصل کر چکی ہو، خداوند جب چاہے گا تمہیں اپنی جگہ سے حرکت کا حکم عطا فرمائے گا" اسی وقت خدمتگار خواتین ادھر ادھر دبکنے سمٹنے لگیں۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے با آواز بلند خبردار کیا "خداوند تشریف لا رہے ہیں نگاہ روبرو رہے اور جو جس حال میں ہے اس میں منجمد ہو جائے یہاں تک کہ خداوند حرکت کا حکم عطا فرمائیں"

یہ خواتین جس حالت اور جس انداز میں کھڑی تھیں پتھر کے مجسموں کی طرح اسی انداز میں کھڑی رہ گئیں۔

مقنع خوشبویات میں معطر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بزقہ کے روبرو جا کھڑا ہوا کچھ دیر تو وہ بزقہ کو دیکھتا رہا اس کے بعد خدمتگار خواتین کو حکم دیا "خلوت، تخلیہ"

وہ خواتین باہر چلی گئیں، خداوند نے بزقہ کو چند ثانیے دیکھتے رہنے کے بعد مخاطب کیا "بزقہ! اے میری عزیز دلنشین در مقصود! مجھے جب تیرے بے پناہ حسن کا علم ہوا تو میں نے اپنے بندے زہیر کو حکم دیا کہ تجھے میرے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ زہیر میرے فرماں بردار بندے نے اس پر پوری اطاعت کیشی سے عمل کیا ہے"

بزقہ نے سر اٹھا کے مقنع کی طرف دیکھا۔ ایک چوڑا چکلا پستہ قد زرق برق اور معطر لباس میں ملبوس اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سنہری نقاب پڑی ہوئی تھی۔

مقنع نے اسے خاموش دیکھ کے سوال کیا "بزقہ تجھے خوش ہونا چاہیئے کہ میں نے تجھے وہ قربت بخشی ہے جس سے دوسرے محروم رہتے ہیں"

بزقہ نے جس کامیابی کے لئے اتنی بڑی قربانی دی تھی اس کی حصولیابی کا یہ بہترین موقع تھا۔ اس نے شرم و جھجک کو بالائے طاق رکھ کر مقنع سے کہا "میں چاہتی ہوں کہ پہلے میں اپنے مخاطب کا تفصیلی تعارف حاصل کر دوں اس کے بعد راز و نیاز کی باتیں ہوں"

مقنع اس کے قریب ہی بیٹھ گیا حیرت سے پوچھا "بزقہ! کیا تم واقعی یہ نہیں جانتیں کہ میں کون ہوں؟"

بزقہ نے جواب دیا "میں نے تمہاری بابت یہ سن رکھا ہے کہ تم حکیم کے بیٹے ہاشم ہو اور مرو کے قصبے غزتے کے رہنے والے ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم ابو مسلم خراسانی کی فوج میں ایک فوجی افسر بھی تھے اور یہ کہ تمہاں چیزوں کے خواص و اثرات کا وسیع علم حاصل ہے تم طبیعات کے ماہر ہو"

مقنع نے نہایت افسوس سے کہا "بنوقہ! افسوس کہ تم ابھی تک مجھ سے واقف نہیں ہوئیں تم مجھے انسان کیوں سمجھتی ہو، میں تمہارا خدا ہوں، تمام جہانوں کا خدا۔ تم یا کچھ لوگ مجھے ہاشم کہتے ہیں تو کہا کریں، میں اپنے لیے جو چاہوں نام اختیار کروں۔ پہلے میں آدم تھا، ابراہیم تھا، موسیٰ اور عیسیٰ تھا اور سب کے آخر میں ابو مسلم خراسانی کی شکل میں ظاہر ہوا اور اب میں ہاشم کی شکل میں نمودار ہوا ہوں۔"

بنوقہ نے کسی قسم کا تاثر لیے بغیر کہا "لیکن یہ کیا بات ہے کہ تم سے پہلے جو بھی آیا اس نے خود کو خدا نہیں کہا، محض پیغمبر ہونے پر اکتفا کیا اور تم خود کو خدا کہہ رہے ہو، آخر یہ کیوں؟"

مقنع نے جواب دیا "انھیں اس اعلان اور دعوے کی میری طرف سے اجازت نہیں ملی تھی۔ وہ انسان بھی تھے لیکن میں سراپا روحانی ہوں اور جو شکل بھی چاہوں اختیار کر سکتا ہوں۔"

بنوقہ نے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ خدا الرحمٰن الرحیم ہے، کیا تم بھی اس بات کا دعوے کر سکتے ہو؟"

مقنع نے جواب دیا "ہاں! میں یہ بھی ہوں، یہ میری صفت ہے لیکن یہ مت بھول کہ میں قاہر بھی ہوں اور جبار بھی۔ لیکن اے نا سمجھ اور بحث و تکرار کی خوگر لڑکی! اس طرح تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

بنوقہ ایک دم رونے لگی، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ مقنع نے ان آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش کی تو بنوقہ نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور کہنے لگی "میں کیوں رو رہی ہوں اور میں خداوند سے کیا چاہتی ہوں غالباً اس سلسلے میں مجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے اور خدا جس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ عالم الغیب ہے۔ دلوں کے حال جانتا ہے خداوند کو ضرور معلوم ہو گا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟"

مقنع نے بے نیازی سے کہا "بھولی لڑکی! میں جانتا ہوں کہ تو کیا چاہتی ہے۔"

بنوقہ نے ہکا بکا ہو کے مقنع کی طرف نظر اٹھائی، تعجب سے پوچھا "میں کیا چاہتی ہوں؟"

مقنع نے شانِ بے نیازی سے کہا "تو جو کچھ بھی چاہتی ہے میں اس سے واقف ہوں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ تو اپنی خواہش کا لفظوں میں اقرار اور اظہار کرے۔"

بنوقہ نے حیرت سے کہا "آخر یہ کیوں؟ خداوند کو میری زبان سے کچھ کہے بغیر ہی جب علم حاصل ہے تو وہ اس کو میری زبان سے کیوں سننا چاہتا ہے؟"

مقنع ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اس کے انداز میں وہی پہلے جیسی طمانیت اور بے نیازی پائی جاتی تھی، اس نے کہا "اے بھولی لڑکی! کیا تو نے میرے ان تمام بندوں کو، جو کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہیں، مسجدوں اور عبادت گاہوں میں ہاتھ باندھ کے دعائیں مانگتے نہیں دیکھا حالانکہ وہ سب جانتے ہیں کہ خدا عالم الغیب ہے اور ان کے دلوں کی باتیں جانتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے

خواہشات کا اظہار لفظوں میں، شکل میں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کچھ اصول مقرر کئے ہیں اور انہی میں سے ایک یہ اصول بھی ہے کہ میرے بندے اپنی خواہشات کا اظہار باآواز بلند زبان سے لفظوں میں کریں!" پھر نہایت پرشکوہ انداز میں کہا "ہاں تو اے معصوم اور چلبلی لڑکی! اب تو بتا کہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟"

بنوقہ لاجواب ہو گئی، ذرا سنبھل کے بولی "لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ پہلے خداوند مجھے اس بات کا یقین دلا دیں کہ وہ میری درخواست رد نہیں کریں گے؟"

مقنع نے کہا "میں تیری درخواست رد نہیں کروں گا، تو یقین رکھ۔"

بنوقہ نے کہا "میرے چچا کے بیٹے لیث کو رہا کر دیا جائے۔"

مقنع کچھ پریشان ہو گیا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا بولا "پہلے تم اس سے محبت کرتی تھیں اور وہ بھی تجھے چاہتا تھا۔ خیر اب تو اپنے خداوند کے محل میں ہے اس لئے مجھے اس سرکش کو قید میں نہیں رکھنا چاہیئے!" پھر پوچھا "وہ کل رہا کر دیا جائے گا، اور کچھ؟"

"اور یہ کہ!" بنوقہ نے لجاجت سے کہا "لیث میرے چچا کا بیٹا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اس سے ایک الوداعی ملاقات بھی کر لوں۔"

مقنع بخشش و عطا پر تلا ہوا تھا بولا "یہ بھی ہو جائے گا اور کچھ؟"

بنوقہ مارے خوشی کے بستر پر گر گئی اور مقنع کیف و مستی سے سرشار اس کے برابر جا بیٹھا۔

دوسرے دن صبح مقنع کے خاص خدمت گار لیث کو لے کے بنوقہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ لیث کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اسے کیوں اور کہاں لے جایا جا رہا ہے لیکن جب اسے اچانک بنوقہ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا تو وہ حیرت و پریشانی میں یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ مقنع کے خاص محل میں ہے یا کسی معمولی جگہ پر۔ بنوقہ نے خدام کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلے گئے تو وہ مزید اطمینان کے لئے باری باری ان تمام دروازوں پر گئی جو اس کے کمرے میں کھلتے تھے۔ اس وقت مقنع اپنی دوسری بیویوں کے پاس گیا ہوا تھا۔ بنوقہ کو جب مکمل تخلئے کا یقین ہو گیا تو اس نے لیث کو ایک گوشے میں لے جا کے مغموم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ اس وقت تم قیدی نہیں ہو اور تم رہا کئے جا چکے ہو؟"

لیث سمجھا بنوقہ اس سے مذاق کر رہی ہے، بولا "بنوقہ! میں زندگی سے عاجز آ چکا ہوں مجھے مزید نہ ستاؤ۔"

بنوقہ روہانسی ہو گئی، آنکھیں ڈبڈبا گئیں، بولی "کیا میری نمناک آنکھیں اور کپکپاتی آواز بھی تمہیں یہ نہیں بتا رہی کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں!" پھر بڑے کرب سے کہا "میں

نے تمہاری رہائی کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ آج تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔"
پھر وہ سسکیاں لینے لگی: "اور کچھ پتہ نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں ایک دوسرے سے کبھی دوبارہ مل سکیں گے یا نہیں؟" وہ آنسو پونچھنے لگی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی نہ آجائے۔ لیث کو ہدایت کی: "تم واپس جا کے خوش و خرم رہنے کی کوشش کرنا۔"

لیث نے پوچھا: "کیا تم یہیں رہو گے۔ کیا میں واقعی رہا کر دیا جاؤں گا؟"

بنوقہ نے جل کے جواب دیا: "کیا قید اور صحت کی بربادی نے تم سے قوت یقین چھین لی ہے؟"

لیث نے افسردگی سے کہا: "بجھی ہوئی طبیعت میں یقین اور شگفتگی کیوں تلاش کرتی ہو بنوقہ؟"

بنوقہ نے کہا: "خیر، یہ بیکار کی باتیں ہیں، آج اور ابھی تم یہیں سے چلے جاؤ گے، بس تم بتلاؤ کہ تم جاؤ گے کہاں؟"

لیث نے جواب دیا: "بغداد چلا جاؤں گا اور دربارِ خلافت سے وابستہ ہو جاؤں گا!"

بنوقہ نے کہا: "خیال تو ٹھیک ہے، لیکن اگر ممکن سمجھو تو بحر خزر کے کنارے بوگری میں رہنے کی کوشش کرنا ہو سکتا ہے کبھی ہم دونوں کی دوبارہ ملاقات ہو جائے حالانکہ بظاہر یہ ناممکن نظر آتا ہے۔"

لیث نے چبھتی نظروں سے بنوقہ کو دیکھا، پوچھا: "کیا تم نے میری رہائی کے عوض..."؟

بنوقہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: "ہاں لیکن اب اُسے دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

لیث اُس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن بنوقہ نے تالی بجا کے خدام کو طلب کر لیا۔ اس نے خدام کو ہدایت کی: "دیکھو انھیں کُتش کے قلعے سے نکال دیا جائے اور انھیں زادِ راہ میں اتنا کچھ دے دیا جائے کہ راستے میں کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے!"

خدام نے تعمیلِ حکم میں اپنے سر جھکا دیے اور زادِ راہ میں کھانے پینے کے سامان کے علاوہ سونے کے سکے بھی دے دیے کہ ضرورت کے وقت وہ ان کے عوض قیمتی چیزیں حاصل کر سکے اس سامان میں وہ تیز رفتار مشکی گھوڑا بھی شامل تھا جس پر بیٹھ کے وہ کُتش کے قلعے سے باہر نکلا۔

لیث کے چلے جانے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کافی دیر رو لینے کے بعد جب دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو وہ چند کنیزوں کو لے کے محل سے ملحقہ عمارتوں میں گھومنے پھرنے لگی اس نے ایک کمرے میں ایک زبردست بھٹی کو سلگتے دیکھا اور اس کمرے میں گوشوں میں مختلف جڑی بوٹیاں، تیزاب اور پارہ رکھے تھے۔ اس نے کنیزوں سے پوچھا: "یہ بھٹی یہاں کیوں روشن ہے اور ان اشیا کا یہاں کیا کام ہے؟"

"کنیز نے جواب دیا: "خداوند کے راز خداوند ہی جان سکتا ہے، میں کیا بتا سکتی ہوں کہ ان کا مصرف کیا ہے؟"

اُس دن دوپہر کے ذرا بعد سامنے کی پہاڑی پر مقنع کے ہزاروں پرستار کھڑے ہو گئے کیونکہ ایک دن پہلے خداوند مقنع نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ دیدارِ عام کر دے گا اور اس کے چہرے کی سنہری نقاب اتار دی جائے گی۔ اس کی رہائش کا بڑا دروازہ بند تھا اور اس کے مشتاقانِ دید خداوند کی تجلی کے منتظر کھڑے تھے۔ ان کے سروں سے ذرا پیچھے گھاٹیوں پر آفتاب چمک رہا تھا۔ مقنع کے پرستاروں کا جوش دیدنی تھا۔

ذرا دیر بعد آہستہ آہستہ دروازہ کھلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اندر سے اتنی تیز روشنی خارج ہونی شروع ہو گئی جیسے سورج طلوع ہو رہا ہو۔ پرستاروں کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں پھر دروازے کے دونوں پٹ بڑی تیزی سے کھول دیئے گئے اور دروازے کے کھلتے ہی ہزاروں آدمیوں نے یہ محسوس کیا کہ سینکڑوں سورج مقنع کے کمرے میں اتر آئے ہوں اور ان کی چمک اور حدت سے گھبرائے ہوئے لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چیخنے لگے۔ "بس خداوند بس!" تم نے پہلے جو کچھ بتایا تھا آج ہم سب اس پر ایمان لے آئے ہیں! ہم مر جائیں گے، ہماری آنکھیں بہہ جائیں گی، بس خداوند رحم!"

اور اس درخواست کے ساتھ ہی کمرے کا بلند و بالا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہونے لگا اور پھر پوری طرح بند ہو گیا، خداوند کے پرستار اپنی بے بسی اور عبودیت کے اظہار کے لئے سجدوں میں گر گئے اور خداوند مقنع ایک شانِ تمکنت سے ان کے روبرو نمودار ہو گیا، بولا: "میرے بندو! میں جانتا ہوں، تم کیوں پریشان ہو! شاید تم نے یہ خبر سن لی ہے کہ عباسی فوجیں ہمیں تباہ برباد کرنے کے لئے بغداد سے چل چکی ہیں، لیکن میری ذات پر، جو خدا کی ہے، تمھیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اس جنگ میں فرشتے بھی ہماری طرف سے لڑنے کے لئے زمین پر آ جائیں گے۔"

مقنع کی آواز اِدھر اُدھر کی پہاڑیوں سے ٹکرا کے واپس آ رہی تھی اور یہ ایک ایسی آواز تھی جس نے اس کے پرستاروں میں غضب کا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔

اُدھر سے فارغ ہو کے تھکا ہارا مقنع بنوقہ کے پاس پہنچا اور دریافت کیا: "کیا تیرا چچا کا لڑکا رہا کر دیا گیا؟"

بنوقہ نے جواب دیا: "جی خداوند"

مقنع نے ہنس کے کہا: "یہ تیری نہایت معمولی خواہش تھی، خیر اب تو تو خوش ہے؟"

بنوقہ نے جواب دیا: "بہت خوش ہوں خداوند۔" پھر دریافت کیا: "خداوند اگر اجازت دیں تو میں آپ سے ایک سوال پوچھ لوں؟"

مقنع نے ذرا سکوت اختیار کیا، بولا: "ہاں، لیکن وہ ایک ایسا سوال ہو، جس میں تیری نادانی نہ شامل ہو۔"

بنوقہ نے کہا: "کیا عربوں نے واقعی نخش کا محاصرہ کر لیا ہے؟"

"ہاں!" مقنع نے غصے سے کہا۔ "وہ کہتے ہیں خداوند خود کو خدا نہ کہے، بھلا یہ کیونکر ممکن ہے؟"

بنوقہ نے دریافت کیا۔ "پھر خداوند نے انھیں کیا جواب دیا؟"

مقنع نے کہا۔ "میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ تم مجھے اس دعوے اور اس اعلان سے باز نہیں رکھ سکتے۔ میں خدا ہوں۔ تمام جہانوں کا خدا! تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں فرشتوں کی ایک جماعت بھیج کر تمہیں تباہ و برباد کرا دوں گا!"

بنوقہ کو مقنع کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا، پھر سوال کیا۔ "پھر عربوں نے کیا کہا؟"

مقنع نے جواب دیا۔ "وہ کہتے ہیں کہ ہم طویل محاصرہ کر لیں گے۔ کش کے باہر سے آنے والے سامان اور رسد کو روک دیں گے!"

"اگر عربوں نے واقعی ایسا کر دیا تو پھر خداوند کیا کریں گے؟"

"میں یہاں کے در و دیوار اور پہاڑ کی خشک اور ٹھوس چٹانوں میں فصلیں کھڑی کر دوں گا!"

"خوب!" مقنع نے مزید کہا۔ "یہ لوگ ابھی مجھے پہچانتے نہیں ہیں، بالکل اسی طرح یہ مجھے جھٹلا رہے ہیں جس طرح میرے نبیوں کو جھٹلایا جاتا رہا ہے، لیکن کیا اس تکذیب سے نبیوں نے اپنے کام بند کر دیئے تھے؟ اسی طرح میں بھی ان گمراہوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گا اور اگر یہ اس وقت بھی یہی رہے جیسے ہیں تو پھر میں ان سے ایک مہیب اور بھیانک جنگ کروں گا!"

مقنع کی بے شمار بیویاں تھیں اور اسی طرح بے شمار اولادیں بھی تھیں۔ زہیر، مقنع کا خادم خاص بن گیا تھا۔ بنوقہ اس ماحول سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکی۔ وہ کبھی کبھی زہیر کو برا بھلا بھی کہتی لیکن زہیر اس کی باتیں برداشت کر جاتا کیونکہ اب بنوقہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی اور وہ خداوند مقنع کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی تھی اور اس کا سبھی احترام کرنے پر مجبور تھے۔ زہیر جب یہ کہتا کہ "اے بنوقہ! تم کتنی خوش قسمت ہو کہ اس وقت تم خداوند کی سب سے چہیتی بیوی ہو۔ اگر کہیں تم مجھ سے یا لیث سے منسوب کر دی جاتیں تو بڑے خسارے میں رہتیں!"

بنوقہ نے جواب دیا۔ "میں جھوٹے اعزاز کی کبھی بھی خواہش مند نہیں رہی!"

عربوں نے محاصرہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ سامان رسد رکنے لگا۔ قلعے میں پھنسے ہوئے لوگوں کو پریشانیوں نے ستایا تو وہ اندر سے ٹوٹنے لگے اور انھیں جب تب یہ آواز سنائی دینے لگی کہ۔

"اس پریشانی میں خداوند فرشتوں کو کیوں نہیں طلب کرتے؟"

مقنع انھیں جواب دیتا۔ "میں انہیں کیوں زحمت دوں؟ میری اپنی ہی فوج اتنی بڑی ہے کہ مسلمان اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے!"

اس طرح کچھ عرصہ اور گزر گیا اور حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے گئے!

مقنع اپنے خادم، مقربین بارگاہ اور بیویوں کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ پینے کے دوران

وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ وہ اتنی پئے کہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ اس عالم میں اسے خبر دی گئی مسلمانوں کا قاصد دربار میں باریابی کا خواہشمند ہے۔ مقنع نے حکم دیا "اسے اسی وقت اور ابھی حاضر کیا جائے!"

عرب قاصد کو اسی وقت مقنع کے روبرو پہنچا دیا گیا۔ مقنع نے بے نیازی سے سوال کیا۔

"تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

عرب قاصد اس کے سوال پر مسکرا دیا۔ طنزیہ بولا "اگر تو واقعی خدا ہے تو تیرا یہ سوال مضحکہ خیز ہے، تو خود بتا کہ میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟"

مقنع نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "تم نادان لوگ باتوں میں قیمتی وقت خوب ضائع کرتے ہو!"

تیز طرار قاصد نے جواب دیا "وقت میں نہیں، تم ضائع کر رہے ہو کیونکہ بزعم خود خدا ہونے کے باوجود میری آمد کا مقصد جاننے کے لئے باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو!"

مقنع نے نرمی سے کہا "تم قاصد ہو، تمھیں معاف کیا جاتا ہے ورنہ تمہاری تیز طرار زبان تمہاری زندگی کی دشمن ہے!"

قاصد نے ترکی بہ ترکی کہا "میں تیرے پاس جب آیا ہوں تو میں نے اپنے جینے کی خواہش باہر ہی چھوڑ دی تھی!"

مقنع نے سوال کیا "تو کیا چاہتا ہے؟"

قاصد نے ہنستے ہوئے کہا "امیر المومنین کا حکم ہے کہ تم نبوت اور الوہیت کے دعوے سے توبہ کر کے ان کے پاس حاضر ہو جاؤ، اگر ایسا نہیں کرو گے تو ان کی افواج تمھیں زبردستی پکڑ کے لے جائیں گی!"

مقنع نے غصے میں چیخ کر کہا "اسے اسی وقت قلعے سے دفعان کر دو۔ ایک ضعیف انسان خدا کو مشورہ دے رہا ہے۔ رب عالم کو گرفتاری کی دھمکی دے رہا ہے!" پھر قاصد کو پیغام دیا "تم لہٰذا واپس جا کے اپنے خلیفہ سے کہہ دو کہ وہ مجھ پر ایمان لے آئے ورنہ پھر اپنے عبرتناک انجام کے لئے تیار رہے!"

قاصد واپس چلا گیا اور مقنع نے اپنے پرستاروں کو حکم دیا "ایک طویل اور عبرت ناک جنگ کی تیاری کی جائے!"

مقنع کا یہ حکم پورے کیش میں آناً فاناً پھیل گیا اور عربوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔۔۔۔

جیسے جیسے عربوں کی طرف سے محاصرے میں سختی اور تنگی آتی جا رہی تھی، بنوتہ خوش ہو رہی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ لیث اس لشکر میں ضرور موجود ہوگا اور وہ اسے رہائی دلانے کی کوششیں

کر رہا ہوگا۔

عربوں نے کش کے آس پاس ہی آبادیاں قائم کرلیں تھیں۔ اس طرح وہ مقنع اور اس کے پرستاروں کا کامیاب محاصرہ کرنا چاہتے تھے اور ان پر زندگی تنگ کردینا چاہتے تھے۔ کش کے قلعے میں تنگی و ترشی کا دور شروع ہو گیا اور مقنع ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے اس نئی صورت حال پر شاید سوچا بھی نہ تھا۔ اس کے جن پرستاروں کو کھانے پینے کا سامان نہیں مل رہا تھا وہ لوگ مقنع سے مناجات کے انداز میں یہ درخواست کر رہے تھے کہ خداوند انھیں عربوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ رہا ہے اور وہ اپنی مخلوق کے لئے کش کے اندر ہی اشیائے زیست کیوں نہیں پیدا کردیتا؟ اور ان کا خداوند انھیں جواب دیتا کہ بڑا افسوس اس نے نظام کائنات کو چلانے کے لئے جو اصول وضع کر دیے ہیں ان میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔"

محاصرے کو دو سال گزر گئے۔ مہدی عباسی نے محاصرے کے سپہ سالار کو اس بنا پر واپس بلا لیا کہ وہ اس مسئلے پر بہت زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس منصب پر سعید الجرشی نامی سپہ سالار کو بھیج دیا۔ سعید الجرشی نے آتے ہی سرگرمی دکھانی شروع کر دی۔

مقنع کے پرستاروں پر اب عرصہ حیات اتنا تنگ ہو چکا تھا کہ نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ اس نے اس نازک موقع پر اپنے بھائی قرزوم کو طلب کیا مگر قرزوم نہیں آیا۔ اس نے مشتعل ہو کے زہیر کو حکم دیا: "قرزوم سے کہو، کھلے میدان میں نکل کے جنگ کرنے کی تیاری کرے۔"

زہیر نے سر جھکا کے جواب دیا: "افسوس کہ قرزوم اپنے تیس ہزار ساتھیوں کے ساتھ عربوں کی فوج میں جا ملا اور اپنے ہتھیار ان کے حوالے کر کے خود کو ان کی حراست میں دے دیا۔"

مقنع کے ہوش و حواس جاتے رہے، غصے میں بولا: "غدار، دغا باز۔"

کچھ دیر ساکت رہ کے اس نے زہیر کو نیا حکم دیا: "میرے تین ہزار آٹھ سو ان جانثاروں کو حاضر کیا جائے جو جنون اور دیوانگی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں یہ جنگ ان کے ذریعے لڑوں گا۔"

زہیر نے ایک بار پھر گردن جھکا لی اور آہستہ سے جواب دیا: "یہ لوگ بھی عربوں کی پناہ میں چلے گئے۔"

مقنع چیخا: "کیا بکتے ہو؟ کیا ان سب نے اپنے خداوند کو تنہا چھوڑ دیا؟ کیا یہ سب منکر دین اور کافروں میں شامل ہو گئے؟"

زہیر نے آہستہ سے درخواست کی: "اب یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ خداوند اپنے فرشتوں کو طلب فرمالیں اور یہ جنگ ان کی مدد سے لڑی جائے۔"

مقنع نے جواب دیا: "بے شک تیرا خیال درست ہے ۔ خاکی اور نادان انسانوں

پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم عربوں کو اپنے فرشتوں کی مدد سے ایسی شکست دیں گے کہ زمانہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔ یہ نافرمان اور غدار لوگ بھی میرے فرشتوں سے نہیں بچ سکیں گے۔"

مقنع نے زہیر کو حکم دیا "وہ بھٹی جو میرے کیمیائی تجربوں میں کام آتی رہی ہے، بہت زیادہ بھڑکا دی جائے۔"

زہیر نے اس پر پوری وفاداری اور مستعدی سے عمل کیا اور بھٹی کو بہت زیادہ بھڑکا دیا گیا۔

شراب کے مٹکے دور تک رکھے ہوئے تھے اور اس ہال میں مقنع تنہا بیٹھا تھا۔ بنوقہ اس پراسرار انسان کو ایک جگہ چھپ کے دیکھ رہی تھی۔ مقنع اس کی خفیہ موجودگی سے بالکل لاعلم تھا بنوقہ نے دیکھا، مقنع نے لکڑی کے ایک صندوق سے بہت سارا سفوف نکالا اور باری باری شرابوں میں گھولتا چلا گیا۔ بنوقہ کو حیرت تھی کہ یہ سفوف کیا ہے اور اسے شراب میں کیوں ڈالا گیا ہے۔ اس کے بعد مقنع نے تالی بجائی جس کے جواب میں زہیر اندر داخل ہوا۔ مقنع نے اسے حکم دیا۔ "جاؤ اور میری بیویوں کو مطلع کر دو کہ ان کا خداوند خاوند فرشتوں کی فوج لینے کے لئے ایک طویل سفر پر روانہ ہو رہا ہے لیکن جانے سے پہلے وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ مل بیٹھ کے شراب پی لے۔"

زہیر تابعداری میں گردن ہلا کے باہر چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اس کی ساری اولادیں اور ساری بیویاں اس ہال میں داخل ہو چکی تھیں۔ ان میں بنوقہ بھی موجود تھی۔ مقنع نے ان سب کے لئے پیالوں میں شراب انڈیلی اور باری باری ہر ایک کو دیتا چلا گیا۔ جب ہر ایک کے ہاتھ میں جام پہنچ گیا تو اس نے کھڑے ہو کے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اس نے کہا۔

میرے خلوت کدوں کی حسین تتلیو! تمہارے خدا نے آج تمہیں اس لئے زحمت دی ہے کہ تم اس کی حیات ابدی کا ایک ایک جام نوش کر لو۔ نادان اور غداروں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب میں اس امر پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آسمانوں کا سفر اختیار کروں اور وہاں سے فرشتوں کی فوج لے کے دوبارہ واپس آؤں اور اپنے مخالفین کو کچل کے فتح و کامرانی حاصل کروں۔" پھر پوچھا "تم میں سے کون میرا ہمسفر بننا پسند کرے گا؟"

کئی بیویوں نے اس کی ہمسفری پر آمادگی کا اظہار کر دیا اور چند نے یہ کہا کہ وہ خداوند کا یہیں انتظار کریں گے!

مقنع نے بنوقہ سے پوچھا "تو کیا کہتی ہے؟"

بنوقہ نے جواب دیا "میں خداوند کے استقبال کے لئے یہیں موجود رہوں گی۔"

مقنع نے پرشور بھیانک قہقہہ لگایا اور سب کو حکم دیا "میری حیات جاوداں کی خوشی میں اپنے اپنے جام ہونٹوں سے لگا لو۔"

: جتنے سواسب ہی نے مقنع کی دی ہوئی شراب حلق کے نیچے اتار لی۔ لیکن بنوقہ نے ساری شراب پینے کے بجائے اپنے گریبان میں انڈیل لی اور اوندھے منہ اس طرح لیٹ گئی گویا نشے میں دھت ہے۔ بنوقہ نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ تمام پینے والوں پر سکرات کا عالم طاری ہے۔ بنوقہ لرز گئی۔ اُسے صاف پتہ چل چکا تھا کہ وہ سفوف جو شراب میں ملایا گیا تھا، زہر تھا۔ اس کے والدین بھی اس کے سامنے شراب پی رہے تھے لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُنھیں منع کر دیتی وہ دونوں بھی شراب پی کر گرے۔ اور موت کی ہچکیاں لینے لگے۔

اب اس ہال میں مقنع اور زہیر کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ زہیر کو ابھی تک شراب کا پیالہ نہیں دیا گیا تھا۔ مقنع نے زہیر سے پوچھا "کیا یہ درست ہے کہ تو بھی میرے دشمنوں سے مل جانے کا ارادہ رکھتا ہے"

زہیر نے صفائی پیش کی "نہیں خداوند! میں بے گناہ ہوں اور خداوند سے علیحدگی کا اپنے دل میں خیال تک نہیں رکھتا"

مقنع نے کہا "اگر ایسی بات ہے تو اظہار عبودیت اور عاجزی کے لئے سجدے میں گر جاؤ اور آنسوؤں سے اپنے ذات پر لگی ہوئی اس گھناؤنے الزام کو دھو ڈالو"

زہیر اسی وقت مقنع کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گیا۔ مقنع نے اپنی کمر سے لٹکی ہوئی تلوار نکالی اور پوری قوت سے اس کی گردن پر رسید کی، زہیر کا جسم سر سے الگ ہو گیا اور بے سر کا لاشہ ماہی بے آب کی طرح پھڑکنے لگا۔ بنوقہ کا دہشت سے برا حال تھا وہ ڈری کہ کہیں وہ بیویوں کی نبضیں ٹٹولتا ہوا اس کے پاس نہ آ جائے لیکن وہ نہیں آیا۔ پھر اس نے دیکھا، مقنع ادھر ادھر کچھ دیکھ رہا ہے وہاں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس ناقابل تسخیر قلعے میں بس دو جاندار تھے ایک تو خود مقنع اور دوسری بنوقہ۔ لیکن مقنع کے خیال میں وہاں بس ایک ہی جاندار موجود تھا یعنی وہ خود۔ بنوقہ تو اس کے خیال میں مر چکی تھی۔ مقنع کے دونوں ہاتھ اپنی سنہری نقاب کی طرف بڑھے اور اسے چہرے سے اتار لیا۔ اس کا مکروہ چہرہ دیکھ کے بنوقہ کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ مقنع کا پورا چہرہ چیچک کے نشانات اور گڑھوں سے داغدار تھا اور اس کی ایک آنکھ میں بڑی سی پھلی نظر آ رہی تھی اس نے سوچا تو یہ ہے وہ خداوند جو اپنے مکروہ چہرے کو چھپانے کے لیے ہر وقت سنہری نقاب چڑھائے رکھتا تھا۔

مقنع نے آخری بار در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالی اور گویا مرنے والی عورتوں کو مخاطب کیا۔ "بے وقوف عورتو! تم نے میری حیات جاوداں کا جام کیا نوش کیا کہ خود اپنا رشتہ حیات منقطع کر دیا۔ اب میں سکون سے مروں گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیویاں عربوں کے ہاتھ لگیں۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری لاش عربوں کے ہاتھ لگے۔ میں اپنے پرستاروں کے خیال

میں آسمان پر جا رہا ہوں، جہاں میں اپنے فرشتگان کی فوج تیار کروں گا اور دنیا میں دوبارہ نازل ہوں گا اور اپنے فرشتوں کی مدد سے مخالفین کا خاتمہ کردوں گا اور یہ ایک ایسا فتنہ ہوگا، جس سے انسان قیامت تک پیچھا نہ چھڑا سکے گا!" اس کے بعد مقنع نے ہال کی چھت کی طرف دیکھا اور خدا کو مخاطب کیا: "او خدا! تو نے مجھے بدشکل پیدا کیا اور اس کے بعد میری بدشکلی میں اس طرح مزید اضافہ کیا کہ چیچک نے میری شکل بہت زیادہ بھیانک کردی، تو نے میری ایک آنکھ کی بصارت چھین لی، اس میں مزید بدنمائی کے لیے پھلی پیدا کردی۔ میں نے بھی تجھ سے اس ظلم کا یہ بدلہ لیا ہے کہ قیامت تک کے لیے تیری خدائی میں شریک ہو گیا ہوں، یہ ایک بھرپور اور خطرناک وار تھا جو ایک کمزور اور مجبور انسان اپنے ظالم خدا پر کرسکتا تھا!"

اس کے بعد اس نے خون آلود تلوار پھینک دی اور آگ کی جہنم نما بھٹی کی طرف بڑھا۔ بنوقہ کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ مقنع نے بھٹی کے قریب پہنچ کے پھر ادھر ادھر دیکھا اور خود بھٹی میں کود گیا۔ بھٹی سے آتشیں شعلے، بہت سارے ناگوں کی طرح سرخ سرخ زبانیں نکالے آگے بڑھے اور مقنع کو چیٹ کر گئے اور خدائی کا دعویدار مقنع خود اپنے ہی جہنم میں روپوش ہو گیا...

عربوں نے قلعے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو قلعے کی واحد زندہ عورت بنوقہ نے، ان کے سامنے قلعے کے دروازے کھول دینے کی یہ شرط رکھی کہ اسے مقنع کے خزانے سے دس ہزار طلائی سکے بطور انعام دیے جائیں اس طرح وہ اپنی بقیہ زندگی اور اس کے مستقبل کو محفوظ کرلینا چاہتی تھی۔

عرب سپہ سالار نے یہ رقم دینے کا وعدہ کرلیا تو بنوقہ نے بھی قلعے کے دروازے کھول دیے عرب سردار سعید الحرشی کو بنوقہ بطور خاص اس محل میں لے گئی جہاں مقنع کی بیویاں مردہ پڑی تھیں پھر اسے وہ بھٹی دکھائی جس نے مقنع کو ہضم کرلیا تھا۔ اس نے عرب سردار کو مرنے سے پہلے کے سارے واقعات بھی بتائے اور یہ بھی بتایا کہ مقنع کتنا مکروہ صورت انسان تھا اور اس نے خدائی کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا۔ اس نے عرب سردار کو وہ حصہ بھی دکھایا، جہاں ایک دن مقنع نے خود کو بے نقاب کرکے اپنے پرستاروں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کردی تھی۔ یہاں کی دیواروں میں بہت سارے آئینے اس طرح پیوست تھے کہ دروازہ کھلتے ہی ان کا رخ سورج کی طرف ہو جاتا تھا۔ اور سورج بے شمار آئینوں سے منعکس ہو کے دیکھنے والوں کی نظر میں خیرگی پیدا کردیتا تھا۔ عرب سردار نے بنوقہ کو دس ہزار طلائی سکے ادا کردیے، اور اس سے پوچھا: "وہ اور کیا چاہتی ہے؟"

بنوقہ نے کہا: "میں عرب لشکر میں ایک ایسے سپاہی کو تلاش کرنا چاہتی ہوں جس کا نام

لیٹ ہو؟"

تلاش و جستجو کے دوران اُسے کئی لیٹ ملے لیکن بدقسمتی سے ان میں سے اس کا لیٹ نہیں نکلا۔ عرب سردار اس حواس باختہ عورت کی حرکات و سکنات سے اُسے نیم پاگل سمجھنے لگا تھا بنوقہ کے چہرے پر مایوسی کے اثرات دیکھ کے عرب سردار نے پوچھا "اب تم کیا چاہتی ہو؟"

بنوقہ نے مایوسی سے جواب دیا۔" مجھے بحر خزر کے ساحلی قصبے تو گم پہنچا دیا جائے کیونکہ وہ میرا وطن ہے اور میں اپنی بقیہ زندگی وہیں گزارنا چاہتی ہوں۔"

عرب سردار نے اس دکھی اور سوگوار عورت کو ایک فوجی دستے کی حفاظت میں اس وطن روانہ کر دیا۔ وہ اپنے وطن میں ایک اجنبی کی طرح داخل ہوتی۔ اب اس کے گھر پر کسی تاجر نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ایک امید موہوم کے سہارے وہ قصبے سے ہوتی ہوئی فوجی دستے کی معیت بحر خزر کے کنارے چلی گئی۔ وہاں ایک پہاڑی چٹان کے راستے میں سمندر کی سرکش اور جھاگ اڑاتی امواج کے سامنے ایک شخص نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بہت سارے کیکڑے اس انتظار میں پڑے تھے کہ انھیں ساحل پر پھینک جانے والی سرکش سمندری امواج سب دوبارہ ساحل پر آئیں اور ان کیکڑوں کو دوبارہ سمندر میں واپس لے جائیں۔